PAGES MISSING
WITHIN THE
BOOK ONLY

The Zamana, July, 1941. Regd. No. A 147.

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم

جلد | جولائی سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۱

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (۵) ششماہی ۳ روپیہ
زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا
(نمونہ سات آنے)

زمانہ

جلد ۷۷ — جولائی سنہ ۱۹۴۱ع — نمبر ۱

اشتراکیت کی جدّوجہد

(السید سدرالدین الحسنی ریڈر اصلاح انسٹیٹیوٹ آف دستور جدید)

یورپ میں اشتراکیت کی عملی تاریخ کا سلسلہ سنہ ۱۸۴۸ع سے شروع ہوتا ہے مگر اس کے پہلے فرانس میں سینٹ سیموں و فوریہ اور انگلستان میں رابرٹ اون جیسے حضرات نے اشتراکی خیالات کی تبلیغ اور اقتصادی تحریک کی تنظیم شروع کردی تھی۔ چنانچہ انگلستان کی لیبر پارٹی کی ابتدا رابرٹ اون سے منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۸۴۸ع میں جب کارل مارکس نے ایک بیان شائع کیا اُس وقت سے اشتراکیت کے اُصول ایک منظم پروگرام اور لائحۂ عمل کی صورت میں دنیا کے سامنے آئے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۴۸ع اور اس کے بعد یورپ میں جو کشمکش ہوئی اس کی بنیاد یہی اشتراکیت تھی۔ جرمنی اور فرانس میں اشتراکیوں نے اس کی کوشش کی کہ لیڈری کی باگ ڈور متوسط طبقہ کے ہاتھوں سے چھین لی جائے۔ مگر چونکہ اس وقت انگلستان کے علاوہ یورپ کے کسی ملک میں صنعت وحرفت کی اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی کہ مزدوروں کی طاقت ایک منظم اشتراکی تحریک کو چلانے کے لئے کافی ہوتی اس لئے یہ جدوجہد ناکام رہی اور اشتراکی حریت پسندوں کو ناموافق حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

پچھلی نصف صدی میں اشتراکیت کی اس ناکامی سے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب اس کی ترقی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی، مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد اشتراکی لیڈروں نے پھر اس تحریک کو زور شور کے ساتھ

شروع کیا اور لندن کا شہر جلاوطن اشتراکی لیڈروں کا ایک پناہ گاہ بن گیا جس کے دامن میں کارل مارکس کی سربراہی میں اشتراکیوں کی ایک بڑی جماعت قائم ہوگئی۔

اس کے بعد ۱۸۶۴ء میں جب پہلی بین الاقوامی مزدور پارٹی[1] قائم ہوئی تو اشتراکی لیڈروں نے اپنی ساری کوششیں اسی بات پر منعطف کیں کہ یورپ کے مختلف ملکوں خصوصاً جرمنی اور فرانس میں باقاعدہ اشتراکی جماعتیں قائم ہو جائیں۔ چنانچہ جرمنی میں ایک طویل عرصہ کی جد و جہد کے بعد ایک جمہوری اشتراکی جماعت قائم ہوئی جس کے بہت سے اصول موجودہ جرمنی میں رائج ہیں۔ یہ جمہوری اشتراکی پارٹی شہنشاہیت کے زوال کے بعد سے برابر جرمنی حکومت میں نمایاں رہی۔ لیکن جب ہٹلر نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اُس وقت اس پارٹی کا شیرازہ بکھر کر نیشنل سوشلزم میں مل جل گیا۔ اور آج سارا جرمنی اسی وطنی اشتراکیت کا پرستار ہے۔

اس کے بعد فرانس میں اشتراکیت کا دو بڑی طاقتوں سے سامنا ہوا۔ ایک پرڈوین کے متبعین کی جماعت تھی جو قریب قریب انارکسٹ تھے اور ہر اجتماعی مسئلہ کو اشتراکیت کے اصول سے بالکل مختلف طریقے پر جانچنے کے عادی تھے۔ دوسری طاقت بلانکی کے متبعین کی تھی جو اگرچہ کارل مارکس کی رائے سے بڑی حد تک متفق تھے مگر ان کا میلان زیادہ تر بغاوت و انارکی کی طرف تھا۔

اسی طرح اٹلی میں بھی اشتراکیت کے لئے صاف راستہ نہ تھا۔ کیونکہ وہاں ایک طرف اس کی مخالف ماٹزینی کے متبعین کی جماعت تھی، دوسری طرف ایک دوسری پارٹی تھی جو بیکن روسی کے انارکسٹانہ خیالات سے متاثر تھی۔ تقریباً ایسے ہی حالات روس میں بھی پیدا ہوگئے تھے۔ اس لئے کہ اشتراکیوں نے وہاں صنعتی کارخانوں کی عدم موجودگی میں کاشتکاروں کو ورغلایا چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب انھوں نے آنکھیں کھولیں تو ان کو مارکس کے نظریات سے انارکزم کی راہ بہتر معلوم ہوئی۔

لیکن ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء میں روس اور فرانس کی جنگ میں نپولین کی شکست کے بعد جب فرانس میں اشتراکیوں نے زور پکڑا جس سے اُن کو حکومت میں دخل حاصل ہوگیا تو اس وقت بین الاقوامی مزدور پارٹی کو یورپ میں ایک بلند مقام حاصل ہوگیا۔ فرانس میں اشتراکی حکومت کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی، کیونکہ اول تو یہ حکومت مختلف عقیدوں کے لوگوں کا مجموعہ تھی، دوسرے ان لوگوں نے چند ایسی کارروائیاں کیں جن سے فرانسیسی قوم بگڑ گئی اور اُس نے موسیو طیرس

---

[1] یہ بین الاقوامی مزدور پارٹی اپنی یورپین تاریخ میں اسی "پہلی پارٹی" کے نام سے موسوم ہے تاکہ دوسری اور تیسری بین الاقوامی پارٹی میں تمیز ہو سکے جن کا بیان آگے آئیگا۔

کی تائید شروع کر دی جس کی وجہ سے فرانس میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جو تقریباً دو ماہ تک (اپریل تا ۲۰ مئی ۱۸۷۱ء) جاری رہی۔ مگر اس میں اشتراکی پارٹی کو شکست ہوئی اور اس کے ہاتھوں سے حکومت چھن گئی۔ اب فرانسیسی جمہوریوں کا راستہ صاف ہوگیا۔ چنانچہ انھوں نے تیسری بار پھر جمہوری حکومت قائم کی۔ جس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ یہ حکومت متوسط طبقہ کی حکومت ہوگی۔ چنانچہ اس وقت تک فرانسیسی حکومت انھیں خصوصیات کے ساتھ قائم رہی۔

فرانس کی پہلی اشتراکی حکومت کے ٹوٹ جانے کے بعد اشتراکی لیڈروں کے حوصلے پست ہوگئے، اور یورپ میں اشتراکیت کی حیثیت محض ایک قومی اجتماعی تحریک کی ہوگئی اور مختلف ملکوں میں اسے عروج و زوال کی منزلوں سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ جب جرمنی میں کارل مارکس کے نظریے رواج پذیر ہورہے تھے۔ اس وقت پرنس بسمارک اس کی مخالفت پر مستعد ہوگئے، اور انھوں نے اسے سخت سے سخت قوانین میں جکڑ دیا جس کا سلسلہ تقریباً ۱۸۷۸ء سے ۱۸۹۰ء تک جاری رہا۔ اور جس نے اشتراکیوں کو جرمنی سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہ لوگ باہر جاکر بھی اپنی تحریک چلاتے رہے اور بالآخر ان کی کوششوں سے اسے جرمنی میں بہت فروغ حاصل ہوا اور وہاں کی جمہوری اشتراکی پارٹی نے ۱۸۹۱ء میں قومی سیاست کے اندر ایک نمایاں جگہ حاصل کرلی۔ اسی سال سے جرمن اشتراکی جرمن پارلیمنٹ ریشتاغ (Riechstag) میں اپنی نشستوں کی زیادتی کے لئے بہت سرگرمی سے کام لینے لگے۔ مگر اس سے پارٹی کے مقاصد اور خیالات میں بہت کچھ انقلاب آگیا۔ اور یہ جماعت ایک دم اعتدال پسند ہوگئی۔ اس تبدیلی کا سب سے بڑا باعث ایڈورڈ برنشٹین تھا۔ گو برنشٹین اور اس کے ہمخیال رفیقوں کو ۱۹۰۳ء کی کانفرنس میں پارٹی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مگر اس کے مؤیدین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کی وجہ سے پارٹی کے اصولوں میں اہم تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ اور اس کا مقصد انقلاب کے بجائے صرف اصلاح ہوگیا۔ یعنی اس جماعت کی رگ رگ میں اعتدال پسندی سرایت کر گئی۔ یہ وہی جرمنی کی جمہوری اشتراکی پارٹی ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔

انگلستان میں بھی گذشتہ صدی کے آخری حصہ میں لبرل صیغوں کے قیام کا رجحان پیدا ہو چلا تھا۔ مگر آگے چل کر جب اقتصادی الجھنیں بڑھ گئیں تو یہ تحریک کمزور پڑ گئی اور اس کی جگہ پر مزدور اپنی الجھنوں سے گھبرا کر ایک ایسی جماعت بندی کے خواستگار ہوئے جس کے مقاصد و مطالبات کافی وسیع ہوں۔ چنانچہ لیبر پارٹی وجود میں آئی جس کی مزدوروں نے پوری تائید کی۔ اور چند ہی سال میں اس کو اتنی تقویت حاصل ہوگئی کہ اس کے نمایندے پارلیمنٹ کے انتخاب

میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہونے لگے۔ تاہم بعض لوگوں نے اس سے بڑھکر مارکسزم کے اصولوں پر ایک اشتراکی جماعت قائم کی، مگر مزدوروں نے اس کے متعلق کوئی گرمجوشی نہیں دکھلائی جس کی وجہ سے اس تحریک میں کوئی زور پیدا نہیں ہوا۔ مگر جب بیسویں صدی کے شروع میں مسٹر کیر ہارڈی کی رہنمائی میں مزدور پارٹی پھر از سر نو مرتب ہوئی تو اس سے اس اشتراکی پارٹی کو بہت ٹھیس لگی۔ اور اس کی قوت اور بھی کمزور ہو گئی۔ یہ مزدور پارٹی یورپ کی دوسری اشتراکی جماعتوں سے بالکل مختلف تھی، اور گو وہ بعض اشتراکی اصولوں سے متفق تھی مگر اشتراکیت سے اس کا راستہ کوسوں دور تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ مشکلات کی اصلاح کی جائے نہ کہ اشتراکی ہنگامہ آرائی کے ذریعہ، یہ حربے حقیقی اصلاح کے لئے بالکل بیکار سمجھے گئے۔

مگر روس کے حالات جرمنی اور انگلستان سے مختلف تھے، اس لئے کہ روسی اشتراکی وہاں ظلم و تشدد اور جلاوطنی وغیرہ کا ہمت و استقلال سے مقابلہ کرتے رہے۔ بڑے بڑے اشتراکی رہنماؤں کو سائبیریا اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں جلاوطن کر دیا گیا۔ مگر اس تحریک کی آگ برابر مشتعل رہی۔ آگے چل کر جب ۱۹۰۵ء کے اہم انقلاب میں اشتراکی ناکام رہے تو ان کے اوپر مصائب و مظالم کا انبار اور بھی زیادہ ہو گیا جس کی بدولت ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ روس کی اس اشتراکی تحریک کو باہر سے تقویت دیں۔

ان مظالم کے علاوہ اس وقت روسی اشتراکی مختلف جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک پارٹی کا مقصد کاشتکاروں کی اصلاح تھا اس لئے ان کا سارا دارومدار کاشتکاروں پر تھا۔ مگر چونکہ ان کے نزدیک انقلاب کے بغیر کاشتکاروں کی اصلاح نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے ان کا رجحان انارکزم کی طرف ہو گیا۔ اور وہ بیکن روسی کے خیالات سے متاثر ہو گئے۔ ایک دوسری جماعت مارکس کی پیرو کار تھی، مگر ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں اس کے دو حصے ہو گئے، ایک بالشویزم کی جماعت تھی جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سے اس وقت تک روسی اشتراکیت کے نام سے موسوم ہے اور دوسری جماعت کارل مارکس کے اصولوں کی پیرو ہونے کی دعویدار تھی مگر درحقیقت اس کا خیال یہ تھا کہ روس میں اشتراکیت اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب متوسط طبقہ سے تعاون کر کے پہلے ایک جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ یہ پارٹی بالشویزم کی انقلاب پسندی اور تدریجی تبدیلی کے بجائے فوری عروج کی مخالف تھی۔ اور اس کے نزدیک یک بیک اشتراکیت کا قیام ایک ناممکن وہم و گمان تھا۔

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلی بین الاقوامی مزدور پارٹی ۱۸۶۴ء میں قائم ہوئی تھی، مگر فرانس کی اشتراکی حکومت کی ناکامیابی کے بعد یہ بھی آہستہ آہستہ فنا ہو گئی۔ لیکن ۱۸۸۹ء میں اشتراکی جماعتوں نے ملکر ایک دوسری بین الاقوامی پارٹی قائم کی جو دوسری بین الاقوامی پارٹی یا بین الاقوامی اشتراکی پارٹی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ جماعت پہلی بین الاقوامی جماعت سے مختلف تھی، کیونکہ اس کے پاس کوئی ہمہ گیر مرکزی پروگرام نہ تھا، بلکہ اس کی توجہ صرف اس بات پر محدود تھی کہ مختلف اشتراکی جماعتوں کو کس اسلوب اور کس طرح سے چلایا جائے۔ لیکن اس دوسری پارٹی نے ۱۹۱۱ء تک اس مسئلہ کو بھی اپنے سامنے رکھا کہ امن و جنگ کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے۔ اور اس میں اشتراکیوں کی کیا حیثیت ہو؟ یہ موضوع امسٹرڈم (نذرلینڈ) کی ۱۹۰۳ء کی کانفرنس کا خاص موضوع تھا۔ چنانچہ فرانسیسی اشتراکی جورز نے "نئی فوج" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی، مگر اسٹٹگرٹ (جرمنی) کی دوسری کانفرنس میں ہرقیہ نے نیشنلزم اور وطنیت کی صدا بلند کی، اور اس میں جرمنی کے دو لیڈروں سبیل اور نوکار نے صاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کر دیا کہ اگر جرمنی پر حملہ ہوا تو جرمنی کی جمہوری اشتراکی پارٹی سب سے پہلے اس کی مدافعت میں حصہ لے گی۔

اس کے بعد ۱۹۱۱ء میں جب یورپ کی فضا بہت مکدر ہو گئی۔ تو ۱۹۱۲ء میں اشتراکی لیڈروں نے بین الاقوامی تعلقات پر غور و فکر اور اپنی امن پسندانہ پالیسی کی وضاحت کے لئے یکجا ہو کر ایک اہم ریزولیوشن یہ پاس کیا کہ دنیا کے تمام مزدور اپنی اپنی ملکی حکومت پر زور ڈالیں کہ وہ اپنی خارجی پالیسی کو امن پسندی کے اُصولوں کی بنیاد پر مرتب کریں۔ تاکہ دنیا عالمگیر جنگ سے باز رہے اس کی امن پسندی کی یہ صدائیں تمام لوگوں کی زبانوں سے بلند ہو رہی تھیں جس کے لئے پھر ۱۹۱۴ء میں ایک اہم کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز تھی، مگر جنگ کے چھڑ جانے سے سارا پروگرام یکایک معطل ہو گیا۔ اور کانفرنس نہ منعقد ہو سکی۔

اس جنگ سے اشتراکیوں کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں کہ اشتراکیوں نے اس خوفناک جنگ کو روکنے کی بڑی کوشش کی تھی۔ مگر جب ۱۹۱۴ء کے موسم گرما میں یورپ کی حکومتیں باہم دست و گریباں ہو گئیں تو اشتراکی پارٹی بھی اپنے بین الاقوامی جماعت کے فیصلہ کے خلاف اپنی قومی حکومت کی تائید و اعانت میں مشغول ہو گئی۔ مگر اس کے باوجود اس وقت چند ایسے اشتراکی موجود تھے جنھوں نے اپنی قومی حکومت کے جنگی رویہ سے اختلاف کر کے

اسے جنگ سے روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ناظرین کو یاد ہوگا کہ فرانسیسی اشتراکی لیڈر موسیو
جورز نے فرانسیسی حکومت کی اس بارے میں مخالفت کی تھی جس کا ثمرہ اُسے موت کی
شکل میں حاصل ہوا۔ اسی طرح مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے بھی انگلستان کے جنگی رویہ پر اعتراض
کیا تھا۔ مگر اس پر چنداں دھیان نہیں دیا گیا۔ مگر اس سلسلہ کا ایک پُر لطف واقعہ یہ ہے کہ جب
مسٹر میکڈانلڈ بین الاقوامی اشتراکی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ایک انگریزی جہاز پر سفر
کرنے والے تھے تو اُس وقت جہاز کے سارے کام کرنے والوں نے اس جہاز میں کام کرنے
سے انکار کردیا جس پر مسٹر میکڈانلڈ سوار ہوں۔ لیکن درحقیقت بہت کم لوگ بین الاقوامی اشتراکی
کانفرنس کے نقطۂ خیال پر ثابت قدم رہے۔ یا اس اشتراکی تحریک کی بین الاقوامی پہلو کو اپنی قومیت
پر ترجیح دی۔ اور اُس کے فیصلہ کو لائقِ احترام سمجھا۔ بلکہ اس جنگ میں عموماً ہر شخص اپنی قومیت پر قربان
ہوا اور سبھوں نے پارٹی کے ساتھ جنگ میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ فرانس اور برطانیہ کی اشتراکی
پارٹیاں جنگی وزارتوں میں مل کر پوری طرح سرگرمِ کار ہوگئیں۔ اور اگر جرمن حکومت جرمنی کی اشتراکی
جمعیت کو وزارت میں دعوت دیتی تو وہ بھی یقیناً اُسے قبول کرلیتی۔ بہرحال اس کے باوجود بھی اسکی
ہمدردی اپنی گورنمنٹ کے ساتھ تھی۔

غرض ان حالات میں جب بین الاقوامی اشتراکی پارٹی کا شیرازہ بکھر رہا تھا، ستمبر ۱۹۱۵ء اور
اپریل ۱۹۱۶ء میں زمر فولڈ اور کینٹال میں دو بین الاقوامی اشتراکی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، جن میں
اشتراکی جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں دو قسم کے خیالات کے لوگ شریک
تھے۔ ایک جماعت یہ سمجھتی تھی کہ شاید یہ کانفرنس جنگ کے انسداد کا ذریعہ ہوسکے اور دوسری جماعت
کا خیال تھا کہ اس عالمگیر جنگ سے فائدہ اُٹھا کر ہمیں ان کانفرنسوں کو اشتراکیت کی تبلیغ کا ذریعہ
بنانا چاہیئے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اشتراکیت کو ہر جگہ پھیلانا چاہیئے۔ اس خیال کا پہلا حامی لینن تھا۔

اس کے بعد روس کی عظیم الشان اشتراکی بغاوت ہوگئی جو درحقیقت حکومت کے مظالم
ومصائب کا نتیجہ تھی۔ اس وقت روسی اشتراکی مختلف جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک پارٹی انقلاب
پسند اور انارکسٹ تھی جس کا مقصد کاشتکاروں کی فلاح تھا۔ دوسری پارٹی مارکس کی پیرو
شمار ہوتی تھی، اس میں بھی دو پارٹیاں تھیں، ایک اعتدال پسند جو طبقۂ متوسط سے تعاون
کی قائل تھی، دوسری پارٹی مزدوری کے انقلاب کی حامی اور یہ مزدوروں کی ڈکٹیٹری کی
طالب تھی۔ اس وقت اسے بالشویک کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مگر جب ۱۹۱۷ء میں روس میں

اعتدال پسند اشتراکی اور طبقہ متوسط کے آزاد خیالوں نے بغاوت شروع کی تو سب خیال کے اشتراکیوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اس انقلاب کے بعد جو وزارت قائم ہوئی اس کا وزیر اعظم کرنسکی تھا لیکن اس کے بعد جب بالشویکوں کی قیادت اور لینن کی رہبری میں دوسرے انقلاب کے شعلے مشتعل ہوئے اور ان لوگوں نے ایک مزدور ڈکیٹرشپ کا اعلان کیا تو یورپین اشتراکی دو جماعتوں میں منقسم ہو گئے اور دونوں میں اختلاف کی خلیج اس وقت اور زیادہ وسیع اور عمیق ہو گئی۔ جب بالشویک روس کی حکومت پر پوری طرح سے قابض ہو گئے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ حقیقی اشتراکیت کے پیرو وہی ہیں اور انھوں نے ایک تیسری بین الاقوامی اشتراکی پارٹی قائم کی، اور اپنے اصولوں کے مطابق دنیا کو ایک عالمگیر انقلاب کی دعوت دینے لگے جس کے اصول مارکس کی کتابوں اور اس کے اس اعلان سے ماخوذ ہیں جسے اس نے ۱۸۴۸ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ بالشویکوں نے جمہوری اعتدال پسند اشتراکیوں پر یہ اتہام لگایا کہ وہ کارل مارکس کے نظریات کے منکر ہیں۔ اور ان لوگوں نے سرمایہ داری قائم کرنے کے واسطے متوسط طبقہ کے تعاون کا ڈھونگ نکالا ہے۔ اس کا جواب اشتراکیوں نے یہ دیا کہ خود بالشویک اشتراکیت کے اصولوں سے منحرف ہو گئے اور انھوں نے روس کی جمہوریت اور عوام کی آزادی کا خاتمہ کر کے روسی عوام پر محض قوت و طاقت کے ذریعہ تسلط اور غلبہ حاصل کیا ہے۔ روس کی اس باہم کشمکش کا سلسلہ بہت طولانی ہے۔ اور اس کا مفصل ذکر طوالت کا باعث ہو گا۔

روس کے حالات تبدیل ہو جانے اور اشتراکیت کا رخ دوسری طرف پھر جانے کے بعد بھی جمہوری اشتراکیوں نے یورپ کے دوسرے ملکوں میں اپنی جد وجہد جاری رکھی۔ چنانچہ جرمنی میں (باوجود اس کے کہ روسی بالشویزم سے متاثر ہو کر وہاں ایک بالشویک پارٹی قائم ہو گئی تھی) جمہوری اشتراکی اپنے اصولوں پر قائم رہے۔ اسی طرح انگلستان کی بھی اشتراکی تحریک پر اس بالشویزم کا کوئی اثر نہ پڑا۔ فرانس میں بھی جب بعض اشتراکیوں کا میلان بالشویزم کی طرف ہو چلا تھا جمہوری اشتراکی پارٹی کی کامیابی کے ساتھ پھر سے تنظیم کی گئی۔ چنانچہ وزیروں کے انتخاب میں یہ پارٹی سب سے نمایاں اور سب پر فائق رہی۔ رہا اٹلی تو وہاں اس وقت تین جماعتیں ہو گئیں ایک بالشویک، دوسرے وہ جنھیں بالشویک بھی نہیں کہا جا سکتا۔ تیسرے وہ جو بالشویزم کے مخالف اور فاشیزم کے حامی تھے۔

اب ہمیں چند الفاظ میں اشتراکی اور بالشویک نقطۂ خیال پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ اشتراکی

اور بالشویک اپنے اغراض و مقاصد اور قواعد و اصول میں متفق ہیں۔ لیکن اُن کے طرز عمل میں اختلاف ہے۔ اشتراکی اور بالشویک دونوں یہ چاہتے ہیں کہ تمام صنعتی کارخانے اور زراعتی کاشتیں قوم یا حکومت کی مِلک ہوں، مگر بالشویک انقلاب اور بغاوت سے اپنا مدعا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اشتراکی ان چیزوں کو قانون کی امداد سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ملک میں اس طرح کی حکومت قائم کریں کہ مجلس قانون ساز میں وہ بھاری تعداد میں داخل ہو سکیں۔ اور قانونی طور پر اپنے اصولوں کے مطابق اقتصادی حکومت کی بنیاد ڈالیں بالشویک اس کے مخالف ہیں اور ان کا خیال ہے کہ سرمایہ داری نظام ہماری کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دے گا، بلکہ قانونی حکومت حاصل ہونے سے پہلے ہی کچل ڈالے گا۔ اسی لئے بالشویک ان لوگوں کو جو تدریجی طور پر قانونی حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں اشتراکیت کا دشمن تصور کرتے ہیں۔

اشتراکیوں اور بالشویکوں کے اختلاف کی یہ پہلی جڑ ہے، آگے چل کر اختلاف کی ایک عظیم الشان عمارت کھڑی ہو گئی ہے۔

حُسن بے مثال

(حضرت فراق گورکھپوری)

حرارتوں میں طراوت جو دے وہ آگ ہے تو
سدا بہار ہے تو عشق کا سہاگ ہے تو

خبر دلوں کو نہیں، جلتے ہیں کہ بجھتے ہیں
ارے نہ آگ نہ پانی ہے جو وہ لاگ ہے تو

سکوت کو بھی تو کانوں میں گونجتا پایا
جو ایک کر دے سنا اَن سنا وہ راگ ہے تو

جھلک رہی ہے جبیں کائنات کی تجھ سے
اِک امر غیب سے کُھل جائے جو وہ بھاگ ہے تو

قبائے تنگ نے بیسوں جگہ سے کو دے دی
ز فرق تا بقدم اک دبی سی آگ ہے تو

جدا ہر اک سے، ہم آہنگ بھی زمانے سے
قبولیت کی جو تصویر ہے وہ تیاگ ہے تو

سوادِ شامِ ابد زلفِ یار بس ہے ترا
جو ڈس لے صبح قیامت کو بھی وہ ناگ ہے تو

میں تجھکو دیکھ رہا ہوں کہ کان بجتے ہیں
ہے کوئی شعلۂ لرزاں کہ کوئی راگ ہے تو

کہاں حسن کی بہاریں کہاں یہ رنگِ نشاط
جو خونِ عشق سے کھیلا گیا وہ پھاگ ہے تو

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
لگا دُ نام کو جس میں نہیں وہ لاگ ہے تو

نگاہ و گوش کی پُر کیف تشنگی کو نہ پوچھ
اِک ادھ کِھلی سی کلی ادھ سنا سا راگ ہے تو

فراق اپنے دُکھوں کو بُھلا کے کہتا تھا
سدا بہار ہے دُنیا سدا سہاگ ہے تو

بہارِ کشمیر٭

(از نواب محمود علی خاں عرف آغا علی خاں محمود رئیس الہ آباد)

یہ سچ ہے کیفِ دل کہاں حریمِ روزگار میں   کہ جس کا ذرّہ ذرّہ ہو تلاشِ غمگسار میں
مگر نظر اُٹھا تو آب کہ اِس بہشتِ زار میں   مچل رہی ہیں فطرتیں نسیمِ خوشگوار میں
مسرّتوں کا جوش ہے شبابِ نو بہار میں

گھٹائیں اپنی گود میں گلابیاں لئے ہوئے   ہوا کے نرم دوش پہ صُراحیاں لئے ہوئے
چمن کے ذرّے ذرّے کی جوانیاں لئے ہوئے   گلوں کے حُسن و عشق کی کہانیاں لئے ہوئے
تڑپ رہی ہیں بجلیاں تبسّمِ بہار میں

لرز رہی تھی بزمِ گل عتابِ برشگال سے   وہ ٹپکیں رس کی بُوندیاں حجابِ برشگال سے
برس پڑیں وہ مستیاں شرابِ برشگال سے   اُبل پڑیں جوانیاں شبابِ برشگال سے
کچھ اور عطر بڑھ گیا نسیمِ مشکبار میں

زمینِ صحنِ باغ کو نئی ملی ہیں لذتیں   دماغِ حُسن و عشق میں مچل رہی ہیں اُلفتیں
چمن کے رہنے والوں کی بدل رہی ہیں قسمتیں   جہانِ آب و گل سے اب اُبھر رہی ہیں راحتیں
خوشی کی لہر آ گئی چمن کے قلبِ زار میں

شگفتگی کے زور سے اُبھر رہی ہیں پتّیاں   پہن کے سبز ساریاں مچل رہی ہیں ڈالیاں
کھنک رہی ہیں بوندیوں سے پھول کی کٹوریاں   نکھر رہا ہے حُسنِ گل برس رہی ہیں مستیاں
چمن کا رنگ آ گیا ہے کُنج کے سبزہ زار میں

گرہ وہ کھل گئی ہے کیا بہار کے نقاب کی   کہ ہر طرف ہیں محوِ رقص دیویاں شباب کی
میں کس زباں سے داد دُوں نگاہِ انتخاب کی   کہ ہیں یہ سب کرامتیں بہار میں شراب کی
چھلک رہا ہے جامِ مے نگاہِ بادہ خوار میں

٭ یہ نظم رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب القابہ کی صحت کی خوشی میں لکھی گئی تھی۔ ممدوح ایک طولانی علالت کے بعد بحالی صحت کی غرض سے کشمیر تشریف لے گئے تھے۔

چمن سے رنگ رنگ کی اُبل رہی ہیں مستیاں — شبابِ نوبہار نے بھریں کچھ ایسی بجلیاں
کہ اِک نگاہِ مست سے اُبھر گئیں جوانیاں — کلی کلی کی جوش میں مسک رہی ہیں چولیاں

بھری ہیں کتنی شوخیاں شبابِ نوبہار میں

گلوں کی بارگاہ کی بدل گئی ہیں چوکھٹیں — صبا نے خود بکھیر دیں چمن کی زلف کی لٹیں
اُتر کے بیلیں شاخ سے بدل رہی ہیں کروٹیں — عروسِ گل کے لب پہ ہیں عجیب مسکراہٹیں

نہ جانے کیسی بیخودی ہے اِس بہشت زار میں

حسین مرغزار کے بغل میں ہیں پہاڑیاں — اور اُن سبھوں کی برف سے گُندھی ہوئی ہیں چوٹیاں
اُفق پہ رنگ رنگ کی مچل رہی ہیں سُرخیاں — کہ یا شفق کی نہر میں نہا رہی ہیں دیویاں

ملاحتوں کے قافلے پڑے ہیں کوہسار میں

ہے ضَوفگن یہ عکسِ گل حسینِ آبشار میں — نہا رہی ہیں یا پری اُتر کے جوئبار میں
کچھ اتنا کیف بڑھ گیا تھا میرے قلبِ زار میں — نگاہ جم کے رہ گئی فضائے کوہسار میں

اُتر رہی تھیں دیویاں بہار کی بہار میں

خنک سوادِ شام کی صُراحیاں لئے ہوئے — نگاہِ مست و شوخ میں گلابیاں لئے ہوئے
شبابِ نوبہار کی جوانیاں لئے ہوئے — لبوں پہ ارضِ حُسن کی کہانیاں لئے ہوئے

مچل رہے تھے زمزمے صدائے آبشار میں

ہزار داستاں کی تھیں چمن میں نغمہ سنجیاں — سُنا رہی تھیں بُلبلیں شبابِ گل کی داستاں
گلوں کو دیکھ دیکھ کر چہک رہا تھا بوستاں — قطار در قطار سب یہ کہہ رہے تھے خوش بیاں

وہ فخرِ ہند آ گیا ہے اِس بہشت زار میں

ہوئی ہیں جس کے نطق سے ادب میں سحرکاریاں — فدا ہیں خوش بیانیاں نثار خوش کلامیاں
وہ جس کے لفظ لفظ میں ہیں معجزہ نمائیاں — اُسی سے ہونگی ہند کے چمن کی نخلبندیاں

گلے ملیں گے بھائی بھائی پھر نئی بہار میں

شفا سے اُس جناب کی ملیں وہ دل کو راحتیں — کہ سرزمینِ حُسن نے بدل دیں اپنی لذتیں
اُبل پڑی ہیں چشمۂ علوم کی سخاوتیں — ادب کے بوستاں کی پھر بدل رہی ہیں قسمتیں

شباب پھر سے آ گیا ہے ہند کی بہار میں

ہمارے افسانے

(موجودہ دور کے عام افسانوں پر ایک سرسری نظر)

از پروفیسر محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی - از مدراس

آجکل اُردو زبان میں افسانوں کی بھرمار ہے، چند ٹھوس اور بلند پایہ رسالوں کے سوا اکثر و بیشتر رسالے افسانوں سے بھرے رہتے ہیں - آج سے بیس پچیس سال پہلے یہ بات نہ تھی - اُس زمانے کے رسالوں میں زیادہ تر مفید کارآمد اور معلومات کو بڑھانے والے مضامین ہوا کرتے تھے دکن ریویو مخزن - زمانہ کانپور - الناظر لکھنؤ - پھر پنجاب ریویو لاہور، ادیب الہ آباد - لسان العصر لکھنؤ ایسے رسالے تھے، جن پر اُردو زبان فخر کر سکتی ہے - ان کا ہر نمبر علم و ادب کا بہترین اور قابل قدر سرمایہ پیش کرتا تھا - اور آج بھی وہ اُسی قدر مفید ہیں جتنے اپنی زندگی میں تھے - افسوس ہے کہ رسالہ زمانہ کے سوا اب ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا - سب بند اور مرحوم ہو چکے ہیں - اللہ زمانہ کو حیات خضر عطا فرمائے بہر حال ان رسالوں کے ہر نمبر میں کم سے کم ایک بلند پایہ دلچسپ اور سبق آموز افسانہ ہوتا تھا مگر اب تو بعض رسالے افسانوں کے سوا اور کچھ شائع ہی نہیں کرتے۔

افسانوں کے سیکڑوں مجموعے بھی کتابی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں - ملک میں بہت سے افسانہ نگار پیدا ہوئے اور اچھی خاصی شہرت بھی حاصل کر چکے ہیں، لیکن جب کبھی مجھے افسانے پڑھنے کا اتفاق ہو جاتا ہے تو افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا - اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ آجکل کچھ اس قسم کے بازاری بے نتیجہ اور حد درجہ رکیک بلکہ فحش افسانے لکھے جانے لگے ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد طبیعت مکدر ہو جاتی ہے - اور افسوس کے ساتھ اُٹھا کر رکھ دینا پڑتا ہے - خصوصاً ہمارے ملک کے نوجوان مسلمان افسانہ نگاروں کی طبیعت کا رُجحان ہی کچھ عجیب و غریب ہے - ان کے زیادہ تر افسانے محض نفسانی اور شہوانی جذبات کو حرکت میں لانے، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو آوارہ بنانے، اُن کے اخلاق خراب کرنے یعنی تباہ کُن عشق بازی سکھانے، فیشن پرستی اور بیجا آزادی کا غلط ذوق پیدا کرنے یورپ کی مغربی معاشرت کی نقل اُتارنے اور اس پر اترانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا - زیادہ تر یہ افسانے تجارتی اغراض سے لکھے جاتے ہیں، لکھنے اور چھپوانے کا مقصد پیسہ کمانا ہوتا ہے - مصنف اور پبلشر

کی بلا سے۔ قوم کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جہنّم میں جائیں یا جنت میں۔ ممکن ہے ان سے پیسہ مل جاتا ہو۔ لیکن اس ناپاک اور مہلک لٹریچر کی بدولت جس قدر اخلاق تباہ ہو رہے ہیں وہ نہایت افسوسناک اور خطرناک ہیں۔

اِن افسانوں کے لکھنے والے زیادہ تر نیم تعلیم یافتہ، بے روزگاری کا شکار "سینما زدہ" اور ایک حد تک آوارہ خیال، پریشان دماغ نوجوان ہوتے ہیں۔ ان کے پڑھنے اور پسند کرنے والے بھی کچھ اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان افسانوں کے قصّے یا واقعات و حالات تقریباً یکساں اور زیادہ تر سینما بینی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً عورت اور مرد (ہیروئن اور ہیرو) دونوں اعلیٰ خاندان کے، اعلیٰ سوسائٹی کے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ روشن خیال گھرانوں کے، مغربی تہذیب کے دلدادہ، آزاد اور پردہ کے مخالف یا نیم پردہ کے پابند، لباس اور مکانات اور اُن کی آرایش، کھانے پینے کے آداب، رہنے سہنے کے طریقے، سب تقریباً مغربی یا نیم مغربی، باپ کہیں کے بڑے عہدہ دار یا دولتمند تاجر یا زمیندار ہوا کرتے ہیں۔ عورتیں اکثر ساڑیوں میں ملبوس اور مرد سوٹ بوٹ میں نظر آتے ہیں۔ بنگلے کوٹھیاں، فرنیچر سب انگریزی طرز کے۔ جن میں پائیں باغ بھی گویا ضروری ہیں۔ غرض ہر چیز دورِ جدید کی مگر دونوں ہندستانی ہوتے ہیں۔ اور ان کی باتیں اخباری یا کتابی زبان میں ہوتی ہیں۔ اُس سادہ اُردو میں نہیں جو گھروں میں بولی جاتی ہے۔ اگر دونوں مسلمان ہوں تو غلط سلط فارسیت کا غلبہ اور ہندو ہوں تو ہندی الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔ آجکل چند ہندی الفاظ بھی ضرور لائے جاتے ہیں۔ مثلاً پریم سماج وغیرہ۔ ہر جملے میں تکلف اور بناوٹ۔ غرض ان افسانوں کے مکالموں میں وہ زبان نظر آتی ہے جو دراصل نہ کہیں سننے میں آتی ہے نہ دیکھنے میں اور نہ حقیقت میں کہیں بولی جاتی ہے گفتگو کا ہر انداز انوکھا، ہر بات میں مکروہ مبالغہ۔ اور ہر ایک قصّہ دُور از کار لفّاظیوں سے بھرا ہوا۔ اور بالکل خلاف واقعہ ہوتا ہے۔ اکثر باتیں عام رواج، رسم، معاشرت کے خلاف اور اَن ہونی ہوتی ہیں۔ جو اس وقت کسی خیالی ہندوستان میں ہوں تو ہوں۔ غرض اِن افسانوں کو پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ہندوستان نہایت تعلیم یافتہ اور دولتمند مُلک ہے اور جو حد سے زیادہ جدید تمدن کا مرکز، بے فکری، آسایش اور تموّل کا گھر، شایستگی اور نئی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ گویا ہمارا ملک سراپا رومان ہے۔ نہ یہاں افلاس عام ہے اور نہ جہالت۔ نہ یہاں کوئی مصیبت زدہ مزدور، نہ محنت کش فاقہ زدہ کسان، نہ آپ کو اِن افسانوں میں کسی غریب گھرانے کی تصویر ملے گی۔ نہ بُرے رسم و رواج کا مرقع۔ نظر آئے گا۔ نہ مفلسی کے شکار انسانوں کی زندگی کے نمونے ملیں گے اور نہ مصائب زدہ

گانوں والوں کے المناک حالات کے وہ مناظر دکھائی دیتے ہیں جو آپ آجکل ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ غرض کہاں تک طول دیا جائے۔ پہلے اکثر ہیرو علیگڈھ کے تعلیم یافتہ یا طلبہ ہوا کرتے تھے یا اور کسی کالج کے، اور اب اکثر و بیشتر یورپ سے واپس آئے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے افسانہ نگاروں کی ادبی کائنات جس پر بڑی بڑی عمارتیں اور قلعے کھڑے کر دئے جاتے ہیں۔ میرا یہ تبصرہ عام اور اکثر افسانوں پر ہے، ورنہ آج بھی کبھی کبھی ایسے افسانے دیکھنے میں آجاتے ہیں جو حقیقی معنے میں "فسانہ" کہے جاسکتے ہیں۔ اور ان میں وہ روح موجود ہوتی ہے جو دلوں کو کھینچتی اور دماغوں میں اپنے غیر فانی نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ اور جن پر ہماری زبان بجا طور پر ناز کرسکتی ہے مگر یہ نہ عام طور پر مقبول ہوتے ہیں نہ ان کے لکھنے والوں کو زیادہ شہرت ہی حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے اکثر افسانہ نگار ناکام ہیں اور اردو کی ادبی دنیا میں کوئی امتیازی درجہ حاصل نہیں کرسکے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہمارے زیادہ تر افسانہ نگار زبان کا مرتبہ گرا رہے ہیں۔

ہمارے کامیاب اور غیر فانی افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ تابناک نام پریم چند کا ہے اُن کے افسانے جہاں کہیں مل جاتے ہیں ہر اردو داں شوق سے پڑھتا، لطف حاصل کرتا اور کچھ اثر لے کر اُٹھتا ہے۔ پریم چند آنجہانی کو یہ غیر فانی شہرت اور کامیابی کیوں حاصل ہوئی، ذرا اس پر غور کر لیجئے، اُن کے زیادہ تر قصے اہل ملک کے روزمرہ زندگی کے سچے نمونے ہیں، خواہ وہ گانوں کی معاشرت ہو یا شہر کی، تعلیم یافتہ اور دولتمند گھرانوں کا ذکر ہو یا غربت زدہ جھونپڑیوں کا، ان کے زیادہ تر قصے غریب دیہاتیوں کی زندگی کے المناک مناظر پیش کرتے ہیں۔ پھر زبان اس قدر سادہ و سلیس اور بیان میں اتنا لوچ اور نرمی کہ سبحان اللہ، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوش خرام ندی آہستہ آہستہ بہتی اور اس کی روانی دل میں گھر کرتی چلی جاتی ہے۔ عجیب اثر ہوتا ہے۔ مگر ہمارے افلاس زدہ، مغربی فکشن کے دلدادہ نوجوان ادیب اس رنگ کو اختیار نہیں کرتے۔ ہمارے خیال میں اُن کی ناکامی کے سو فیصدی اسباب یہی ہیں۔ انھیں کی قسم کے چند ایڈیٹر صاحبان اپنی اپنی ضرورت سے ضرور ان کی حوصلہ افزائی کر دیتے ہیں۔ مگر اس سے ملک کے اردو پڑھنے والے طبقے کا مذاق روز بروز خراب ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ ایسا عبرتناک ہوگا کہ جس کی تلافی نہ ہوسکے گی خدا کی مرضی اور ہماری بدبختی سے یہ متعدی مرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ خدا کی پناہ۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ مرض بڑھتا ہی جاتا ہے۔ عموماً رسالوں میں علمی مضامین، ادبی و تاریخی، تنقیدی مقالے اور اکثر ایسے مضامین تو بہت ہی کم نظر آتے ہیں، جو لکھنے والے کی ذاتی کاوش، محنت تحقیق

ریسرچ) کا نتیجہ ہوں۔ چند بلند پایہ علمی رسالوں کے سوا جن کی تعداد ملک میں بہت ہی کم اور ان کی اشاعت بالکل ہی محدود ہے۔ تمام رسالے شروع سے آخر تک افسانوں سے پٹے نظر آتے ہیں۔ خواہ وہ دہلی کے ہوں یا بنگال کے، بہار کے ہوں یا بمبئی کے، اور پنجابی رسالے تو گویا اس معاملے میں سب سے آگے اور سب کے اُستاد ہیں۔ اُن کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، اور آئے دن ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پنجاب اور بالخصوص لاہور اس وقت اُردو کا سب سے بڑا دارالاشاعت ہے۔ لیکن وہاں اُردو کی خدمت آمدنی کا ذریعہ، وجہ معاش، تجارت پیشہ بن کر رہ گئی ہے۔ اچھی کتابیں بہت کم اور ایسی زیادہ شائع ہوتی ہیں جن کا شائع نہ ہونا ہی اچھا ہوتا۔ اور جن پر مذاق سلیم کو خون کے آنسو بہانا پڑتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔ ملک کے پڑھنے والوں کا مذاق اس قدر بگڑ گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ لاہور کے بعد دوسرا نمبر دہلی کا ہے، دُلہنوں کی کانفرنس، پہلی رات کی سرگزشت، دُلہن کی ڈائری، ایک ایکٹرس کی اپنی بیتی، گناہ کی راتیں، وغیرہ کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اور دھڑا دھڑ بک رہی ہیں۔ بعض پر لکھا ہوتا ہے "اِسے عورتیں نہ پڑھیں"۔ بعض کی نسبت اشتہارات میں دیکھنے میں آیا۔ لکھتے ہیں کہ "یہ کتاب کنوارے اور کنواریاں نہ منگائیں"۔ عربی کی ایک مثل یا مقولہ ہے کہ "الانسان حریصٌ فی مَا مُنِعَ" (آدمی کو جس چیز سے روکا جائے اُسی کا وہ حریص ہوتا ہے)۔ یہ انسانی فطرت ہے، اور اس راز کو یہ لوگ خوب جانتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی ہی لڑکیاں اور لڑکے اس قسم کی کتابوں کو زیادہ شوق سے منگاتے ہیں اور اپنے عزیزوں سے چھپا کر چپکے چپکے دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آخر اخلاقی حیثیت سے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ مصنف اور تاجر کو چند ٹکے مل جاتے ہیں!

ہم احسان فراموش اور ناشکر گزار نہیں، اُردو کی ترقی و اشاعت میں پنجاب کا جو حصہ ہے ہم اس کو جانتے اور مانتے ہیں، مگر اب یہ چند سال سے جو رَو چل گئی ہے اس کو روکنا اور اُس کی اصلاح کرنا پنجاب اور دہلی کے سچے اہلِ قلم اور بہی خواہان اُردو کا فرض ہے۔ امید ہے کہ ہمارا یہ مخلصانہ گلہ ناگوار خاطر نہ ہوگا۔

اچھی تصانیف کی آجکل مٹی خراب ہے۔ ایک شخص برسوں کی محنت اور کاوش کے بعد ایک کتاب تیار کرتا ہے اور بڑی مصیبت سے رستم کے ہفت خواں طے کر کے ہزار یا پانسو کی تعداد میں چھپواتا ہے، لیکن وہ پندرہ بیس سال تک نہیں بکتی، جو کچھ روپیہ لگاتا ہے اُسے اپنی گرہ سے ادا کرنا پڑتا ہے، اور اگر وہ بے غیرت نہیں ہوتا تو پھر کبھی تصنیف و تالیف کا نام نہیں لیتا

اگر وہ کسی تاجر کتب یا دار الاشاعت کے مالک کے پاس جاتا اور چاہتا ہے کہ مناسب حق تصنیف لے کر دیدے تو کوئی ادارہ کتاب لینے اور چھاپنے پر تیار نہیں ہوتا. نہ کوئی تاجر کچھ جلدیں خرید کر اس کی اشاعت پر آمادہ ہوتا ہے۔ غریب جہاں جاتا ہے، یہی جواب ملتا ہے" اینڈ مال ہے" آخر بیچارہ مایوس و ناکام واپس ہوتا ہے. علمی اور سنجیدہ رسالے جو ملک میں اس وقت شائع ہو رہے ہیں اُن کی حالت بھی حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ان رسالوں میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کے مصارف دوسری مدوں سے پُورے کرنے پڑتے ہیں. ایسے ادارے بھی زیادہ کامیاب اور دولت مند نہیں جو ملک میں اچھی کتابیں اور بلند پایہ افسانے پیش کرتے ہیں۔ البتہ وہ رسالے مالی اور اشاعتی اعتبار سے بہت کامیاب ہیں، جن کا مقصد محض اس قسم کے افسانوں اور بازاری یا فحش لٹریچر کی اشاعت ہے. وہ تاجر اور ادارے سرمایہ دار بن گئے ہیں جو ایسے ناول اور کتابیں شائع کر کے ملک کے نوجوانوں کی زندگیاں برباد کر رہے ہیں۔ دیکھیں ہمارے سنجیدہ ادارے اور سنجیدہ ارباب قلم کب ادھر متوجہ ہوتے ہیں، اور اس خوفناک متعدی بیماری کا کیا علاج سوچتے ہیں۔ ورنہ موت تو یقینی ہے۔ یاد رہے کہ ایسا لٹریچر زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ چند روزہ ہوا ہے، اور یہ مقبولیت بھی کچھ دنوں کی مہمان ہے پھر ردّی کے مول بھی کوئی نہ پوچھے گا. ابھی ربع صدی پہلے اُردو ناولوں کا بڑا زور تھا، ہزاروں لکھے گئے اور لاکھوں کی تعداد میں چھپے لیکن آج اُن کا پتہ بھی نہیں ہے، کام وہ کیجئے جو کچھ دنوں زندہ رہے۔

انھیں وجوہ کی بنا پر مجھے اُردو افسانوں سے نفرت سی ہو گئی ہے. میں نے ملک کے بہترین لکھنے والوں کے ناول اور افسانے پڑھے ہیں، مگر اب زمانہ اور مذاقِ عام بدل چکا ہے اب ہمارے ملک میں انھیں کوئی نہیں پوچھتا، اس لئے کہ اُن کا پروپیگنڈا نہیں۔

مجھے بنگالی ناولوں اور افسانوں کے ترجمے بہت پسند ہیں، یا اُسی قسم کے افسانے، حقیقت میں وہ خوب ہوتے ہیں. بنگال کے سحر نگار ناول نگار بنکم چند چٹرجی کے اکثر و بیشتر ناولوں کا ترجمہ لکھنؤ کے مشہور و نامور ادیب و انشا پرداز منشی جوالا پرشاد برق آنجہانی نے کیا تھا. برق زبردست شاعر اور عدالت خفیفہ لکھنؤ کے جج تھے۔ اور جن کی لال کوٹھی کبھی جھاؤلال کے پُل پر مشہور تھی۔ تقریبًا اُن کے سب ناول نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپے اور ملتے ہیں۔ یہ ترجمے زبان اور افسانوی حیثیت سے لاجواب ہیں. لیکن اُن کی شہرت مُردہ ہو چکی ہے، اب ان کا کوئی پروپیگنڈا کرنے والا نہیں اور بوڑھا نولکشور پریس اپنے پُرانے ڈھرے پر چلا جا رہا ہے۔ اس کے مالک کو نہ اس سے زیادہ فائدہ ہے

اور نہ اُنھیں ادھر چنداں توجہ اور دلچسپی۔ محض دادا کا نام قائم رکھنے کے لئے پریس کا وجود باقی ہے اِس لئے اِن ناولوں اور اِن کے مترجم کی یاد دلوں سے تقریباً محو سی ہو چکی ہے۔ غضب یہ ہے کہ اُردو کی مستند تاریخوں میں بھی اِن کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ ان میں آجکل کے ایسے لوگوں کا تذکرہ موجود ہے جن کی اُن کے آگے کوئی حقیقت نہیں۔ یہ بات بھی بہت کم لوگ جانتے ہونگے کہ پریم چند آنجہانی اسی قسم کے بنگالی افسانوں سے متاثر ہوئے۔ اور غالباً یہی اُن کی کامیابی کا راز ہے۔ سُدرشن جی بھی افسانہ نگاری میں اسی ڈگر پر چل کر کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ زیادہ تر بنگالی افسانوں کا ترجمہ کرتے اور خود بھی اُسی انداز میں لکھتے ہیں۔ لیکن پنجابی ہونے اور زیادہ محنت و توجہ نہ کرنے کی وجہ سے اُن کی زبان ویسی عمدہ نہیں جیسی پریم چند کی ہے۔

گو میرا رُجحان طبع افسانہ نگاری کی جانب زیادہ نہیں رہا، تاہم میں نے اپنے مذاق اور اپنی پسند کے موافق بہت سے عربی افسانوں کا اور تین چار ناولوں کا ترجمہ کیا ہے۔ ایک افسانوں کا مجموعہ جس کا نام "انسانی قربانیاں" ہے۔ مُدت ہوئی دائرۂ ادبیہ لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ بہت پسند کیا گیا مگر اب عرصہ سے نایاب ہے اور افسانے مختلف رسالوں میں شائع اور مقبول ہو چکے ہیں، رسالوں نے ایک دوسرے سے نقل کئے اور بار بار چھپے، بعض طبع زاد افسانے بھی مقبول اور کامیاب ہوئے۔

خیر میں چاہتا یہ ہوں کہ ہمارے نوجوان افسانہ نگار بیدار ہوں اور غور کریں، سوچ سمجھکر قدم اُٹھائیں اور آگے بڑھیں تو کامیابی دشوار نہیں۔ مذاق کی اصلاح بھی ممکن ہے، اخلاق کی بھی، زبان اور ادب کی بھی۔ ہم اس صنفِ ادب سے بہت کچھ مفید کام لے سکتے ہیں، کیونکہ یہ انسانی طبائع پر فطرتاً زود اثر ثابت ہوتی ہے۔ اس سے دنیا میں بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں، بلکہ اُن کی کایا پلٹ کی جا سکتی ہے۔ اور تنزل و ادبار میں مبتلا قومیں غلامی و تباہی سے نکل کر جلد عروج و آزادی کی منزل تک پہنچ سکتی ہیں۔ کیا ہمارے افسانہ نگار اس مسئلہ پر غور کریں گے؟

زمانے کا ساقی تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے!۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟ (غالبؔ)

مزدور اور سرمایہ دار

(جناب انیس مرتضیٰ زبیری مارہروی مولنس، ایم۔ ایل۔ اے)

(پہلا سین)

موسم گرما میں اک مزدور ہے مصروفِ کار ۔۔۔ سخت محنت سے پسینہ میں ہے ڈوبا جسم زار
سارا چہرہ دھوپ کی تابش سے کمھلایا ہوا ۔۔۔ بھوک کے صدموں سے دل جیسے ہو مرجھایا ہوا
ہاتھ اس کے ٹوکری ڈھو ڈھو کے پتھر ہو گئے ۔۔۔ یا الٰہی دن جوانی کے بھی دوبھر ہو گئے
پاؤں ننگے گرم بالو ریت سے جھلسے ہوئے ۔۔۔ وہ کہیں پھٹ پھٹ گئے ہیں اور کہیں سُتے ہوئے
اک لنگوٹی کے سوا اس کے بدن پر کچھ نہیں ۔۔۔ کاش پورا جسم اپنا ڈھانپ سکتا وہ کہیں
جسم میں نکلی ہوئی ہیں یوں ہزاروں ہڈیاں ۔۔۔ جیسے لپٹی ہوں کسی ڈھانچے سے لاکھوں رسیاں
جسم اس کا دھوپ میں محنت سے کالا پڑ گیا ۔۔۔ کس مصیبت سے الٰہی اس کو پالا پڑ گیا
سخت محنت کر رہا ہے کھا رہا ہے جھڑکیاں ۔۔۔ آنکھ سے آنسو رواں ہیں سہہ رہا ہے گھڑکیاں
آہ اے مزدور، تیرا حالِ ابتر دیکھ کر ۔۔۔ چشمِ شاعر ہو گئی اشکوں سے آخر تر بہ تر
تو سمجھتا ہے کہ دنیا میں خوشی ناپید ہے ۔۔۔ یعنی یہ دارِ محن اک جائے مکر و کید ہے
تیری آہیں پھونکدیں گی یہ زمین و آسماں ۔۔۔ تیرے نعرے پھر اڑا دینگے جہاں کی دھجیاں

(دوسرا سین)

چل رہے ہیں برقی پنکھے سو رہا ہے اک رئیس ۔۔۔ ٹٹیاں خس کی لگی ہیں قصر ہے کتنا نفیس
اسکی راحت راحتِ جنت سے ہرگز کم نہیں ۔۔۔ اس کی زینت خلد کی زینت سے ہرگز کم نہیں
اس کا بستر عیش و عشرت کے لئے تیار ہے ۔۔۔ ماسوا راحت ہے جو کچھ وہ محض بیکار ہے
اس کی دنیا محفلِ آراستہ کا نام ہے ۔۔۔ بزم میں یعنی مے و نغمے سے اس کو کام ہے
نعمتیں دنیا کی حاضر اس کے کتوں کے لئے ۔۔۔ گو کہ مفلس مر رہے ہیں چند لقموں کے لئے
اُس کو اندازہ نہیں بے مانگی کیا چیز ہے ۔۔۔ کیا خبر اس کو حق ہمسائیگی کیا چیز ہے
اُس کو کیا اندازہ کیا ہیں مفلسی کی سختیاں ۔۔۔ کیا خبر اس کو کہ کیا ہیں نالہائے بیکساں

اُس کو کیا پرواہ کوئی رات دن ننگا پھرے　　کیا خبر اسکو جو کوئی بھوک میں تڑپا کرے
اُس کو کیا اندازہ کوئی بے دوا بیمار ہے　　ایک پیسہ کے لئے مرنے کو بھی تیار ہے
اُس کو کیا اندازہ کوئی دھوپ میں جھلسا کرے　　کیا خبر اس کو جو کوئی رات میں تڑپا کرے
میں نے مانا تو ہے بندۂ عیش کا سرمایہ دار　　مفلسوں کا حال بدلے گا کبھی پروردگار!
تابکے یہ عیش و عشرت تابکے زعمِ سرور　　خاک میں مل جائے گا اک دن ترا سارا غرور
دوستی کا دم کسی سے وہ کبھی بھرتی نہیں　　امتیازِ شاہ و مفلس موت کچھ کرتی نہیں
موت آئے گی تو بے نام و نشاں ہو جائیگا　　تیرا سرمایہ نصیبِ بیکساں ہو جائے گا

آہِ بیکس کچھ نہ کچھ اپنا اثر کر جائے گی
ایک دن وہ تیرے دل میں تیر بن کر جائیگی

ساقی

(از جناب احمد ندیم قاسمی)

میری تشنہ لبی کیوں موردِ الزام ہے ساقی　　کہ جی بھر کر لنڈھانے کا یہی انجام ہے ساقی
مری ویران آنکھیں اب زباں کا کام کرتی ہیں　　نہفتہ میری خاموشی میں اک کہرام ہے ساقی
میں وہ مے نوش ہوں جسکی نگاہِ تیز سے ابتک　　فلک کا تارا تارا لرزہ براندام ہے ساقی
مری پرواز کے چرچے ہیں حوران بہشتی میں　　فرشتوں کی زبانوں پر بھی میرا نام ہے ساقی
جھپٹ جس کی پہاڑوں کے کلیجے چاک کرتی ہے　　مرے ہاتھوں میں وہ شمشیر خوں آشام ہے ساقی
نظر آتا ہے جس میں دورِ مستقبل کا ہر لمحہ　　مرے سینے میں اک ایسا اچھوتا جام ہے ساقی
حقیقت میں مشیت نے فقط اک کھیل کھیلا ہے　　وگرنہ زندگی اک محشرِ اوہام ہے ساقی
منجم سے نہ سُن افلاک کی گردش کے افسانے　　وہاں جاتا تو مجھ سے بے ہنر کا کام ہے ساقی

مجھے تو بس خود اپنے عشق کا ظرف آزمانا ہے
نہ شوقِ سرخوشی نے خواہشِ انعام ہے ساقی

مولانا شبلی اُردو شاعر کی حیثیت سے

(از سید اصغر علی سکندر آبادی)

اگرچہ اُردو ادب میں مولانا شبلی کا نام بہت مشہور ہے لیکن شاعر کی حیثیت سے انھوں نے کوئی خاص نام پیدا نہیں کیا جس کے متعدد وجوہ ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کی اُردو شاعری کوئی درجہ نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا موصوف کو اُردو شاعری میں بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔

اُنھوں نے شاعرانہ حیثیت سے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی، اس لئے ان کی شاعری کو بالکل فطری سمجھنا چاہیئے۔ وہ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے، اُن کا مطالعہ بھی بہت زیادہ تھا۔ اعظم گڑھ کے مشاعروں میں وہ شریک بھی ہوتے تھے اور اپنے یہاں بھی مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے جن میں بذاتِ خود حصّہ لیتے تھے۔ اُس زمانہ میں منشی امیراللہ صاحب تسلیم لکھنوی کا بہت چرچا تھا اس لئے مولانا نے بھی اپنا تخلص تسلیم کے ہموزن تسنیم رکھا۔ لیکن بعد میں خود اپنے نام شبلی کو تخلص قرار دیا جو آخر تک برقرار رہا۔

مولانا کی شاعری میں غزلیات، قصائد، مثنوی، مسدس، وغیرہ سبھی اصنافِ سخن ہیں، لیکن ان سب میں اُن کی نظمیں زیادہ مؤثر اور قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں کو مختلف عنوانات کے ماتحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً تاریخی اور اخلاقی جس میں اسلامی روایات اور تاریخی واقعات قلمبند کئے گئے ہیں دوسری اصلاحی نظمیں جو قوم کی اصلاح کی غرض سے لکھی گئیں، اور تیسری سیاسی نظمیں جو اس زمانے کے واقعات کے عکس ہیں اور جن کے مطالعہ سے اس زمانے کی سیاسی حالت پر کافی روشنی پڑتی ہے

سب سے پہلے ہم مولانا کی غزلیات کو دیکھتے ہیں۔

غزلیات مولانا کی اُردو کلیات میں سب سے پہلی غزل نہایت کامیاب ہے، ملاحظہ ہو:۔

اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے نشان چھوڑا نہ پر کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا

بھلی تھی تقدیر یا بری تھی یہ راز کس طرح سے عیاں ہو
بتوں کو سجدے کئے ہیں اتنے کہ مٹ گیا سب لکھا جبیں کا

وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہونگے تو ہاں بھی ہوگی ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا

یہ نظم آئیں یہ طرز بندش، سخنوری ہے فسونگری ہے — کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا

گر عام طور پر یہ کہنا درست ہوگا کہ مولانا کی غزلیات میں کوئی خاص بات نہیں ہے البتہ فارسی ترکیبیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ ایک دوسری غزل کے چند شعر یہ ہیں:۔

یار کو رغبت اغیار نہ ہونے پائے — گل تر کو ہوس خار نہ ہونے پائے

اسمیں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ — شکوۂ چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے

پھر کہیں جوش میں آجائیں نہ یہ دیدۂ تر — سامنے ابر گہر بار نہ ہونے پائے

جمع کر لیجئے غمزوں کو مگر خوبی بزم — بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے

آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلی
حال دل دیکھئے اظہار نہ ہونے پائے

مختلف غزلیات کے چیدہ چیدہ اشعار یہ ہیں:۔

قتل ہو کر بھی سبکدوشی کہاں — تیغ کا گردن پہ احساں رہ گیا

کیا قیامت ہے کہ کوئے یار سے — ہم تو نکلے اور ارماں رہ گیا

لوگ پہونچے منزل مقصود تک — میں جرس کی طرح نالاں رہ گیا

تیس دن کے لئے ترک مے و ساقی کرلوں — واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں

کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے — تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کرلوں

درد فرقت سے ترے ضعف ہے ایسا ہم کو — خواب میں بھی ترے دشوار ہے آنا ہم کو

کچھ اکیلی نہیں میری قسمت — غم کو بھی ساتھ لگا لائی ہے

موت بھی روٹھ گئی تھی مجھ سے — یہ شب ہجر منا لائی ہے

مجھ کو لیجا کے مری آنکھ وہاں — اک تماشا سا دکھا لائی ہے

آہ کو سوئے اثر بھیجا تھا — واں سے کیا جانئے کیا لائی ہے

ان اشعار میں انتہائی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔

قصائد: مولانا کا وہ قصیدہ جو انھوں نے سلطان عبدالحمید والی ترکی کی شان میں لکھا تھا بہت مشہور ہے۔ درحقیقت اس کا طرز بیان پُرجوش ہے اور استعارات اور تشبیہات ایک سے ایک بلند پایہ ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

پھر بہار آئی ہے شاداب ہے پھر دشت وچمن — بن گیا رشک گلستان ارم پھر گلشن

شعلہ زن پھر چمنستاں میں ہوئی آتش گل — پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن
آگ پانی میں لگادی ہے کسی نے شاید — حوض میں عکس گل و لالہ ہے یا جلوہ فگن
باغ میں بادِ بہاری کی جو آمد کی ہے دھوم — بہرِ تسلیم ہر اک شاخ کی خم ہے گردن
مسند آرائے تجمل جو ہوا شاہدِ گل — مرغِ گلشن یہ صدا دیتے ہیں "الملک لمن"
شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں صبا ہے بدمست — وجد میں تال لگاتا ہے ہر اک برگِ سمن
سر نکالے ہیں حبابوں نے تہِ آب سے کیوں — نظر آتی نہ تھی پانی میں مگر سیرِ چمن
چونکتے ہیں جو کبھی خواب سے اطفالِ بہار — تھپکیاں دیتی ہے سونے کے لئے بادِ چمن

دوسرا قابلِ ذکر اور کامیاب قصیدہ وہ ہے جو مولانا نے جسٹس سید محمود کی شادی کے موقعہ پر لکھا۔ اس کا مضمون پرشکوہ اور مناسب وقت ہے۔ شادی کی مناسبت سے مولانا نے بہاریہ تمہید لکھی ہے اور اسی زمین میں قصیدہ کہا ہے جو محسن کاکوروی کے مشہور زمانہ قصیدہ

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

پھر ہوا بادِ بہاری کا جو عالم میں عمل — چھا لیا سبزۂ نوخیز نے سب دشت و جبل
ناز سے سوئے چمن جاتی ہے پھر بادِ بہار — جھومتے آتے ہیں پھر صحنِ چمن میں بادل
نوعروسانِ چمن کے ہیں نرالے انداز — کہ صبا گود میں لیتی ہے تو جاتے ہیں مچل
سمتِ قبلہ سے جو اٹھتی ہیں گھٹائیں ہر بار — کہتی ہیں تو بہ زاہد سے کہ اب کی تو سنبھل
کچھ عجب شان سے تنتے ہیں جوانانِ چمن — صحنِ گلزار ہے یا عیش و طرب کا دنگل
جھومتی چلتی ہے بیخود روشوں پر جو نسیم — غنچے کہتے ہیں چٹک کر کہ سنبھل دیکھ سنبھل
اے صبا باغ میں آنا تو دبے پاؤں ذرا — نیند میں سبزۂ خوابیدہ کے آئے نہ خلل
بوئے خوش سے یہ نسیم سحری کہتی ہے — حجرۂ غنچہ میں کیا کرتی ہے آ، سیر کو چل
اوجِ اقبال تو دیکھو کہ سلیماں کی طرح — سیر کرتے ہوئے پھرتے ہیں ہوا پر بادل
مژدہ اے بادہ کشو اب تمہیں ڈر کس کا ہے — ابر کا عالم بالا پہ بھی ہے اب تو عمل
میں بھی ہوں عصرِ وقت جو محمود ہے تو — میں بھی ہوں نازِ سلف تو ہے جو فخرِ ازل

مسدس ۱۸۹۴ء میں سرسید علیہ الرحمۃ نے قومی تھیٹر علی گڑھ میں ایک جلسہ کیا تھا جس میں خود سرسید

اور اُن کے نامور رفقائے کار نے حلیہ اور پوشاکیں تبدیل کر کے تقریریں اور نظمیں پڑھی تھیں۔ یہ مسدس جس کا عنوان "تماشائے عبرت" ہے مولانا نے اسی جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس کے شروع کا بند یہ ہے

آج کی رات یہ کیوں جمع ہیں احباب ہمہ بھیڑ کیا ہے نظر آتا ہے یہ کیسا عالم
نوجوانانِ ہنر پرور و اربابِ ہمم جوق کے جوق چلے آتے ہیں کیسے پیہم
کچھ سمجھ میں نہیں آتا جو یہ سب سمجھے ہیں
شاید اس بزم کو یہ بزمِ طرب سمجھے ہیں

اس کے بعد یہ بات واضح کر کے کہ یہ کوئی تماشا نہیں ہے بلکہ مقامِ عبرت ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے کبھی سلطنتیں کی تھیں اُن کی اولاد آج ایکٹر بنی ہے اور اپنی عزت و وقار کا کچھ خیال نہیں ہے۔ اسلام کی عظمتِ رفتہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے آخر کے تین بند نہایت دردناک ہیں جنھیں اگر آج بھی پڑھا جائے تو محال ہے کہ آنسو روک لئے جائیں۔

ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصّے یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچّے دیکھنے پائیں نہ تاریخِ عرب کے صفحے
کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانے سے مٹا دیں کیونکر

قرطبہ و شیراز و صفاہان کے وہ زیبا منظر بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار وہ در
مصر و غرناطہ و بغداد کا ایک ایک پتھر اور وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر
ان کے ذرّوں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک
داستانیں انھیں سب یاد ہیں ازبر اب تک

اِن سے سُن لے کوئی افسانۂ یارانِ وطن یہ دکھا دیتی ہیں آنکھوں کو وہی خوابِ کہن
تیرے ہی نام کا اے قوم یہ گاتے ہیں بھجن تیرے ہی نغمۂ پُر درد کے یہ ہیں ارگن
پوچھتا ہے جو کوئی ان سے نشانی تیری
یہ سنا دیتے ہیں سب رام کہانی تیری

مثنوی: اب تک یہ سمجھا جاتا رہا تھا کہ مثنوی صرف داستانِ حسن و عشق کے لئے وقف ہے مگر مولانا شبلی نے ثابت کر دکھایا کہ دیگر اصنافِ سخن کی طرح مثنوی سے بھی ترقی و اصلاحِ قوم کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا یوں ہوتی ہے:-

ادراکِ حالِ ما ز نگہ می تواں نمود
حرفے ز حالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام　جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی　جو تاج تھی فرقِ آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال　کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کر دیئے تھے چراغ جس نے　قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر　ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اُڑا دیئے تھے　اٹلی کو کنوئیں جھنکا دیئے تھے
باایں ہمہ جاہ و شوکت و فر　اقلیمِ ہنر بھی تھی مسخر

اِس پچھلی داستانِ عروج کے بعد تنزّل کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

یہ قوم کہ تاجِ آسماں تھی　اب کوئی گھڑی کی میہماں تھی
تھے جان کے پڑ گئے جو لالے　ہر سانس پہ لیتی تھی سنبھالے
جس چشمہ سے اک جہاں تھا سیراب　وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب
پامال ہوا تھا بوستاں کیا!　آئی تھی بہار پر خزاں کیا!
وہ ابر کہ چھا رہا تھا یکسر　دو دن ہوئے کھل گیا برس کر
پستی نے دبا لیا فلک کو　خورشید ترس گیا چمک کو
اب خضر کو گمرہی کا ڈر ہے　عیسیٰ کو تلاشِ چارہ گر ہے
جو ابر ابھی برس گیا ہے　اِک بوند کو اب ترس گیا ہے

تنزّل کا مکمل نقشہ کھینچنے کے بعد امید کا سہارا بھی دکھایا ہے۔ یہ سہارا کیا تھا، سرسید کی تحریک علی گڑھ۔

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ　اِک سمت سے اِک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہِ دلگیر　پہلو میں اثر، بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی　جادو تھی، فسوں تھی، جانے کیا تھی

ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں
نشتر سی اُتر گئی جگر میں

مرثیہ | مولانا نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب کی موت پر دو مرثیے بربادیِ خانماں اور نالۂ شبلی کے نام سے لکھے۔ پہلا مرثیہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے :۔

وہ برادر کہ مرا یوسفِ کنعانی تھا　　وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیِ انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمتِ یزدانی تھا　　قوتِ دست و دلِ شبلیِ نعمانی تھا
جوش اُسی کا تھا جو میرے سرِ پرشور میں تھا　　بل اسی کا یہ مرے خامۂ پرزور میں تھا
ہم سے ناکاروں کی اک قوتِ عامل تھا وہی　　مایۂ عزتِ اجداد کا حامل تھا وہی

نالۂ شبلی کے ابتدائی اشعار یہ ہیں :۔

وہ بھی تھا ایک دن کہ یہ وحشت سرائے دل　　اک محشرِ نشاط و وفورِ سرور تھا
رنگینیٔ خیال سے لبریز تھا دماغ　　جو شعر تھا چراغِ شبستانِ حور تھا
سینہ میں تھا چمن کدۂ صد امیدِ نو　　آنکھوں میں کیفِ بادۂ ناز و غرور تھا
اک ایک برگ تھا ورقِ نوبہارِ حسن　　ذروں کے رخ پہ صبحِ سعادت کا نور تھا

درحقیقت دونوں مرثیئے درد وکرب کی مجسم تصویر ہیں۔

اب ہم مولانا کی نظموں کو مختلف عنوانات کے تحت دیکھیں گے، مثلاً تاریخی اور اخلاقی، اصلاحی اور سیاسی وغیرہ وغیرہ۔

تاریخی اور اخلاقی نظمیں | یہ نظمیں عام طور سے اسلامی روایات کے متعلق ہیں، اور مولانا نے ان نظموں میں یہ ثابت کردیا ہے کہ صحیح واقعات بھی خوش اسلوبی سے نظم کئے جاسکتے ہیں۔ گو ان نظموں میں اکثر روایات ہی کو نظم کر دیا گیا ہے پھر بھی ان میں شاعری کا پورا زور موجود ہے۔ ان نظموں میں اسلامی معاشرت کے ایسے واقعات درج ہیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے، چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں:

مولانا کی آخری نظم بعنوان "اہل بیت رسول صلعم کی زندگی" اس سلسلہ کی ایک شاندار نظم ہے، اس میں رسول مقبول کی صاحبزادی کی روزانہ زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو :۔

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال　　گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں　　چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں باربار　　گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹ جاتا تھا لباسِ مبارک غبار سے　　جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا
آخر گئیں جناب رسولِ خدا کے پاس　　یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذنِ عام تھا

محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض | واپس گئیں کہ پاس حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضور نے | کل کس لئے تم آئیں تھیں کیا خاص کام تھا
غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منہ سے کہہ سکیں | حیدر نے ان کے منہ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن | جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا
میں ان کے بند و بست سے فارغ نہیں ہنوز | ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گزرتی ہیں | میں ان کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق | جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں | جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کی ہے اہلِ بیتِ مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

دوسری نظم "ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر" سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آنحضرت پر صحابہ کرام و صحابیات کس طرح اپنی جان چھڑکتے تھے اور آپ کو بخیریت اور خوش و خرم دیکھ کر اپنا دکھ بھول جاتے تھے۔

کافروں نے یہ کیا جنگِ احد میں مشہور | کہ پیمبرؐ بھی ہوئے کشتۂ شمشیر دو دم
ہو کے مشہور مدینہ میں جو پہونچی یہ خبر | ہر گلی کوچہ تھا ماتم کدۂ حسرت و غم
ہو کے بیتاب گھروں سے نکل آئے باہر | کودک و پیر و جوان و خدم و خیل و حشم
وہ بھی نکلیں کہ جو تھیں پردہ نشینانِ عفاف | جن میں تھیں سیدۂ پاک بھی با دیدۂ نم
ایک خاتون کہ انصار نکو نام سے تھی | سخت مضطر تھیں نہ تھے ہوش و حواس انکے بہم
موقعِ جنگ پہ پہونچی تو یہ لوگوں نے کہا | کیا کہیں تجھ سے کہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں ہم
تیرے بھائی نے لڑائی میں شہادت پائی | تیرے والد بھی ہوئے کشتۂ شمشیر ستم
سب سے بڑھکر یہ کہ شوہر بھی ہوا تیرا شہید | گھر کا گھر صاف ہوا ٹوٹ پڑا کوہِ الم
اس عفیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا | یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہِ امم
سب نے دی اس کو بشارت کہ سلامت ہیں حضورؐ | گرچہ زخمی ہیں سر و سینہ و پہلو و شکم
بڑھ کے اس نے رخِ اقدس کو جو دیکھا تو کہا | تو سلامت ہے تو پھر ہیچ ہے سب رنج و الم

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

آج گاندھی جی اچھوت ادھار میں مصروف ہیں، لیکن اسلام نے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے اس مسئلہ مساوات کی تعلیم عام کر دی تھی۔ مولانا کی ایک نظم "مساوات اسلام" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے

بارگاہِ نبوی کے جو مؤذن تھے بلال | کر چکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر
جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینہ میں کہیں | جا کے انصار و مہاجر سے کہا یہ کھل کر
میں غلامِ حبشی اور حبشی زادہ بھی ہوں | یہ بھی سن لو کہ مرے پاس نہیں دولت و زر
ان فضائل پہ مجھے خواہشِ تزویج بھی ہے | ہے کوئی جس کو نہ ہو میری قرابت سے حذر
گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں کہ دل سے منظور | جس طرف اس حبشی زادہ کی اٹھتی تھی نظر
عہدِ فاروق میں جس دن کہ ہوئی اُن کی وفات | یہ کہا حضرتِ فاروق نے بادیدۂ تر

اُٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا
اُٹھ گیا آج نقیبِ حشمِ پیغمبر!

مسلمان حق بات پر اپنے خلیفہ تک سے نہ چوکتے تھے اور اسے بھی مجمع عام میں ٹوکنے سے گریز نہ کرتے تھے، اور پھر خلیفہ بھی اپنی بات کے غلط ہونے پر اپنے آپ کو قصوروار مان لیتا تھا۔" عدلِ فاروقی کا ایک نمونہ" اور" اظہار قبول حق" جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے، اسی قبیل کی دو نظمیں ہیں:-

وارثِ عدل پیمبر عمر ابن الخطاب | ہیچ تھی جن کے لئے منزلتِ تاج و سریر
مجمعِ عام میں لوگوں سے اُنھوں نے یہ کہا | مہر باندھو نہ زیادہ کہ ہے یہ بھی تبذیر
جس قدر تم کو ہو مقدور وہیں تک باندھو | حکم یہ عام ہے سب کو اُمرا ہوں کہ فقیر
ایک بُڑھیا نے وہیں ٹوک کے فوراً یہ کہا | تجھ کو کیا حق ہے جو تو کرتا ہے ایسی تقریر
صاف قرآن میں قنطار کا لفظ آیا ہے | تجھ کو کیا حق ہے کہ اس لفظ کی کر دے تغییر؟
لاکھ تک بھی ہو تو کہہ سکتے ہیں اسکو قنطار | تھا یہ اک وزن کہ اس وزن کی یہ ہے تعبیر

سرنگوں ہو کے کہا حضرتِ فاروق نے آہ!
میں نہ تھا اس سے جو واقف تو یہ میری تقصیر"

ہجرتِ نبوی صلعم، تعمیر مسجد نبوی صلعم، ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی، اور رسول اللہ صلعم کا حلم اور عفو خلافتِ فاروقی کا ایک واقعہ، جرأت صداقت، نظام حکومت اسلام، ہمارا طرز حکومت، عدل جہانگیری اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف وغیرہ وغیرہ اسی سلسلہ کی دوسری نظمیں ہیں۔

سیاسی نظمیں مولانا کا سیاسی مسلک وہی تھا جو آجکل دارالعلوم ندوہ کا ہے۔ مولانا ہی ایک کیا اس

زمانے کے ہر مسلمان کا یہی مسلک تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ اسلامی دنیا پر نئے نئے عذاب اور مظالم نازل ہو رہے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام اور الحاق کے سلسلہ میں گورنمنٹ اور مسلمانوں میں اختلاف۔ مسجد کانپور کا واقعہ تقسیم بنگال کی تنسیخ، طرابلس اور بلقان کی لڑائی اور مسلم لیگ کے واقعات ایسے تھے جن سے ہندی مسلمانوں میں ایک آگ سی لگ گئی اور انگریزوں کے خلاف نفرت حقارت کے جذبات ابھر آئے۔

مولانا کی اس زمانے کی نظمیں اکثر پریس ایکٹ کے ماتحت ضبط کر لی گئیں۔ اسی لئے وہ منظر عام پر نہیں ہیں۔ یہ نظمیں اخبار زمیندار لاہور، ہمدرد لکھنؤ، مسلم گزٹ لکھنؤ اور الہلال کلکتہ میں جو مولانا ابوالکلام کا ہفتہ وار اخبار تھا "کشاف" اور "وصاف" کے نام سے چھپتی تھیں۔ لیکن اکثر نظمیں الہلال کلکتہ ہی میں چھپیں کیونکہ مولانا شبلی اور مولانا آزاد میں پورا اتفاق رائے تھا۔

جنگ بلقان ان نظموں میں سب سے مشہور وہ نظم ہے جو رفاہ عام لکھنؤ کے جلسے میں پڑھی گئی جو مجروحین جنگ کی امداد کے لئے چندہ فراہم کرنے کی غرض سے ہوا تھا۔ یہ نظم "شہر آشوب اسلام" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نظم ۱۱۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کے اخبار زمیندار لاہور میں چھپی۔ پڑھتے وقت حاضرین پر یہ اثر تھا کہ ہر شخص رو رہا تھا اور محفل مجلس عزا کا سماں پیش کرتی تھی۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم جنگ بلقان میں ایک طبی وفد ترکی لے کر گئے تھے، اس کی واپسی پر بھی مولانا نے ایک نہایت پرزور نظم لکھی تھی۔

واقعۂ مسجد کانپور مسجد کانپور کے فساد کے سلسلے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک برقی لہر دوڑ گئی تھی اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا، چنانچہ مولانا نے بھی اس کے متعلق متعدد نظمیں لکھیں، جن میں سے صرف دو کے تھوڑے تھوڑے اقتباس پیش کئے جاتے ہیں:۔

پنھائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں	یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ تیغِ آزادی	تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے
عجب کیا ہے جو نو خیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں	کہ بچے ہیں سویرے انکو سو جانے کی عادت ہے
شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں	کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

دوسری نظم کا ہر شعر اثر کرنے والا ہے، ملاحظہ کیجئے:۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے	دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر	بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر	نیند آ گئی ہے منتظر نفخ صور ہیں

کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب | ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اُٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ | محرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینوں پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار | ازبسکہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں
کچھ پیرِ کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا | جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

مسلم لیگ مسلم لیگ نے جو اہمیت آج حاصل کر لی ہے وہ ہمیشہ ہی سے موجود نہ تھی بلکہ پہلے اس کا کام صرف یہ تھا کہ سال میں ایک اجلاس کر لیا جائے اور بس، مولانا اسکو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں | محسنِ قوم بھی ہے خادمِ حکام بھی ہے
ربط ہے اسکو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی | جس طرح "صرف" میں اک قاعدہ ادغام بھی ہے
اسکے آفس میں بھی ہر طرح کا ساماں ہے درست | ورقِ سادہ بھی ہے، کلکِ خوش اندام بھی ہے
ہیں قرینے سے سجائی ہوئی میزیں ہر سو | جابجا دفترِ پارینۂ احکام بھی ہے
چند بی۔اے ہیں سند یافتۂ علم و عمل | کچھ اسسٹنٹ ہیں کچھ حلقۂ خدام بھی ہے
ہو جو تعطیل میں تفریح سیاحت مقصود | سفرِ درجۂ اول کے لئے دام بھی ہے
یہ تو کچھ ہے، مگر ایک گزارش ہے حضور | گرچہ یہ سوءِ ادب بھی ہے اور ایرام بھی ہے

مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے؟

ایک دوسری نظم میں مولانا مسلم لیگ کو بتاتے ہیں کہ کون سے کام ایسے ہیں جو اُنھیں کرنا چاہئیں:-

آپ لبرل جو نہیں ہیں تو بلا سے نہ سہی | یاں کسی کو طلبِ افسر و اورنگ نہیں
کام کرنے کے بہت سے ہیں جو کرنا چاہے | اب بھی یہ دائرۂ سعی و عمل تنگ نہیں
سال میں یہ جو تماشا سا ہوا کرتا ہے | کام کرنے کے یہ انداز نہیں ڈھنگ نہیں
کچھ تو نظم و نسقِ ملک میں بھی دیجئے دخل | شیوۂ حق طلبی ہے، یہ کوئی جنگ نہیں
کچھ نہ کچھ نظمِ حکومت میں ہے اصلاح ضرور | ہم نہ مانیں گے کہ اس آئینہ میں زنگ نہیں

کم سے کم حاکمِ اضلاع تو ہوں اہلِ وطن!
کیا ہزاروں میں کوئی صاحبِ فرہنگ نہیں

جب سلف گورنمنٹ کا معاملہ درپیش تھا تو اس میں مسلم لیگ نے سوٹ ایبل کی ایک شرط لگا دی تھی، اس کا جو مقصد تھا واضح ہے۔ مولانا نے اس کے خلاف اپنی مختلف نظموں میں صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ ان کی مختلف نظموں سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:-

سمجھے نہ یہ کہ "سوٹ ایبل" کی جو شرط ہے / تمہیدِ سجدہ ہائے جبینِ نیاز ہے
سمجھے نہ لوگ یہ کہ یہی لفظِ پُرفریب / اِس ملک میں طلسمِ غلامی کا راز ہے
سب یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب لیگ و کانگریس / دونوں کا ایک عرصہ گہِ ترک و تاز ہے

ایک دوسری نظم میں فرماتے ہیں:-

اِک ذرا سی مگر اس لفظ میں تخصیص بھی ہے / جس سے ہیں متفق اللفظ سب اربابِ نظر
یعنی وہ سلف گورنمنٹ کہ ہو "سوٹ ایبل" / یا کہ موزون و مناسب ہو بالفاظِ دگر
یہ مسلّم کہ ہر اک ملک کی حالت ہے جدا / جس کا آئینِ حکومت یہ بھی پڑتا ہے اثر
جو حکومت کہ کناڈا کے لئے موزوں ہے / ہے وہی مملکتِ ہند میں سرمایۂ شر
ملک میں ہم بھی ہیں، ہندو بھی ہیں عیسائی بھی / جو کہ ہیں نخلِ حکومت کے لئے برگ و ثمر
واقعی قید "مناسب" ہے بجا اور موزوں / آپ اس قید کو کس کام میں لائیں گے مگر؟
پہلے بھی آپ تو اس حصن میں لیتے تھے پناہ / پہلے بھی آپ اِسی دشت میں تھے راہ سپر
جب کبھی کوئی بھی تحریک سیاسی ہوگی / آپ اس قید "مناسب" کو بنائیں گے سپر
اب بھی ہیں جادۂ مقصد کے وہی نقشِ قدم / اب بھی اوراقِ سیاست کا وہی ہے مسطر
یہ وہی لفظ ہے مجموعۂ صد گونہ فریب / یہ وہی لفظ ہے سرمایۂ صد گونہ ضرر
آپ ہر بار جو بڑھ بڑھ کے پلٹ آتے ہیں / ہے اِسی شیوۂ تعلیمِ غلامی کا اثر
آپ کے فلسفۂ نو کے یہ الفاظِ جدید / گو بظاہر ہیں فریبندۂ اربابِ بصر
ہے حقیقت میں اسی متنِ غلامی کی یہ شرح / ہے حقیقت میں اِسی نخلِ سیاست کا ثمر
چند جملے جو زبانوں پہ چلے آتے ہیں / آپ دُہراتے ہیں ہر بار باندازِ دگر
ایک ان میں سے ہے یہ بھی کہ "ابھی وقت نہیں" / ہے اسی لفظ کی تشریح باندازِ دگر
آج یہ لفظ "مناسب" جو نیا وضع ہوا / آپ اس لفظ کو ہر بار بنائیں گے سپر
آپ کے دائرۂ بحث کا مرکز تھا یہی / آپ کی گردشِ پیہم کا یہی تھا محور
آپ اس دام سے برسوں بھی نہ چھوٹیں گے کبھی / آپ اس کوچۂ پُرخم سے نہ ہوں گے سر بر

آپ اس بھول بھلیاں سے نہ نکلیں گے کبھی — دل سے جائے گا نہ تعلیم غلامی کا اثر
جب کہیں بھی کوئی پہلوئے غلامی ہوگا — ہر طرف پھر کے اسی نقطہ پہ ٹھہرے گی نظر
اس قدر سرد مزاج اور پھر اس پر تبرید — خوف یہ ہے کہ پہونچ جائے نہ فالج کا اثر

آپ کچھ گرم دوائیں جو گوارا فرمائیں
ہم دعاگو یہ سمجھتے ہیں کہ ہوگا بہتر

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ تحریک علی گڈھ میں حالی۔ محسن الملک، وقار الملک، اور نذیر احمد وغیرہ کی طرح مولانا شبلی بھی سر سید مرحوم کے رفیق کار تھے۔ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کو جب یونیورسٹی کا درجہ دینے کا قضیہ پیش ہوا تو اس سلسلہ میں چند باتوں میں مسلمانوں اور گورنمنٹ میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ کالج کا نام مسلم یونیورسٹی رکھا جائے اور ہندوستان کے تمام مسلم کالج اور اسکول وغیرہ اس سے ملحق کر دیئے جائیں۔ گورنمنٹ الحاق کرنا نہیں چاہتی تھی، اور کالج کا نام علیگڈھ یونیورسٹی رکھنا چاہتی تھی۔ اس سلسلہ میں مولانا نے خوب خوب نظمیں لکھیں اور ان میں مسلمانوں کے خیالات کا اظہار کیا۔ مولانا نے اپنی ایک نظم مسلم یونیورسٹی میں یہ بتا کر کہ لفظ مسلم سے گورنمنٹ کو احتمال بیجا ہو گیا ہے آگے الحاق کے مسئلہ پر لکھتے ہیں کہ:۔

الحاق سے کچھ اور نہ تھا مدعائے خاص — بس اک عموم درس وفا کا خیال ہے
یعنی کہ پھیل کر یہ زمانے کو گھیر لے — اب تک جو مختصر یہ علی گڈھ کا جال ہے
یہ پالسی ہے شاہراہ عام قوم کی — اس سے کوئی الگ ہے تو وہ خال خال ہے
پھر بھی حضور کی نہ گئیں سرگرانیاں — پھر بھی گناہگار مرا بال بال ہے
اتنی سی آرزو بھی پذیرا نہ ہو سکی — اب کیا کہیں کہ اور بھی کچھ عرض حال ہے

آخر میں الحاق کے معاملہ میں گورنمنٹ نے قطعی طور سے انکار کر دیا اور کسی صورت سے راضی نہ ہوئی۔ مگر اس ساری جد وجہد کا وہی حشر ہوا جو مسلمانوں کی تقریباً ہر تحریک کا ہوتا ہے کہ تقریریں بڑی دھواں دھار ہوتی ہیں اور جب عمل کا وقت آتا ہے تو صفر۔ مولانا نے اس کا ذکر اپنی ایک نظم "یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ" میں کیا ہے جو ۲۸۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کو لکھی گئی۔ اجلاس میں مسلمانوں کے جوش وخروش کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

اصرار کر رہے ہیں نہ مانیں گے ہم کبھی — ویٹو کا وائسرائے کو کیا اختیار ہے
الحاق اگر نہیں ہے تو یہ سعی ہے عبث — مسلم کا لفظ خاص ہمارا شعار ہے

جو والیانِ ملک کہ تھے زیبِ انجمن — سب دم بخود سے تھے کہ یہ کیا خلفشار ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں — نے وہ خروش و جوش نہ وہ گیر و دار ہے
ڈھیلی ہوئی صفیں ہیں علم سرنگوں ہیں سب — بازوئے تیغ گیر جو تھا رعشہ دار ہے
"سازش" کا ایک جال بچھایا ہے ہر طرف — ہر شخص اس کی فکر میں مصروفِ کار ہے
سرمستیاں ہیں دُور قدح ہائے دراز کی — ہر شخص "حکمتِ عملی" کا شکار ہے
جو بات کل تلک سببِ ننگ و عار تھی — وہ آج مایۂ شرف و افتخار ہے
جس بات پر کہ نعرۂ نفریں بلند تھے — اب وہ قبولِ خاطرِ ہر ذی وقار ہے
کل کہہ چکے ہیں کیا؟ یہ نہیں اب کسی کو یاد — اب نکتہ ہائے زیر لبی پر مدار ہے
خود آپ اپنے ہاتھ سے کھائی ہے گو شکست — کہتے ہیں پھر یہ فتحِ مبیں یادگار ہے
حیران تھے عوام کہ کیا ماجرا ہے یہ — یہ کیا دورنگیِ چمنِ روزگار ہے

احرار کا طریقِ عمل ہے اگر یہی
پھر کامیابیوں کا عبث انتظار ہے

یہاں یہ ذکر کر دینا شاید بیجا نہ ہوگا کہ احرار ان کو کہتے تھے جو ترقی کرنا چاہتے تھے اور ترقی پسند تھے

اصلاحی نظمیں

مولانا شبلی درحقیقت سچے مسلمان تھے اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان پستی سے اُبھریں۔ چنانچہ اسی مقصد کو اپنے سامنے رکھکر اُنھوں نے مختلف نظمیں لکھیں۔ اپنی ایک نظم "اسلام کے تنزل کا اصلی سبب" میں یہ بتا کر کہ گو تمام دنیا کے مسلمان ایک سے نہیں ہیں پھر بھی تنزلی کے معاملہ میں یکساں ہیں اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ:-

بحثِ ما فیہ میں پہلی غلطی یہ ہے کہ آپ — جس کو اسلام سمجھتے ہیں وہ اسلام نہیں
آپ کھانے کو بنا دیتے ہیں پہلے مسموم — پھر یہ کہتے ہیں غذا موجبِ اسقام نہیں
اعتقادات میں ہے سب سے مقدم توحید — آپ اس وصف کو ڈھونڈھیں تو کہیں عام نہیں
کون ہے شائبۂ شرک سے خالی اس وقت — کون ہے جس پہ فریبِ ہوسِ خام نہیں
آستانوں کی زیارت کے لئے شدِّ رحال — اس میں کیا شان پرستاریِ اصنام نہیں
اب عمل پر جو نظر کیجئے آئے گا نظر — کہ کسی ملک میں پابندیِ احکام نہیں
اغنیاء کی ہے یہ حالت کہ نہیں ہے وہ رئیس — جس کے چہرے پہ فروغِ مے گلفام نہیں
نہ کہیں صدقِ دیانت ہے نہ پابندیِ عہد — دل میں ناصاف زبانوں پہ جو دشنام نہیں

آیتِ فاعتبروا پڑھتے ہیں ہر روز مگر علمار کو خبر گردشِ ایام نہیں
الغرض عام ہے وہ چیز جو بیدینی ہے صاف یہ بات ہے دھوکہ نہیں ابہام نہیں
اِن حقائق کی بنا پر سببِ پستیِ قوم
ترکِ پابندیِ اسلام ہے، اسلام نہیں

ایک دوسری نظم میں بتاتے ہیں کہ ہمارے مولویوں کو اب اس کی بجائے کہ وہ تبلیغ کریں کام یہ رہ گیا ہے کہ کام کرنے والوں کی تکفیر کرتے رہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اِک مولوی صاحب سے کہا میں نے کہ کیا آپ کچھ حالتِ یورپ سے خبردار نہیں ہیں
آمادۂ اسلام ہیں لندن میں ہزاروں ہرچند ابھی مائلِ اظہار نہیں ہیں
تقلید کے پھندوں سے ہوئے جاتے ہیں آزاد وہ لوگ بھی جو داخلِ احرار نہیں ہیں
جو نام سے اسلام کے ہو جاتے تھے برہم ان میں بھی تعصب کے وہ آثار نہیں ہیں
افسوس مگر یہ ہے کہ واعظ نہیں پیدا یا ہیں تو بقول آپ کے دیندار نہیں ہیں
کیا آپ کے زمرہ میں کسی کو نہیں یہ درد کیا آپ بھی اس کے لئے تیار نہیں ہیں
جھلا کے کہا یہ کہ یہ کیا سوءِ ادب ہے کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں
کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر
بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں

مولانا اپنی ایک نظم "دعوتِ عمل" میں جو ۱۸۹۳ء کے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں پڑھی گئی تھی حاضرین کے اوصاف کی تعریف کرنے کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ جو باتیں دوسری قوموں کے لئے علاج کا حکم رکھتی ہیں وہی ہمارے لئے مضر ثابت ہوتی ہیں۔ مگر ان عام خامیوں کے علاوہ بھی ہم میں کچھ اور خامیاں بھی ہیں، ان کے تدارک کے متعلق فرماتے ہیں کہ:۔

یہ جو کچھ سُن چکے ہو قوم کی تم حالتِ ابتر نہ سمجھو یہ کہ ہے اس داستاں کا خاتمہ اس پر
ہماری سب سے بڑھکر بدنصیبی جو ہے وہ یہ ہے کہ بے پروا ہیں وہ بھی قوم کے جو آج ہیں لیڈر
گیا وہ وقت جب تھا بس اسی کا نام ہمدردی کہ دو آنسو بہا لیں قوم کی درماندہ حالت پر
گیا وہ وقت ہم کو ناصحوں کی جب ضرورت تھی فلک نے کر دیا اِک اِک کو آپ اپنا نصیحت گر
گئے وہ دن کہ ہم محتاج تھے عبرت دلانے کے ہمارا حال خود عبرت فزا ہے آج سرتاسر
ضرورت اب ہے گر ہم کو تو بس ہے ان بزرگوں کی کہ جن میں خیر سے کچھ کر دکھانے کے بھی ہیں جوہر

فقط باتیں نہ ہوں کچھ کام بھی بن آئے ہاتھوں سے
کہیں جو کچھ وہ منہ سے کر دکھائیں اس سے کچھ بڑھکر

نہیں گر یہ تو بس اک گرمیِ صحبت کے ساماں ہیں
یہ قومی مرثئیے یہ وعظ یہ اسپیچ یہ لکچر

طلب اور سعی سے کچھ کام بن آئے تو بن آئے
فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلتا نہیں منتر

تمھیں جو کام بن آیا ہیں گو مشکل سے مشکل ہیں
مگر کرنے پہ آجاؤ تو ہیں آساں سے آساں تر

ابھی تک تم میں ہے اسلاف کا کچھ کچھ اثر باقی
شرر گو بجھ چکے پر گرم ہے اب تک وہ خاکستر

ابھی کچھ کچھ مہک باقی ہے اِن مرجھائے پھولوں میں
ابھی کچھ کاٹ ہے اِس تیغ میں گو مٹ چکے جوہر

وہی فیاضیاں تم میں ہیں جو تھیں معن و حاتم میں
مگر بیہودہ رسموں کے لئے وہ وقف ہیں یکسر

کچھ اس سے کم ہوا تھا صرف تجہیز اسامہ میں
اُٹھا دیتے ہو تقریبوں میں جتنا تم زر و زیور

فقط آپس کے جھگڑوں میں تم اس سے کام لیتے ہو
وہ جودت اور ذہانت جس میں اب بھی تم ہو نام آور

سنبھلنا اب بھی گر چاہو تو ہے وقت اور فرصت بھی
وگرنہ پھر نہیں رہنے کی جو کچھ ہے یہ حالت بھی

مختصراً یہ کہ مولانا نے اپنے اُردو کلام سے اصلاح قوم کا بڑا کام کیا اور اپنے لئے اُردو شاعری میں بھی ایک جگہ پیدا کرلی۔

دُعا

(برائے اطفال)

(از مسٹر مدھولال ٹیگور)

عطا کر علم وہ مجھکو کہ جس کی تابناکی سے
جہالت، ظلمت و وحشت جہاں سے دُور ہو جائے

بنا اِس چرخِ عالم کا مجھے وہ ضَو فشاں اختر
کہ جس کی اِک جھلک ظلمت کدوں کا نور ہو جائے

بنوں میں اُمن کا داعی، اخوت کی وہ دُھن چھیڑوں
دلوں کی ساری دنیا درد سے معمور ہو جائے

مرا ہر حرف ہو اِک تازیانہ پشتِ غفلت کو
مرا ہر لفظ عالم کو صدائے صُور ہو جائے

ہو مجھ سے اس جہاں میں وہ نظامِ زندگی قائم
کہ جو دل مضمحل ہو کیف سے مسرور ہو جائے

ترے دربار میں یارب، مرے آقا، مرے مولے
ہے یہ ہردم دعا میری، اگر منظور ہو جائے۔

سرد ہوا

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم۔ اے)

چوٹیوں سے کوہ کی ٹھنڈی ہوا بہتی ہوئی
آئی اور یوں آئی اپنی داستاں کہتی ہوئی

کوہساروں سے چلی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی
موتیوں سے ابر کے دامن کو وہ بھرتی ہوئی

ہر قدم پر ناز کرتی اور اٹھلاتی ہوئی
جس طرح کوئی دلہن آتی ہے شرماتی ہوئی

بیخودی کی چال چلتی مست ہو کر جھومتی
ڈالیوں پر مسکراتی پتیوں کو چومتی

آئی گردوں کے ستاروں سے ضیا لیتی ہوئی
باغ سے گزری تو کلیوں سے حیا لیتی ہوئی

تیرتی آئی فضاؤں میں وہ لہراتی ہوئی
ساز قدرت کا بجاتی اور کچھ گاتی ہوئی

کشت زاروں میں گزر اسکا گلستانوں میں ہے
جنگلوں میں وادیوں میں اور میدانوں میں ہے

بیکسی کا دوش پر ساماں لئے وہ آگئی
دم کے دم میں ہر طرف عالم پہ آکر چھا گئی

ڈھونڈتی پھرتی رہی مجھکو شب خاموش میں
اور پھر چپکے سے آبیٹھی مری آغوش میں

کھڑکھڑاتا پتہ

(از جناب راجہ مہدی علیخاں)

سرسراتی ہوئی آئی چمنستاں میں ہوا
آہ سوکھے ہوئے پتے تری غمناک صدا

بین کرنے لگیں مسرور ہوائیں افسوس
دم بخود ہوگئیں پر کیف فضائیں افسوس

فاختہ کے دل افسردہ میں اک ہوک اٹھی
پھول مرجھا گیا کمھلا گئی معصوم کلی

تیتری روتی ہوئی صحن گلستاں سے گئی
پُر الم راگ سنانے لگی محزوں ندی

آہ سوکھے ہوئے پتے تری غمناک صدا

اُردو ہندی ہندوستانی

(از "حق پسند")

"زمانہ" میں کچھ عرصہ سے پھر زبان سے متعلق مضامین کی گرم بازاری ہے۔ اس دَور کی ابتدا مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے مضمون "صحتِ الفاظ" سے ہوئی۔ اس مضمون کا مدعا یہ تھا کہ صحتِ الفاظ کی آڑ میں بھی آپس کی کشمکش بڑھ رہی ہے۔ ہندوؤں کو شکایت ہے کہ اُردو میں ایک طرف خالص عربی فارسی الفاظ کو اُن کی اصلی ترکیبوں کے ساتھ ٹھونسا جا رہا ہے اور دوسری طرف ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی صورت بگاڑی جا رہی ہے۔ اگر عربی فارسی الفاظ کو صحت کے شکنجہ سے ہٹایا جائے اور ہندوستانی ماحول کے موافق بنا کر اُن کے سمجھنے اور سیکھنے میں سہولت پیدا کی جائے۔ اور ہندی اور سنسکرت الفاظ کو بگاڑنے کی کوشش نہ کی جائے۔ تو ایسی زبان مشترکہ زبان بن سکتی ہے۔ غرض ایک مشترکہ ہندوستانی زبان کی فکر اس مضمون کی محرک تھی، اور محترم مرزا صاحب نے اس پیچیدہ مسئلہ کی گرہ کشائی کے لئے خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی اور اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے مبصرین سے اپیل بھی کی تھی

چنانچہ "زمانہ" بابت مارچ ۱۹۴۱ء میں خان بہادر ممدوح، منشی شیام موہن لال صاحب جگر بریلوی، سید محمد اظہار الحسن صاحب بی۔اے، ایل ایل۔بی، اور مسٹر "ح۔ق" اور "زمانہ" بابت اپریل ۱۹۴۱ء میں نواب محمود علی خاں صاحب نے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

میرا خیال سب سے زیادہ جناب سید محمد اظہار الحسن صاحب سے ملتا ہے۔ جن کے مضمون کو میں نے بہت زیادہ پسند کیا ہے، اس لئے بھی کہ دوسروں پر کسی قسم کے چھینٹے اُڑانے کے بغیر ممدوح نے حقیقتوں کا نہایت خوبی اور جامعیت سے اظہار کیا ہے۔ دوسرے خان بہادر جناب اثر لکھنوی، ان ہر دو بزرگوں نے صاف صاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعادہ فرمایا ہے کہ ہندی اور اُردو دو مستقل اور علٰحدہ علٰحدہ زبانیں ہیں اور بہی خواہانِ قوم کو چاہیئے کہ ان دونوں کو سیکھیں اور دونوں کی ترقی میں کوشاں رہیں۔ ہندوستانی بجائے خود کوئی علٰحدہ زبان نہیں ہے، اور ہندی اُردو کو ملا کر ہندوستانی بنانے کی کوشش بے سود ہے۔ جناب اظہار الحسن صاحب کے الفاظ میں "ہندی اور اُردو ملکر ہندوستانی تو کیا بنے گی، ہاں اُردو اور ہندی دونوں کی مٹی پلید ہو جائے گی"..... ہندوستانی

کے سایہ کے پیچھے دوڑنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں کو اپنی اپنی جگہ ترقی کرنے کا موقعہ دیا جائے۔" "اُردو۔ہندی۔ہندوستانی" سے متعلق کام کی باتیں صرف اتنی ہیں بقیہ چیزیں فروعی اور صرف اُردو سے متعلق ہیں۔

لیکن اس قطعی، صاف صریح اور واضح رائے کے بعد اپریل کی اشاعت میں نواب محمود علی خاں صاحب کا مضمون اسی عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جس میں وہی اُردو کے مشترکہ زبان ہونے کا دعویٰ پیش کیا گیا ہے۔ جس کے ثبوت میں سر تیج بہادر کی مشہور رائے پیش کی گئی ہے کہ اُردو ہندو اور مسلمانوں کا مشترکہ اور ناقابل تقسیم ترکہ ہے۔ اس مضمون میں نواب صاحب نے اُردو کو لشکری زبان بتلایا ہے ہندو ادیبوں سے شکایت کی ہے کہ اُردو میں اگر ہندو تہذیب و تمدن کی نمایندگی نہیں ہے تو خود وہ بھی ذمہ دار ہیں کہ اس طرف توجہ نہیں کی۔ انھوں نے "ہندوستان کے سچے بہی خواہ" اور منصف مزاج ہندو صاحبان سے یہ اپیل بھی کی ہے کہ چونکہ ان کے بزرگوں نے صدہا برس کی محنت سے اس زبان کو یعنی اُردو کو سرسبز و شاداب کیا ہے اور اپنے جواہر افکار سے اس کے خزانہ کو مالامال کیا ہے، اس لئے وہ اسے اُن ہندو صاحبان کے ہاتھوں سے تباہ و برباد ہونے سے بچائیں جو وقتی جذبات سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ وغیرہ۔

اس کو پڑھتے ہی مجھکو مکرمی جگر بریلوی کی اس کتاب کا خیال آیا جو انھوں نے حال میں تصنیف فرمائی ہے (ابھی یہ تصنیف شائع نہیں ہوئی ہے) جس میں اُردو کی اصلیت سے بحث کی ہے، ہندوؤں نے اُردو کی ترقی میں جو بیش بہا خدمتیں کی ہیں اُن کا تفصیلی تذکرہ دیا ہے، اور بہت سی کام کی باتیں لکھی ہیں۔ یہ کتاب اگر کسی طرح "زمانہ" میں بہ اقساط شائع ہو جائے تو اُردو کی لشکری زبان ہونے کی حقیقت ظاہر ہو جائے، اور یہ حقیقت بھی روشنی میں آجائے کہ ہندوؤں نے کس طرح اپنی مذہبی کتابوں کو اُردو میں منتقل کر کے اپنی تہذیب و تمدن کی نمایندگی کی کوششیں کیں لیکن وہ سب دبا دی گئیں۔ اور اُردو میں ہندی کے جو کچھ الفاظ پھر بھی رہ گئے، اُن کو کس طرح رفتہ رفتہ غیر فصیح ہونے کے الزام سے خارج کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ اب اُردو صرف وہ چیز رہ گئی ہے جس میں محض مسلم تہذیب و تمدن کی نمایندگی ہے اور اُس کا مزاج ایسا قائم ہو گیا ہے کہ اُس میں یہ گنجایش باقی نہیں رہی کہ اُس میں ایسے الفاظ اور اصطلاحات کی کھپت ہو سکے۔ جس سے وہ کسی اور خصوصاً ہندو تہذیب و تمدن کی نمایندگی کر سکے۔ جگر صاحب نے بڑی دماغ پاشی اور جگر کاوی سے مواد فراہم کیا اور اُس کو اپنی خوبصورت زبان میں پیش کیا ہے۔ اُردو سے دلچسپی رکھنے والے ہر مکتبِ خیال کے

بزرگوں کے لئے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یہ کتاب بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی۔

خیر! اب میں نواب صاحب کی اپیل کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے دل پر بھی اس کا گہرا اثر ہوا ہے اس لئے کہ ممدوح کا لب و لہجہ دلی خلوص اور سچی لگن کا مظہر ہے اور ایسے مضامین ہر لکھنے والوں کے لئے قابل اتباع ہیں، اس لئے کہ اس سے غیر ضروری تلخیاں نہیں بڑھتیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ ممدوح اپنے جذبات کی رَو میں ایک ذہنی مغالطہ کا شکار ہو گئے ہیں۔ جس کی وضاحت ایک گفتگو کے خلاصہ سے بخوبی ہوگی جو میرے ایک مسلمان دوست سے اسی مضمون پر ہوئی تھی۔ میرے دوست نے ارشاد فرمایا تھا کہ دیکھئے صاحب جھگڑا سیاسیات سے بڑھتا بڑھتا کہاں تک آپہونچا، اب زبان کے معاملہ کو بھی ایک دنگل بنا دیا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ دنگل کس نے بنایا تو فرمایا "یہی ہندو مسلمانوں نے" تالی دونوں ہی ہاتھوں سے بجتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بھائی جان! تالی کے دونوں ہاتھوں سے بجنے کی بات موقع بے موقع خواہ مخواہ چسپاں کی جاتی ہے۔ یوں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک ہاتھ اگر مفلوج بھی ہے تو دوسرا ہاتھ اُس پر ضرب لگا لگا کر آواز پیدا کر سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسرا ہاتھ بھی اس تالی کے بجانے میں عملی تعاون کرے۔ یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ آیا ہندو اس بات پر بضد اور مُصر ہیں کہ مسلمانوں کو اُردو چھوڑنی اور ہندی پڑھنی پڑے گی، فرمایا یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے برخلاف صورت واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں پر یہ متواتر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ ہندی سے قطع تعلق کریں اور اُردو کو اختیار کریں۔ اگر کہیں اُنھیں حکومت حاصل ہے تو حکومت کے زور سے اُردو اُن پر لازمی قرار دی جاتی ہے اور حکومتی رعب، قاعدہ قانون وغیرہ وغیرہ کے ایسے ایسے شکنجے کسے جاتے ہیں کہ پہلے تو کوئی دم مارنے کی جرأت ہی نہیں کرتا اور کسی نے اگر ذرا چون وچرا کی کہ اُس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ یا اگر کسی جگہ ہندو قدرے منظم حالت میں ہیں اور تنظیم کے ساتھ احتجاج کرتے ہیں جیسا کہ پنجاب میں تو میٹھی میٹھی باتیں بنا کر معاملہ کو التوا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاں حکومت حاصل نہیں ہے وہاں ہندی کے خلاف اور اُردو کی تائید میں اپیلیں کی جاتی ہیں، یعنی یہ کہ ہندو اُردو کو اختیار کریں اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب ہماری مادری ورنہ قومی زبان تو ہندی ہے، ہم اُردو اختیار نہیں کر سکتے تو ہر طرف سے شور بپا کیا جاتا ہے کہ دیکھئے ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ اندازی کی جا رہی ہے اور اُردو کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ہندو حیران ہیں کہ ہمارے اُردو کو اختیار کرنے ہی سے اُردو

کیسے تباہ و برباد ہو جائیگی؟ کیا سوداؔ، میرؔ، انیسؔ، آتشؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، غالبؔ، داغؔ، حالیؔ، اقبالؔ وغیرہ نے شاعری محض اس لئے کی کہ ہندو اس کو پڑھتے ہیں یا پڑھیں گے (یا اُنھوں نے ہندوؤں کے نام پر ناک بھوں سکوڑے تھے کہ ان کو اس کے سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ ہی کہاں ؟) آیا ان شاعروں کا کلام ہندوؤں کے لئے کوئی خاص پیغام زندگی رکھتا ہے، جیسا مسلمانوں کے لئے ہے؟ یا جیسا سورداس۔ تلسی۔ کبیر میرا، رحیم وغیرہ ہندی کے شعرا کے کلام میں ہندوؤں کے لئے موجود ہے۔ پھر یہ شور و غل کس بنیاد پر ہے کہ ہندو اردو کی طرف رجوع نہیں ہوتے تو اُردو کو تباہ و برباد کرنا مقصود ہے یہ تو خواہ مخواہ گلے پڑ کے کوسنے کی بات ہے"۔ میرے دوست خاموش ہو گئے، ممکن ہے مروّت سے، لیکن مَیں نواب صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ بنظر انصاف اس پہلو پر غور فرمائیں کہ آیا ہندو ہندی کو مسلمانوں پر ٹھونسنا چاہتے ہیں یا مسلمان حضرات مختلف طریقوں سے کوشش کر رہے ہیں کہ ہندو ہندی سے روگرداں ہو جائیں اور اُردو کی طرف رجوع ہوں۔

نواب صاحب ممدوح نے ایک بات اور فرمائی ہے کہ "مشترکہ زبان کے مسئلے کو طے کر کے کسی خاص زبان کے حق میں فیصلہ کیا جا کر اُس کے ہندوستان کے طول و عرض میں اشاعت کی اگر کوشش نہ کی جائے تو یقیناً یہاں کے کاروبار سیاست، تہذیب اور شائستگی میں بجائے ہم آہنگی کے مشکلات اور اختلافات کا اضافہ ہوتا جائیگا، جو بات ملک کے سچے بہی خواہوں کے لئے ناقابل برداشت بن جائیگی"۔ نواب صاحب اُردو کو ایسی مشترکہ زبان خیال فرماتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت نواب صاحب ممدوح کے پیش نظر غالباً صرف یو۔ پی اور پنجاب تھا، اور مدراس، بمبئی، گجرات، بنگال وغیرہ صوبہ جات نظرانداز ہو گئے تھے۔ یہ غلطی مسلمان بھائیوں سے عام طور پر ہوتی ہے۔ میں نے اپنے مضمون "ہندوستان کے لئے ایک عام زبان کا مسئلہ" میں جو "زمانہ" جون ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا، اس غلطی کی جانب اشارہ کر کے اس مضمون میں بتلایا تھا کہ ایک زمانہ تھا جب صرف یو۔پی کا خطہ ہندوستان کہلاتا تھا اور اسی نسبت سے آج تک یو۔پی کا باشندہ دوسرے صوبوں میں ہندوستانی کہلاتا ہے اور اُس کی زبان ہندوستانی۔ اور چونکہ اسلامی دورِ حکومت میں (دہلی کے بعد لکھنؤ) یو۔پی میں اُردو کا زور تھا لہذا "ہندوستانی" سے مراد "اُردو" لی جانے لگی۔ اب زمانہ اور ہے، اب "ہندوستان" کل ہند کو کہتے ہیں اور ایک عام زبان جو قوم پرست لوگ چاہتے ہیں وہ کُل ہند کے لئے چاہتے ہیں۔ صرف

یو۔پی، اور پنجاب کے لئے نہیں۔ لہذا دیکھنا یہ چاہیئے کہ جو زبان کل ہند میں یعنی سارے ہندوستان میں سمجھی جا سکے گی وہ کیسی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ وہ زبان زیادہ آسان ہوگی جس میں مختلف صوبوں کی زبانوں کے الفاظ زیادہ ملتے ہوں۔ میں نے اُس مضمون میں چند اُردو جملوں کا تلگو، کنٹری مرہٹی، گجراتی اور بنگالی میں ترجمہ دے کر یہ واضح کیا تھا کہ جو الفاظ اِن سب زبانوں میں عام ہیں وہ سنسکرت الفاظ ہیں لہذا وہ زبان کل ہند میں چالو ہو سکے گی۔ جس میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہو اور سنسکرت الفاظ بھی اپنی شُدھ حالت میں کیونکہ اِن صوبائی زبانوں میں سنسکرت الفاظ اپنی شُدھ شکل میں استعمال کئے جاتے ہیں، توڑ مروڑ کر نہیں مثلاً وہاں ویشیا ہی کہیں گے بیسوا نہیں۔ گرام کہیں گے گاؤں نہیں۔ اس لئے اب نئی اصطلاح میں ہندوستانی اگر کوئی زبان کہلا سکتی ہے تو وہ زبان ہوگی جس میں سنسکرت کے خالص الفاظ کی کثرت ہو جو یو۔پی اور پنجاب کے مسلمانوں کو چھوڑ کر بقیہ ہندوستان میں ہر جگہ آسانی سے سمجھی جا سکے گی۔ اِسی لئے جب ہندوستانی زبان کی وضاحت کی ضرورت داعی ہوئی تو مہاتما گاندھی جی کو یہ کہنا پڑا کہ ہندوستانی سے مراد ہندی ہندوستانی ہے۔ یہ تعریف فرقہ پرستی پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ٹھوس واقعات پر جن پر صرف ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ جھگڑا ہی کیوں ہے، اُردو والے اُردو میں کوشاں ہیں ہندی والے ہندی کی ترقی کریں، اگر کوئی عام زبان پیدا ہوتی ہے تو آپ ہی آپ ہو جائیگی۔ اس جذبات انگیزی اور سر پھٹول سے اُس عام زبان کے راستہ میں روڑے پیدا ہو رہے ہیں۔

تسبیح خیال[1]

یہ چھوٹی سی کتاب نواب شہید یار جنگ حیدر آبادی کی تقریباً دو سو رباعیوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے جس میں حسن و عشق، علم و حکمت، اخلاق و ادب غرض ہر موضوع پر رباعیاں موجود ہیں۔ زبان بھی اچھی ہے۔ مجموعہ کے شروع میں فاضل مصنف نے ناظرین کو اپنی شخصیت اور اپنی شاعری سے روشناس کرایا ہے اور اسکے بعد سید ذاکر حسین صاحب کا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے۔ جہانتک رباعیوں کا تعلق ہے ان میں ناظرین کو اخلاقیات کا کافی مسالہ ملے گا۔

[1] ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی۔

حقایق و معارف

نتیجۂ فکر حضرت سرشار کسمنڈوی

معاف اے دوست اب تابِ شکیبائی کہاں مجھکو
پسِ پردہ نظر آتی ہیں کچھ پرچھائیاں مجھکو

سنبھالیں اب تری نیچی نظر کی شوخیاں مجھکو
اُٹھا ہے لیکے اپنے ساتھ دردِ ناگہاں مجھکو

کبھی تو ہوش آئے گا بقدرِ امتحاں مجھکو
پکارے اور پکارے جائے ظالم آسماں مجھکو

اُٹھا لینے دو پروانے کی خاکِ رائیگاں مجھکو
بنانا ہے اسے اپنی نظر کا پاسباں مجھکو

یہاں تک آ گیا ہوں منزلِ مقصود کی دُھن میں
جہاں کچھ مل رہا ہے بے نشانوں کا نشاں مجھکو

سبکسارانِ ساحل فرصتِ نظارہ کیوں پائیں
اُچھالے جا یونہی آدیر اے موجِ رواں مجھکو

محبت اے محبت وہ مبارک وقت آپہونچا
کہیں دیکھے کہیں پائے نگاہِ پاسباں مجھکو

کبھی دل کے دھڑکنے کی بھی آوازیں نہیں آتیں
نگاہِ شوق اپنے ساتھ لے ڈوبی کہاں مجھکو

یہ تھک کر بیٹھنے والوں سے آخر بے رُخی کیسی
بدلنا ہی پڑے گا اب مذاقِ کارواں مجھکو

اُنھیں دیکھا تو پھر خود کو نہ دیکھا بزمِ ہستی میں
نگاہِ شوق کا سودا پڑا کتنا گراں مجھکو

ذرا اے ہم صفیرانِ چمن آنکھیں کھُلی رکھنا
ملی تھیں راہ میں کچھ آندھیاں کچھ بجلیاں مجھکو

معاذ اللہ یہ قیدِ تعیّن کی دل آویزی
کہ جیسے مل گئی ہو عشرتِ کون و مکاں مجھکو

ترے جلووں میں گُم ہونا نشانِ ارجمندی ہے
کسی لذّت کی ہوں منظور ہیں بے ہوشیاں مجھکو

میں اپنی زندگی کا مدعا اب تک نہیں سمجھا
سمجھتے ہوں تو سمجھائیں زمین و آسماں مجھکو

ذرا ہنس دو ابھی ڈوبی ہوئی نبضیں اُبھرتی ہیں
یہیں پر ختم کرنا ہے بہارِ داستاں مجھکو

مری آنکھوں میں کچھ رنگین آنسو دیکھنے والے
وفا کی راہ میں درپیش ہیں قربانیاں مجھکو

جوانی گدگداتی ہے تو کلیاں مسکراتی ہیں
گراں ہیں فطرتِ معصوم کی رسوائیاں مجھکو

یہی چشمک رہی سرشار اگر صیاد و گلچیں میں
نظر آتا ہے اپنا آشیاں خلد آشیاں مجھکو

---

[1] یہ غزل آئیڈیل کلب لکھنؤ کے لئے لکھی گئی تھی۔

وکیل اور منشی

(از سید علی عباس حسینی، ایم۔ اے)

وکیل صاحب نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے حقہ پیتے ہوئے گلا صاف کر کے کہا:۔
"منشی جی، آج بھی کوئی مؤکل نہیں آیا!"

منشی جی بڑے جہاندیدہ تھے، وہ اکثر سوچا کرتے تھے کہ انھوں نے ان نئے وکیل صاحب کی منشی گری" آخر کی ہی کیوں؟ زندگی سے ناتکہ، ڈاکٹر سے کمپاؤنڈر اور وکیل سے منشی اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتے جب تک کہ اُن کی طرف عام مرجوعہ نہ ہو۔ ان پیشہ وروں میں سے جس کی بھی نہ چلتی ہو اُس کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرنا ایک ڈوبے ہوئے جہاز سے اپنے کو باندھ رکھنا ہے! منشی جی تجربہ کار تھے، وہ اس گر سے واقف تھے لیکن وہ بڑے وکیل صاحب کی وصیت سے مجبور ہو گئے تھے۔ انھوں نے مرتے وقت خاص طور سے تاکید کی تھی "متین میاں کو کام تمہیں سکھانا، اور پیشے کے گر بتاتے رہنا" آخر زندگی بھر ان کا نمک کھایا، کچھ تو خیال کرنا ہی چاہیئے تھا۔ سچ ہے:۔

وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے!

اور منشی جی کو اس کا یقین تھا کہ وہ بڑے ایماندار ہیں، یہ اور بات ہے کہ مہینہ میں دو چار مرتبہ عدالت میں جا کر جھوٹا حلف اُٹھا لیا، یا غلط گواہی دے دی، تو اس سے ایمان کیوں جانے لگا۔ عدالتوں میں کوئی سچ بھی بولتا ہے؟ اور جھوٹی قسم کے ساتھ قرآن کے علاوہ اور کون سی کتاب اُٹھائی جا سکتی ہے، کیا "کنگ ریڈر" یا "توبۃ النصوح"؟ خدا خوب جانتا ہے کہ یہ دروغ بافی پیٹ پالنے کے لئے ہوتی ہے، ایسا نہ کریں تو بھوکوں مریں! ذریعۂ معاش پیدا کرنے کی اسی نے تو تاکید کی ہے، اور اُسی نے تو خودکشی کو ممنوع قرار دیا ہے!

تو پھر آخر منشی جی سے آدمی کیا کریں؟ وہ مزدوری کر نہیں سکتے تھے، اس کے لئے مضبوط ہاتھ پاؤں چاہیئیں، پھر کرتا پائجامہ پہنکر اور دوپلی ٹوپی لگا کر کوئی جھوٹے ڈھوتا ہے؟

باپ دادا ہمیشہ سپید پوش رہے، اس طرح کی محنت کے کام ہمیشہ "چھوٹے طبقے" کے لوگوں کے لئے مخصوص رہے۔ اگر منشی جی بھی ایسے ہی کام کرنے لگتے تو اُن کی خاندانی شرافت خاک میں مل جاتی، اور گویا اپنے ہی ہاتھوں اپنی ناک کاٹ ڈالتے! وہ تجارت کر نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ اس کے لئے سرمایہ چاہیئے اور خون میں "بنیاگری" کے جراثیم، یہ دونوں چیزیں ان کو ورثہ میں نہیں ملی تھیں۔ وہ نوکری کر نہیں سکتے تھے، اس کے لئے اسکول اور کالج کے سرٹیفکٹ چاہیئے تھے اور ان سے ان کی جیبیں خالی تھیں!

پھر سرٹیفکٹ ملنے پر بھی ملازمت کہاں ملتی ہے۔ سیکڑوں بی۔اے۔ ایم۔اے دربدر کی خاک چھانتے پھرتے ہیں، ابھی پرسوں ہی تو اسٹیشن پر وہ نوجوان جوجوتوں پر پالش کرنے آیا تھا کیسی زناٹے کی انگریزی بولتا تھا۔ کہتا تھا انٹرمیجیٹ پاس ہے۔ زرد زرد چہرہ دھنسی دھنسی آنکھیں، پھٹی قمیص میں سے ہڈیوں کا ڈھانچہ جھلکتا ہوا، کتنا غریب پر ترس آتا تھا، ماں باپ نے کن ارمانوں، کن اُمیدوں سے تعلیم دلوائی ہوگی!

پھر آخر رشید اور مجید کی تعلیم پر جو اتنے پیسے اُٹھ رہے ہیں، اُن کا کیا حشر ہوگا؟ انھیں بھی کوئی نوکری ملے گی یا نہیں؛ پیسوں کا الگ کال ہے۔ جب سے متین میاں کا ساتھ ہوا بس وہی سوکھے پندرہ تنخواہ کے رہ گئے، نہ کوئی مؤکل پھنستا ہے نہ کوئی مقدمہ آتا ہے اور نہ محنتانہ ملتا ہے۔ جو کچھ بڑے وکیل صاحب کے زمانہ میں جمع کیا تھا وہ متین میاں کے ساتھ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ مگر اس طرح کب تک بسر ہوگی، آخر منّو اور دلّا ور کو بھی تو پڑھانا ہے اور چھمّو اور چھبّن کی شادیاں بھی تو کرنا ہیں۔ ماشاء اللہ جوان ہوگئی ہیں۔ کب تک ماں کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی رہیں گی۔" اے اللہ تو ہی خوب جانتا ہے کہ جھوٹا حلف اُٹھانے اور غلط گواہی دینے کو میں بھی بہت بُرا سمجھتا ہوں! مگر کروں تو کیا کروں! سچ بول کر کیا چھ چھ بچّوں اور بوڑھی بیوی کو فاقہ کی آگ میں اپنے ہاتھوں سے جھونک دوں۔"

وکیل صاحب نے اپنے سوال کا جواب نہ پاکر پھر پکارا "منشی جی!"

"جی میاں"

"آپ تو داداجان کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں"

"جی ہاں، اُن کی آخر عمر میں مجھے ان کی خدمت کا موقع ملا تھا، بلا کے ذہین تھے۔ میاں "ڈھول کی رسّی" بٹتے تھے ڈھول کی! میں کیا عرض کروں کہ کس غضب کا دماغ پایا تھا۔"

"اُنھوں نے منشی جی زمانہ بھی بہت ہی اچھا پایا تھا"

"کیوں نہیں میاں، کیوں نہیں! اس وقت ہر شہر میں مشکل سے دس پانچ وکیل ہوتے تھے اور اب تو برساتی کیڑے ہیں، برساتی کیڑے! اب ان کی تعداد ہر تحصیل میں اتنی ہے جتنی اجودھیا میں بندروں کی!"

"ہاں منشی جی یہ تو ضرور ہے، لیکن ان میں سے جن کے پاس دماغ ہے وہ چمک ہی اُٹھتے ہیں"

"ہاں میاں یہ تو سچ ہے!"

"تو منشی جی دادا جان کا دماغ تو کچھ نہ کچھ ورثہ میں ملا ہی ہے!"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں میاں!"

"تو زمانہ ویسا آپ بنائیے اور موقع نکالیے! آخر میرا دماغ اور آپ کا تجربہ دونوں بیکار تو نہیں جا سکتے!"

"تو میاں شروع میں تو اپنے ہی پاس سے خرچ کرنا پڑیگا۔"

"یہ کیوں!"

"دوسرے منشیوں سے مؤکل حاصل کرتے ہیں"

"اچھا یوں ہی سہی"

"گوینڈے بھی چھوڑنے پڑیں گے"

"ان کا کیا کام ہے؟"

"جی میاں وہی کام کرتے ہیں، جو اپنے کبوتر دوسرے کے کبوتروں میں ملکر کرتے ہیں مؤکلوں کے سامنے آپ کی تعریف کے پُل باندھ دیں گے اور ان کو بہکا لائیں گے۔"

"اچھا، وہ بھی سہی!"

"ذرا حکام سے افسروں سے بھی میل ملاپ بڑھانا پڑیگی۔"

"اجی آپ جو کچھ کہیں گے وہ سب ہو جائے گا"

"ہاں میاں، یہ سب ایک طرح کا اشتہار ہے!"

"تو پھر اللہ کا نام لے کہ کام شروع کر دیجئے۔"

"بہت اچھا میاں!"

(۲)

"منشی جی! دو سال ہو گئے، کام تو چل نکلا، لیکن ابھی تک مہینہ کا خرچ پورا نہیں اترتا"

منشی جی نے ناک کے بانسے پر رکھی ہوئی عینک کو بھوؤں کے اوپر پیشانی پر اٹکایا، سوچنے لگے دو برس میں کیا کیا جتن کرنے پڑے، کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑے، دوسرے منشیوں کو رشوت گوئندوں کو کمیشن، پولیس والوں کی خاطر مدارات، نہ جانے کتنی چالیں چلنا پڑیں، اور وکیل صاحب ہیں کہ اب بھی مطمئن نہیں، انسان کا پیٹ اس کی آمدنی کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا ہے، اُن کی خود بھی یہی حالت تھی، پہلے سو کھے پندرہ میں گزر بسر ہو ہی جاتی تھی، اب جو ذرا ہاتھ کھُلا، دس پانچ ہر ہفتے دکھائی دینے لگے تو خرچ بھی بڑھ گیا، لیکن ایک بڑا کام ہو گیا، جھمو کی شادی ہو گئی اور کھاتے پیتے لوگوں میں ہو گئی، مگر ابھی چھدن باقی ہے، پھر رشید منور، دلاور اور مجید کی تعلیم، ہر روز نئی کاپیاں، ہر ہفتے نئی کتابیں، ہر مہینے فیسیں! وکیل صاحب بیچارے بھی تو لڑکوں لڑکیوں کو تعلیم دلوا رہے ہیں، ان کے ہاں بھی کیسے اٹھتا ہو گا، کوئی نہ کوئی صورت تو آمدنی بڑھانے کی نکالنا ہی پڑے گی۔ ارے آجکل کی سیاسی فضا سے کیوں نہ فائدہ اُٹھایا جائے! منشی جی ایک بار مسکرا دیے۔ زندگی کے تاش پر لیٹا ہوا تاگا اُلجھ چکا ہی تھا کہ پھر سرا مل گیا!

وکیل صاحب نے کھانس کر اُن کو پھر مخاطب کیا "منشی جی مرجوعہ بڑھانے کی کوئی نئی تدبیر ہونا چاہیئے!

"جی ہاں میاں ہونا تو چاہیئے"

"پھر آپ نے کچھ سوچا؟"

"جی میری رائے میں تو اب کچھ لیڈری کا بھی ڈھونگ رچانا چاہیئے"

"یعنی اب سیاسیات کی ہڑبونگ میں بھی پڑوں"

"جی ہاں میاں، موقع موقع سے ایک آدھ تقریر، اپنی قوم پر جھوٹے سچے الزامات کا بیان!"

"مگر ان میں تو کئی جماعتیں ہیں"

"آپ کو ہر ایک سے کیا مطلب! آپ کو تو اسی جماعت کا ساتھ دینا ہے جس میں سرمایہ دار ہوں"

"یہ کیوں؟"

"جی، جہاں کوئی موٹا اسامی پھنسا، اپنی پانچوں گھی میں ہیں! اور اگر کسی خاندانی آن بان

والے رئیس سے دوستی ہوگئی تو ریاست کے سارے مقدمے اپنے ہی ہاں آنے لگیں گے۔"

"یہ تو منشی جی آپ ٹھیک کہتے ہیں!"

"جی ہاں میاں اور کیا۔ اگر کہیں حق اور ناحق کی بحث میں پڑ کر کنگلوں کی طرف بہک گئے تو اپنے پاس ہی سے رقم خرچ کرنا پڑے گی، اپنی ہی جیب سے!"

(۳)

منشی جی، خرچ بھر کو تو ضرور نکل آتا ہے، مگر بچتا اب بھی کچھ نہیں"

منشی جی نے جیب سے خانہ ساز بٹوا نکالا۔ خاصا وزنی اور بڑا تھا، چھیدن بٹیا کی سسرال والوں نے کل ہی بھر کر بھیجا تھا، چھوٹا سلمہ ستارہ بھی پوری چمک پر تھا۔ بہت ہی آہستہ سے منشی جی نے سمدھیانے کا یہ تحفہ کھولا، باریک ترشی ہوئی ڈلی نکالی، اسے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھا، پھر کٹا ہوا کتھا اس میں رکھا، ایک لونگ ڈالی اور ایک چٹکی بھر تمبا کو ملالی، پھر ڈلی ایک انگلی سے الٹتے پلٹتے رہے، دیکھ رہے تھے کہ ڈلی کا کوئی سڑا ہوا یا پھول والا حصہ تو نہیں آگیا ہے، جب اچھی طرح اطمینان کرلیا تو سب کچھ ایک بار پھانک لیا۔ پھر چنوٹی سے تھوڑا سا چونا کلمے کی انگلی سے نکال کر ڈلی چباتے ہوئے وکیل صاحب کی طرف دیکھا۔ دو تین بار آنکھیں جھپکائیں اور چونے کا ایک حصہ چاٹ لیا۔

وکیل صاحب جانتے تھے کہ یہ سب منشی جی کے سوچنے کے انداز ہیں۔ وہ کنکریوں اور سنگریزوں کے ڈھیر سے ہیرے کا ٹکڑا نکال کر پیش کرنے والے ہی ہیں، اس لئے انھوں نے پھر اپنی بات دہرائی:۔

"بچتا اب بھی کچھ نہیں"

"ہاں میاں، وہ تو میں خود ہی برابر حساب لکھتا ہوں"

"ان بڑے آدمیوں سے ملنے ملانے میں ٹیم ٹام سے رہنا بھی تو پڑتا ہے"۔

"جی ہاں میاں، ناچتے وقت بھڑکتی، چمکتی پیشواز تو پہننا ہی پڑتی ہے"۔

"پھر یونہی تو بسر نہیں ہوسکتی، آیندہ کیا ہوگا؟ لڑکیاں لڑکے بھی تو سیانے ہو رہے ہیں"۔

"ہاں میاں"

"پھر!"

"جی میاں، اب کے میونسپلٹی کی ممبری کے لئے کھڑا ہونا چاہیے"۔

"رائے تو اچھی ہے، مگر کس وارڈ سے؟"
"جہاں سے سب سے زیادہ دولتمند آدمی کھڑا ہو"
"تو منشی جی اس کے روپیوں کی جھنکار میں میری آواز کون سُنے گا؟"
"جی، تو موقع دیکھیں گے تو ہزار دو ہزار لے کر خود ہی بیٹھ جائیں گے"
"اور اگر وہ ہماری پارٹی کے اثر سے خود ہی بیٹھ گیا"
"تو میاں میری ہے، اتنی بڑی میونسپلٹی ہے، اس کے اختیار میں ہزاروں نوکریاں ہیں، سیکڑوں ٹھیکے ہیں....."
"اور آپ ان کے لئے سفارش کرینگے ہی!"
"جی میاں! — اور آپ کو اپنے بوڑھے منشی کی خاطر کرنا ہی پڑے گی!"
"ہاں، ہاں، کیوں نہیں! ضرور! ضرور!"

(۴)

منشی جی، میں نے آپ کی خاطر سے میونسپلٹی کا الکشن تو چھوڑ دیا، مگر کام کچھ بہت آگے نہیں بڑھا۔"
"جی ہاں، میاں لیکن ڈیڑھ ہزار کا تو فائدہ رہا"
"مگر پارٹی والوں نے تو حصّہ لگا کر اُسے ایک ہی ہزار کر دیا۔"
"جی ہاں میاں، لیکن شیر اپنے شکار میں سے گیدڑوں کو بھی تو کچھ حصہ دے ہی دیتا ہے"
جی ہاں، مگر اس وقت دیتا ہے جب خود شکم سیر ہو لیتا ہے۔"
ہاں میاں، مگر اس کا بھی وقت آ رہا ہے!"
"یعنی؟"
"جی آپ کے صوبے کی اسمبلی کی امیدواری کے لئے کھڑا ہونا چاہیئے"
"مگر اس میں آپ نے کیا فائدہ سوچا ہے؟"
جی، وزراء سے، بڑے بڑے حکام سے ملاقات ہوگی۔"
"تو اس سے کیا فائدہ؟"
"جی، چھٹن میاں کی تعلیم پر جو اتنا روپیہ صرف کیا جا رہا ہے، تو ان کی ترقی کی بھی تو کوئی صورت ہونا چاہیئے۔"

"میں آپ کا مطلب نہ سمجھا"

"میرا مطلب یہ ہے میاں کہ سعی سفارش سے بڑا کام نکلتا ہے، ورنہ اچھے اچھے بی۔اے ایم۔اے ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں"

"لیکن منشی جی اتنے بڑے الکشن کے لئے تو بہت سا روپیہ چاہیئے!

جی ہاں میاں، چاہیئے تو، مگر میونسپلٹی والے تیار موجود ہی ہیں، بقیہ کی فکر اللہ کر دے گا!"

آخر بتایئے تو کہ آپ نے کیا سوچا ہے"

"جی میاں، ایسے مہاجن بھی تو ہیں جنھیں یہ فکر لگی ہے کہ سود در سود کے خلاف کوئی قانون نہ پاس ہونے پائے!"

اچھا تو اِن لوگوں سے بھی آپ سے ملاقات ہے!"

جی، وہ خود ہی ڈھونڈھ لیں گے۔ غرض والا باولا ہوتا ہے!"

"تو پھر اللہ کا نام لیکر کام شروع کر دیجئے"

اِسی وقت سے لیجئے میاں، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

"دیال بانی"

رادھا سوامی مت کے مشہور مہرشی مہاشے شیوبرت لال صاحب مرحوم کی صدہا کتابیں شایع ہوکر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ آپ کو تمام عمر ہندو تاریخ ہندو اتہاس اور ہندو فلسفہ سے ایک خاص دلچسپی رہی۔ چنانچہ آپ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دھارمک اپدیش کی نذر کر دیا تھا۔ اب آپ کی یادگار میں دیال نامی ایک مفید و دلچسپ اُردو رسالہ دیال نواس مٹھی گنج الہ آباد سے شائع ہو رہا ہے۔ حال میں اس کارخانے نے "دیال بانی" کے نام سے ایک چھوٹی سی ہندی کتاب شائع کی ہے جس میں مہرشی مرحوم کے وہ تمام خطوط یکجا کر دیے گئے ہیں جو آپ نے شریمتی بھگوتی دیوی کے نام اُن کے شوہر کی وفات کے بعد پند و نصیحت کے طور پر لکھے تھے۔ شائقین اس مجموعہ کو سکریٹری صاحب دیال نواس الہ آباد سے مفت بلا قیمت حاصل کر سکتے ہیں۔

برسات

(از حضرت لطیف انور)

موسمِ برشگال آیا ہے　　　لطف افزائے حال آیا ہے
آسماں پر محیط ہیں بادل　　　بادہ نوشوں میں پڑ گئی ہلچل
بابِ میخانہ کھول دے ساقی　　　جسم و جاں میں ہوئی ہے ناچاقی
آرزو ربطِ زندگانی ہے　　　زندگانی اگرچہ فانی ہے
جسم تعمیرِ خاک ہے گویا　　　روح ہر شے سے پاک ہے گویا
ہاتھ بڑھتے ہیں جانبِ مینا　　　واقفِ غم ہے دیدۂ بینا
بختِ ہندوستاں ہے خوابیدہ　　　یا ہے درپیش راہِ نادیدہ
شوقِ منزل کو رہنما کر دے　　　جامِ صہبائے ناب سے بھر دے
جذبۂ دل اگر نہ ہو ہادی　　　جلوہ کیا دے عروسِ آزادی
ہو نہیں سکتا سازگارِ دل　　　یاد ماضی خیالِ مستقبل
عہدِ حاضر سکوں پذیر نہیں　　　وہم میں میں اگر اسیر نہیں
سو غموں کا ہے ایک غم خالی　　　نو شگفتہ گلوں کی پامالی
کیا دلِ بے نوا ملول نہیں　　　آسماں کا گلہ فضول نہیں
وہ گھٹا چھائی وہ اٹھا بادل　　　زلفِ فطرت نے کھائے بل پر بل
دے وہ جامِ شراب دے ساقی　　　نام کو غم نہ رہ سکے باقی
آج عالم ہے کیوں اداسی کا　　　راز کھل جائے خود شناسی کا
فکر مصروفِ ہست و بود ہے کیوں　　　کشمکش حاصلِ وجود ہے کیوں
سانس کیوں حلق میں اٹکتا ہے　　　دل میں کانٹا سا کیوں کھٹکتا ہے

لطف کیا دے گی بادہ آشامی
اک غلامی ہزار ہا خامی

رفتارِ زمانہ

جنگ روس و جرمنی پچھلے پرچہ میں جنگ کے سلسلہ میں جرمنی کے متعلق لکھا گیا تھا کہ دیکھئے روس کی طرف توجہ ہوتی ہے یا برطانیہ پر حملہ کا خیال پورا کیا جاتا ہے" یہ سطریں خشک بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ ۲۱۔ جون کی صبح کو جرمنی نے روس پر یکایک اس قدر وسیع پیمانہ پر حملہ کر دیا کہ بحر قطب شمالی سے لیکر بحیرۂ اسود تک ڈیڑھ دو ہزار میل کے علاقہ میں لڑائی چھڑ گئی۔ دو سال بھی نہیں ہوئے کہ ہٹلر نے روس سے دوستی کا اعلان کیا تھا۔ اب یکایک اس نے یہ الزامات لگائے ہیں، اول یہ کہ روس نے بالٹک کی ریاستوں لتھونیا، لیٹویا، اسٹونیا پر قبضہ کرکے ان کی آزادی و خود مختاری خاک میں ملا دی، جس کی وجہ سے ہزاروں جرمنوں کو ان ملکوں سے ہجرت کرنا پڑی دوسرے روس نے بلغاریہ کی حمایت کرکے بلقان میں جرمن پیش قدمی روکنے کی کوشش کی۔ تیسرے ایک طرف تو اس نے درۂ دانیال و باسفورس میں اڈے حاصل کرنے کی لئے اٹلی و جرمنی کی مدد چاہی اور دوسری طرف انگریزوں سے ساز باز کرکے یوگوسلافیہ کو ہوائی جہاز اور سامان جنگ بھیجنے کی کوشش کی۔ بلغراد کے قنصل خانہ سے جو دستاویز ملی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ روس جرمنی پر حملہ کرنے والا ہی تھا۔ اور روس نے جرمنی کی سرحد پر خواہ مخواہ ایک عظیم فوجی جمعیت لاکر ڈال دی۔

حملہ کرنے سے پہلے ہٹلر نے اسٹالین سے رومانیہ اور فنلینڈ کی سرحدوں سے روسی فوجیں ہٹانے یوکرین کو جرمنی کے قبضہ میں دینے، جرمنی کو روس کے راستہ سے سامان جنگ منگوانے، قفقاز کے علاقہ سے مٹی کا تیل لینے کی اختیارات کا مطالبہ کیا۔ ظاہر ہے کہ روس ان باتوں کو کیسے مان سکتا تھا

بات یہ ہے کہ جرمنی اب تک برطانیہ کو مغلوب نہیں کر سکا۔ امریکہ کی امداد سے جنگ کی طوالت کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے جس کے لئے جرمنی کو غلہ اور پٹرول کی اشد ضرورت ہے اور ان کے حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ یوکرین اور روسی قفقاز ہیں۔ اسی وجہ سے روس پر حملہ ضروری ہو گیا۔

اس جنگ میں رومانیہ۔ فنلینڈ۔ ہنگری اور اسپین، جرمنی کا ساتھ دے رہے ہیں مگر برطانیہ نے روس کے ساتھ ایک فوری معاہدہ کر لیا ہے۔ جس کی رو سے برطانیہ ہر طرح سے روس کو مدد دیگا، اور یہ بھی طے ہوا ہے کہ روس برطانیہ سے مشورہ لئے بغیر صلح نہ کریگا۔ امریکہ کی ہمدردی بھی زیادہ تر روس ہی کے ساتھ ہے۔

جرمنی نے روس پر سب طرف سے حملے کئے ہیں جن میں تین طرف کے حملے زیادہ شدید ہیں۔ فنلینڈ

کی طرف سے جرمنوں نے روسی بندرگاہ مرمانسک پر قبضہ کرکے جنوب کی سمت لینن گراڈ تک پہونچنے کا ارادہ کیا ہے اور لینن گراڈ کو ہوائی جہازوں سے نقصان بھی پہونچایا ہے۔ دوسرا حملہ پولینڈ کی طرف سے کیا گیا جہاں سب سے زیادہ گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ اس محاذ پر روسی فوجیں پولینڈ سے ہٹکر اصلی روسی علاقہ میں چلی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ خونریز لڑائی اس محاذ پر بیالسٹاک اور منسک کے میدانوں میں ہوئی، جہاں جرمنوں کو سخت نقصان پہونچا۔ اندازہ ہے کہ اس محاذ پر تقریباً دس لاکھ جرمن سپاہی کام آگئے۔ مگر جرمن اپنی زبردست فتح کا دعوی کر رہے ہیں اور روس کے چار لاکھ قیدی گرفتار کرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔ ہزاروں ٹینک اور ہوائی جہازوں کی تباہی اور منسک سے آگے تک کے علاقہ کی فتح کا دعوی علیحدہ ہے۔ اس مغربی محاذ پر اس وقت فریقین کی نوے لاکھ فوج شدید جنگ میں مصروف ہے۔ اور فریقین کی طرف سے اپنی کامیابیوں کے دعوے کئے جاتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ابھی فیصلہ کن جنگ نہیں ہوئی۔ اس وقت جرمنی کی فوجیں یوکرین کے صدر مقام کیف کے دروازے پر اور دوسری طرف نوداگروڈ سے آگے بڑھکر ماسکو کے راستہ پر بتائی جاتی ہے۔

روس پر تیسرا شدید حملہ رومانیہ کی طرف سے کیا گیا ہے۔ اس طرف بقول جرمن نیوز ایجنسی رومانیہ اور جرمنی کی فوجیں ملک بیسارابیہ کے دارالحکومت پر قابض ہوگئی ہیں، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اسی محاذ پر روس نے دشمنوں کو سب سے زیادہ نقصان پہونچایا ہے۔ روسی ہوائی جہازوں نے رومانیہ کی بندرگاہ کانسٹینزہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور شہر پلوسٹی کو جہاں رومانیہ کے تیل کے کارخانے ہیں جلاکر خاک کردیا۔ دوسری طرف چھوٹے چھوٹے روسی جنگی جہاز دریائے ڈینیوب میں اس قدر دور تک گھس گئے ہیں کہ رومانیہ کے پایۂ تخت بخارسٹ کو خطرہ پیدا ہوگیا ہے اور رومانیہ کی گورنمنٹ وہاں سے بھاگ کر کسی دوسری جگہ چلی گئی ہے بحیرۂ اسود کا دروازہ بھی روسیوں نے بند کردیا ہے جس سے قفقاز کا راستہ نہیں مل سکتا۔ اس طرح جرمنی رومانیہ کے تیل سے محروم ہوگیا ہے جس کی اس وقت اس کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

اس وقت فریقین اس قدر متضاد اور مبالغہ آمیز بیانات شائع کررہے ہیں کہ انھیں پڑھکر صحیح نتیجہ تک پہونچنا دشوار ہے لیکن غیر جانبدار ذرائع سے معلوم ہورہا ہے کہ اگرچہ جرمنوں نے روس پر نہایت شدید حملے کئے ہیں اور انھیں کچھ کامیابیاں بھی حاصل ہوئی ہیں لیکن روسی فوجیں ہر طرف سے ہٹ ہٹا کر اور سمٹ سمٹا کر جرمنی کے مقابلے کے لئے مردانہ وار ڈٹ گئی ہیں۔ روسیوں کے فوجی نظام یا دم خم میں کسی جگہ کوئی فرق نہیں آیا ہے اور جس شدت کے ساتھ روسی فوجیں اس وقت دشمن کا مقابلہ کررہی ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اپنی قوت مدافعت پر بھروسہ ہے۔ روس کا فوجی یا سیاسی محاذ کہیں سے بھی شکست نہیں ہوا ہے اور وہ دشمن کو پیچھے ڈھکیلنے میں مصروف ہیں۔ جرمنوں کا طریقہ جنگ یہ ہے کہ کسی محاذ کو پہلے

وہ اپنے ٹینکوں اور موٹر سوار دستوں سے توڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور پیدل فوج آکر تسلط جمالیتی ہے۔ اس وقت تک جرمنوں نے سمولنسک اور نواگروڈ پر قابض ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہاں بھی وہی کھیل کھیلا گیا ہوگا لیکن روسی دستے آگے بڑھی ہوئی جرمن فوج کو گھیر کر مات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ روسی فوج جس علاقہ کو خالی کرتی ہے اُسے پوری طرح تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے تاکہ دشمن کو کسی قسم کا فائدہ نہ پہونچ سکے۔ جرمنی کی فوجی طاقت گھٹتی جاتی ہے اور رسد کی دشواریاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ غرض روس کی جنگ کا جرمنی پر خراب اثر پڑ رہا ہے۔ اور ممکن ہے وہ جلد ہی تھک جائے۔ مغربی سمت سے برطانیہ کے ہوائی جہاز روزمرہ جرمن شہروں پر حملے کر کے تباہی و بربادی پھیلا رہے ہیں۔ اس کا اثر بھی جرمنی کے لئے پریشانی کا باعث ہوگا۔

شام دوسری طرف ملک شام پر برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ اور فرانسیسی جنرل دنیٹز نے لڑائی سے پریشان ہو کر اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دئیے ہیں۔ چنانچہ ۱۱ جولائی سے لڑائی بند ہوگئی ہے التوائے جنگ کی شرائط کے مطابق شام اور لبنان پر اتحادیوں کا قبضہ ہوگا۔ فرانسیسی سپاہیوں سے اسلحے لے لئے جائیں گے البتہ جو فرانسیسی سپاہی وشی گورنمنٹ کے ساتھ رہنا چاہیں گے انھیں فرانس جانے کی اجازت ہوگی، اور جو فرانسیسی اتحادیوں کا ساتھ دینا چاہیں گے انھیں متحدہ فوج میں شامل کرلیا جائیگا۔ جو سول افسران اپنے عہدوں پر رہنا چاہیں گے انھیں بحال رکھا جائیگا۔ اس طرح پولس کا انتظام بھی بدستور اتحادیوں کے سپرد رہیگا۔ اسی قسم کی کل بائیس شرطیں طے ہوئی ہیں۔

افریقہ برطانیہ کی دوسری بڑی کامیابی یہ ہوئی ہو کہ مشرقی افریقہ سے اطالوی سلطنت کا جنازہ اُٹھ گیا ہے۔ حبش کے کوہستانوں میں کہیں کہیں اطالوی سپاہیوں کے تلونشین دستے البتہ باقی رہ گئے ہیں مگر یہ بھی عنقریب یا تو خود ہتھیار ڈال دینگے یا قید کرلئے جائیں گے۔ لیبیا میں بھی طبروق پر برطانوی قبضہ قائم ہے اور وہاں کی برطانوی فوج بڑی داد مردانگی دے رہی ہے اور وقتاً فوقتاً اپنے مورچوں سے نکل کر دشمن کی صفوں پر چھاپے مار کر اور نقصان پہونچا کر اپنی جگہ واپس آجاتی ہے۔ بہرحال اس محاذ پر ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ شمالی افریقہ میں برطانوی ہوائی جہازوں کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اور بنغازی، طرابلس، اور درنہ پر حملوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اب چونکہ حبش اور مشرقی افریقہ کی مہموں سے فارغ ہو کر بہت سی برطانوی سپاہ دوسرے محاذوں کے لئے خالی ہو جائیگی اسلئے جنرل واویل جنھوں نے مشرق وسطیٰ میں پچھلے دنوں زبردست کارنامے انجام دیئے تھے اب ہندوستان میں کمانڈر انچیف کی حیثیت سے بھیجدیئے گئے ہیں اور اُن کی جگہ ہندوستان کے سابق کمانڈر سر آچن لک مشرق وسطیٰ کے کمانڈر انچیف بنا دیئے گئے ہیں۔

برطانیہ | بہرحال برطانیہ کے دم خم بدستور قائم ہیں اور برطانوی قوم کا بچہ بچہ ہٹلر کی فرعونیت کو مٹانے پر کمر بستہ ہے برطانوی ہوائی جہاز مغربی جرمنی، اور جرمنی کے مقبوضہ مغربی علاقوں میں پہونچکر تقریبًا روز بمباری کر رہے ہیں۔ مسٹر چرچل اعلان کر چکے ہیں کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ سخت حملے ہونگے۔ کیونکہ برطانیہ کی ہوائی طاقت روز بروز بڑھ رہی ہے۔

برطانوی گورنمنٹ میں بعض تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں، پرانی وزارت بدستور باقی ہے اور جو تبدیلیاں ہوئی ہیں اُن کا ہندوستان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بہرحال مسٹر ڈف کوپر وزارت اطلاعات سے ہٹا دئیے گئے ہیں اور اُن کی جگہ مسٹر بریندن بریکن وزیر اطلاعات مقرر کئے گئے ہیں۔ سابق وزیراعظم مسٹر بونر لا کے صاحبزادہ مسٹر آر کے لا نائب وزیر خارجہ مقرر ہوئے ہیں۔ مگر مسٹر امیری بدستور وزیر ہند ہیں۔

امریکہ | امریکہ برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کی امداد و اعانت پر مستعدد ہے بلکہ روز بروز جنگ کے قریب ہوتا جاتا ہے اس طرف اس کا تازہ ترین کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے جزیرہ آئس لینڈ پر قبضہ کر لیا ہے جو ڈنمارک کا تھا اور جس پر حال میں برطانیہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ امریکہ کی یہ کارروائی یورپین جنگ میں شرکت کا ایک نیا پہلو سمجھا جاتا ہے۔

جاپان | روس و جرمنی کی جنگ شروع ہونے کے بعد جاپان نے بھی کروٹیں بدلنا شروع کی ہیں۔ پرانی وزارت ٹوٹ گئی ہے اور گو اب بھی وزیراعظم پرنس کونوئے ہی ہیں لیکن نئی وزارت میں بری و بحری فوج کا عنصر زیادہ ہو گیا ہے ایک طرف جاپان کا رخ جنوب یعنی انڈو چائنا اور مشرقی جزیروں کی طرف ظاہر ہوتا ہے اور دوسری طرف شمال میں جاپانی فوج کی روسی سرحد کی طرف نقل و حرکت شروع ہو گئی ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ ماسکو سے جاپانی سفیر واپس بلا لیا گیا ہے اور دوسری طرف یورپین سمندروں سے تمام جاپانی جہاز واپس بلا لئے گئے ہیں اور جنوبی افریقہ کے جاپانیوں کو بھی واپس چلے آنے کا حکم دیدیا گیا ہے۔ ان حالات میں جاپان کی آئندہ پالیسی پر کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے مگر تھوڑے ہی دنوں میں یہ گتھی خود بخود کھل جائیگی۔

ہندوستان | ہندوستان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ جنرل واویل مشرق وسطیٰ سے ہندوستان میں بحیثیت کمانڈر ان چیف آ گئے ہیں اور اُنھوں نے بھی سابق کمانڈر ان چیف صاحب کی پالیسی جاری رکھنے کا اعلان کیا ہے۔ چنانچہ ایک ڈیفنس کونسل بھی قائم ہو گئی ہے اور اب ہندوستانیوں کو فوجی معاملات میں بھی پہلے سے کہیں زیادہ زور اور اثر کے ساتھ مشورہ دینے کا موقع رہیگا۔ اس کے ساتھ ساتھ وائسرائے کی اگزیکٹیو کونسل میں بھی توسیع کر دی گئی ہے یعنی اب تین سرکاری ممبروں کے مقابلے میں سات ممبر غیر سرکاری ہوں گے۔ نئی کونسل کے لئے جو ممبران مقرر کئے گئے ہیں اُن کی فہرست یہ ہے:-

(۱) سر ہرمز جی مودی، ممبر سپلائی۔ (۲) آنریبل سر اکبر حیدری ممبر اطلاعات، (۳) مسٹر ای راگھویندر راؤ ممبر سول ڈیفنس (۴) ملک سر فیروز خاں نون، ممبر لیبر (۵) مسٹر اینے ممبر محکمہ ماورائے بحر (۶) سر سلطان احمد

ممبر قانون (۷) مسٹر نلنی رنجن سرکار ممبر تعلیم، صحت و زراعت۔ ان جدید ممبروں کو اسّی ہزار روپیہ کے بجائے چھیاسٹھ ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ ملا کرے گی۔

ڈیفنس کونسل جو بنائی گئی ہے اسمیں برٹش انڈیا اور دیسی ریاستوں کے تیس ممبر ہونگے۔ ریاستی ممبروں کے ناموں کا ابھی اعلان نہیں ہوا ہے، برٹش انڈیا کے حسب ذیل ممبر لئے گئے ہیں۔ (۱) ڈاکٹر امبیدکر (۲) آنریبل مولوی سید سر محمد سعد اللہ (۳) آنریبل مسٹر اے۔ کے فضل الحق۔ (۴) نواب سر محمد احمد سعید خاں آف چھتاری (۵) کمار راجہ سر سٹھیا پیٹیار آف چیٹی ناڈ (۶) آنریبل مہاراجہ ادھراج دربھنگہ (۷) مسٹر رام راؤ مادھو راؤ دیشمکھ (۸) لفٹننٹ کرنل سر ہنری گڈنی (۹) سر کاؤس جی جہانگیر (۱۰) راجہ بہادر کالی کوٹ (۱۱) آنریبل ملک خدا بخش خاں (۱۲) مسٹر جمنا داس مہتہ (۱۳) مسٹر جی۔ بی۔ مارٹن (۱۴) مسٹر بیرن مکرجی (۱۵) لفٹننٹ سردار نونہال سنگھ۔ (۱۶) بیگم شاہنواز (۱۷) آنریبل خان بہادر میجر سردار سر سکندر حیات خاں (۱۸) رائے بہادر ایم۔ سی۔ راجہ۔ (۱۹) مسٹر دی۔ احمد شاہ (۲۰) آنریبل خان بہادر الہ بخش محمد عمر سُمرو (۲۱) سر جوالا پرشاد سریواستو (۲۲) خان بہادر سر محمد عثمان

آخر جولائی میں پونا میں غیر جانبدار مدبران ملک کی پھر کانفرنس ہو رہی ہے۔ انگلستان میں ہمدردان ہند سمجھوتہ کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں ممکن ہے کہ عنقریب ہی کوئی امید افزا فیصلہ ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی رہائی کی بھی افواہ ہے لیکن جب تک برطانیہ اپنے زاویہ نگاہ میں اصولی تبدیلی کا اعلان کرنے پر تیار نہ ہو ہندوستانی قوم پرستوں کے رویہ میں فرق ہونے کی ہمکو کوئی امید نہیں ہوتی۔ مہاتما گاندھی برطانیہ کو پریشان کرنا نہیں چاہتے تاہم بحالات موجودہ وہ تحریک ستیاگرہ کو آئندہ چار پانچ سال تک جاری رکھنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں سمجھوتہ کی کیا امید کیجا سکتی ہے محض ستیہ گرہیوں کی رہائی کا کوئی دیرپا اثر نہیں ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کا مسئلہ اب آئرلینڈ کے مثل پیچیدہ ہو گیا ہے جب تک برطانیہ اُلوالعزمی اور اخلاقی جرأت سے کام نہ لیگی اسے ہندوستان کی طرف سے مستقل اطمینان نصیب نہ ہوگا اور ہندوستان کے مطمئن ہونے کے بعد دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو برطانیہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکے۔

اردو کے نئے رسالے

معاصر یہ رسالہ ۱۹۴۰ء سے مسٹر عظیم الدین احمد صاحب کی ایڈیٹری میں بانکی پور پٹنہ سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ افسانوں نظموں اور غزلوں کے علاوہ کئی مسلسل مضامین بھی نکل رہے ہیں جو قابل قدر ہیں ہمکو پوری امید ہے کہ یہ پرچہ ترقی کریگا اور شائقین اسکی قدر کرینگے۔

جدید اردو مسٹر محمد ظہور احسن قاضی اس رسالہ کے ایڈیٹر ہیں۔ پرچہ مجموعی حیثیت سے اچھا ہے لیکن اسکے ٹائیٹل سے ہمکو ایک طرح کی الجھن سی معلوم ہوتی ہے ہم نہیں چاہتے کہ کسی ادبی رسالہ کا ٹائیٹل اسطرح کا ہو سالانہ چندہ صرف دو روپیہ سالانہ ہے جو کافی سستا معلوم ہوتا ہے۔ منیجر جدید اردو نمبر ۲۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ سے طلب کیجئے۔

علمی خبریں اور نوٹ

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی صدارت میں اردو انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کا بند و بست کیا ہے معلوم ہوا ہے کہ اس کے ابتدائی مرحلے طے ہو چکے ہیں اور ترتیب کا کام بھی کئی پروفیسروں کے زیر اہتمام شروع ہو گیا ہے۔

حکومت سندھ نے تعلیم بالغان کے لئے وسیع پیمانہ پر ایک اسکیم تیار کی ہے۔ جسکے ماتحت تین سو نائٹ اسکول کھولے جائیں گے اور سولہ سے بیس سال کے نوجوانوں کو جو کبھی اسکول نہیں گئے ہیں تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے گا۔ اس اسکیم پر پچیس ہزار روپیہ سالانہ خرچ تجویز کیا گیا ہے۔ اور اس کے ماتحت بارہ ہزار نوجوانوں کو ہر سال تعلیم دیجائے گی۔

ہم نے ولی افسوس سے سنا کہ پچھلے دنوں عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر معتضد ولی الرحمن صاحب ایم۔ اے کا عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کو فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی اور انھوں نے پچھلے سال کئی فلسفیانہ مضامین زمانہ میں اشاعت کے لئے عنایت فرمائے تھے۔ افسوس کہ یہ مضمون انکی حیات میں رسالہ میں شایع نہ ہو سکے اب ہم انھیں جلد ہدیۂ ناظرین کریں گے۔ پروفیسر صاحب کی وفات سے اردو ادب کو نقصان عظیم پہونچا ہے۔ خداوند تعالےٰ انھیں بہشت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ہندوستان خاص میں اسوقت فن خوشنویسی کے زوال کا زمانہ ہے ہمارے نوجوان اور اسکولوں کے طالب علم اس فن سے عموماً بے پروا ہو رہے ہیں۔ کسی زمانہ میں لکھنؤ وغیرہ کے خوشنویس تمام ملک بھر میں مشہور تھے مگر وہاں بھی اب بہ حیثیت فن اسکا انحطاط ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ریاست حیدرآباد دکن میں اب بھی خوشنویسی کی قدر کیجاتی ہے چنانچہ حال میں اس نیم مردہ فن میں جان ڈالنے کی غرض سے ایک انجمن "مجلس احیائے خوشنویس" کے نام سے نواب اکبر یار جنگ بہادر کی صدارت میں قائم ہوئی ہے انجمن مذکور نے خوشنویسی کے ایک کل ہند انعامی مقابلہ کا اعلان کیا ہے جسمیں ملک کے بہترین خوشنویسوں کو چھ سو روپیہ مالیت کے آٹھ انعامات دیئے جائینگے۔

کچھ عرصہ ہوا ہمعصر مشیر دکن حیدرآباد دکن نے زمانہ کے ایک مضمون کا ریویو کرتے ہوئے اس ناچیز رسالہ کے متعلق لکھا تھا کہ "یہ ۴۰ سال سے جاری ہے اور ابتدا سے ابتک ہندو مسلمانوں کا مشترکہ ادبی و اخلاقی پرچہ سمجھا جا رہا ہے۔ اسمیں ملک کے بہترین اہل قلم کے مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں اور اسکی پالیسی شروع

سے ابتک ہندوستانی قومیت کے تعمیری پہلو پر مبنی رہی ہے

پچھلے دسمبر میں کل ہند اردو کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقدہ کانپور میں بھی بیگم اعزاز رسول صاحبہ ڈپٹی پریسیڈنٹ قانونی کونسل صوبۂ متحدہ و صدر مجلس استقبالیہ و آنریبل سر شیخ عبدالقادر صاحب پریسیڈنٹ کانفرنس نے اپنے اپنے پرمغز ایڈریسوں میں اس رسالہ کی ادبی خدمات کا بہت حوصلہ افزا الفاظ میں ذکر کیا تھا۔ انجمن ترقی اردو کے اخبار ہماری زبان نے جب کبھی کانپور کا نام لیا تو زمانہ کا ذکر خیر کرکے اس کے مستقل معیار کا خصوصیت سے اعتراف کیا۔ ناظرین زمانہ بھی وقتاً فوقتاً اپنی قدردانی کا اظہار کرتے رہتے ہیں اسوقت ان خیالات کے مفصل بیان کا موقعہ نہیں ہے مگر بیان پر ایک نئے مضمون نگار مسٹر مشیر علی صدیقی۔ ایم۔اے کی رائے کا اقتباس بیجا نہ ہوگا۔ آپ نے پچھلے دنوں ایک خط میں لکھا ہے کہ مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ زمانہ اپنی پرانی روش پر قائم ہے اور ہنگامی چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "آجکل رسالہ کو ایک مستقل معیار پر نکالنا بڑا مشکل کام ہے آپ کو اس کے لئے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا اس کا اندازہ کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ میں زمانہ کو اردو کا ایک معیاری پرچہ تصور کرتا ہوں گذشتہ سال جب اردو میں ایم۔اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا میں نے زمانہ کے حالی نمبر اور پریم چند نمبر سے کافی فائدہ اٹھایا۔

یہ قدردانی اپنی جگہ پر حوصلہ افزا ہے لیکن اسوقت ملک کے حالات کچھ ایسے دلشکن ہو گئے ہیں کہ اسوقت تک زمانہ کے استحکام کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوسکا اور ابھی تک اسکی آئندہ زندگی سے بیفکری نصیب نہیں ہوئی۔ ایک عرصہ سے کئی تجویزیں زیر نظر ہیں۔ لیکن ان سب کی تکمیل کے لئے قدردانان زمانہ اور ترقی خواہان ادب کی علمی امداد و سرپرستی کی ضرورت ہے۔ احباب کو تکلیف دینے میں قدرتاً سب کو پس وپیش ہوتا ہے اسلئے زمانہ کے استحکام کی تجویزیں بھی التوا میں پڑی ہوئی ہیں لیکن وقت گذر جاتا ہے اور ۳۸ سال تک مسلسل کام کرنے کے بعد اسباب کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ اس کا جلد سے جلد انتظام ہوجانا چاہیئے۔ سرکاری ملازم پچیس صد تیس سال کی خدمت کے بعد پنشن کے حقدار ہوجاتے ہیں ہمارا کوئی ذاتی مطالبہ نہیں ہے مگر کیا اردو ادب کے ایک ادنیٰ خدمتگزار کا اتنا بھی حق نہیں ہے کہ یہ اہم رسالہ کسی فرد واحد کی کوشش و محنت سے بے نیاز ہو کر اپنی ہستی قائم رکھ سکے؟۔ ہمارے خیال میں اسکی صرف ایک صورت آئی ہے یعنی اسکی اشاعت کا انتظام ایک باضابطہ رجسٹری شدہ کمپنی کے سپرد کر دیا جائے اور قدردانان رسالہ مشترکہ امداد کے اصول پر اسکے لئے ضروری سرمایہ اکٹھا کر دیں۔ یہی کمپنی زمانہ اور اسکی تمام خصوصیات کو قائم رکھنے کی ذمہ دار ہو اور پرانی جلدوں کے خاص خاص مضامین کو کتابی شکل

میں شایع کرکے۔ رسالہ اور اس کے مطبوعات سے اگر کچھ نفع ہو تو وہ حصہ داروں میں تقسیم ہونیکے بجائے اردو ادب کے توسیع و ترقی میں صرف کیا جائے عموماً ادبی کوششیں مالی حیثیت سے نفع بخش ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ اسلئے ہم سرمایہ اکٹھا کرنے والوں کو مالی نفع پہونچانے کے خیالات یکلخت نظرانداز کردینے چاہئیں تاکہ قدردان احباب اس کمپنی کے حصے ذاتی نفع کے خیال سے نہیں بلکہ محض اردو ادب کی امداد اور ملک کی ادبی خدمت میں ہاتھ بٹانے کے لحاظ سے خریدیں۔ منتظمین کمپنی کی خوش معاملگی اور حسابات کی صفائی کا ہم بخوبی وعدہ کرسکتے ہیں لیکن نفع پہونچانے کا نہ ہمکو خیال ہے اور نہ ہم اسکی کوئی امید دلانا چاہتے ہیں۔ یوں بھی دیسی زبانوں کے اخبار اور رسالے شاذونادر ہی مالی حیثیت سے نفع بخش ہوتے ہیں۔ اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ زمانہ کے قدردان ان سب پہلوؤں کو مدنظر رکھکر ہمکو اس تجویز کے متعلق اپنی رائے سے مطلع فرمائیں کہ اگر دس دس روپیہ کے حصے رکھے جائیں وہ کسقدر حصے خود لے سکیں گے اور کسقدر حصے اُن کے احباب خرید سکیں گے۔ یہ معلوم ہو جائے تو اس اسکیم کی تفصیلات طے کیجائیں۔ بہرحال ہمارے ناظرین اور قدردان چاہیں گے تو زمانہ کی آیندہ زندگی کیطرف سے اطمینان ہوسکتا ہے ورنہ تمام ذاتی کوششوں کا جو حشر ہوتا ہے زمانہ بھی حد سے حد ایڈیٹر کی زندگی تک قائم رہ سکتا ہے۔

مندرجہ بالا نوٹ زمانہ کے پچھلے نمبر کے لئے لکھا گیا تھا لیکن عدم گنجایش کی وجہ سے جون نمبر میں شایع نہیں ہوسکا اس اثنا میں راقم الحروف کی ایک آنکھ میں یکایک کچھ ایسی شکایت پیدا ہوگئی کہ ڈاکٹروں نے اسے لکھنے پڑھنے کی ممانعت کردی ہے۔ چنانچہ یہ پرچہ جس طرح سے ہوسکا بے اطمینانی کی حالت میں تمام کرکے پریس بھیجا جارہا ہے۔ مزید ڈاکٹری مشورہ کے لئے ایڈیٹر زمانہ کو کلکتہ جانے کی ہدایت کی گئی ہے چنانچہ ۲۲ جولائی کو یہ سطریں لکھکر وہ کلکتہ روانہ ہوگیا۔ وہاں آپریشن کی ضرورت پیش آئے یا کوئی اور علاج تجویز ہو ابھی اسکے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ پرچوں کی ترتیب دوسرے ہاتھوں سے ہو۔ مگر اس نئی مصیبت نے زمانہ کی مخدوش حالت کو اور بھی نمایاں کردیا ہے اسلئے ہم نہایت زور کے ساتھ اپنے تمام ہمدردوں اور قدردانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس دیرینہ خدمت کے آئندہ استقلال و استحکام کیلئے ہر ممکن امداد سے دریغ نہ فرمائیں۔ تمام قدرشناسانِ رسالہ سے ہم فرداً فرداً اپیل کرتے ہیں کہ وہ خود اور اپنی کوشش سے زمانہ کی آئندہ زندگی قائم رکھنے کے لئے مستقل سرمایہ فراہم کردیں جسکے لئے ایک مختصر ٹرسٹ یا کمیٹی قائم کردی جائیگی جو بے لوثی سے اس خدمت کو ہرحالت میں جاری رکھنے کی ذمہ دار ہوگی۔ اگر دس دس روپیہ کے حصے تجویز کئے جائیں تب بھی ضروری ہے کہ کم سے کم بیس پچیس ہزار روپیہ کے حصے عام ہمدردانِ رسالہ خریدلیں۔ باقی کیلئے خاص خاص اصحاب کو تکلیف دیجاسکتی ہے لیکن جبتک عوام کیلئے معتدبہ رقم فراہم نہ کردیں اس وقت تک ہم زیادہ مقتدر حیثیت رکھنے والے قدردانوں کو زحمت دینے کیلئے تیار نہیں کلکتہ میں آپریشن سے قبل کچھ ابتدائی علاج تجویز ہوا ہے۔ علاج معالجہ کا سلسلہ دو تین ماہ تک رہیگا اس دوران میں زمانہ کا کام

THE ZAMANA, August 1941.   Regd. No. A7

29
22/9/41

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم

جلد ۷۷	اگست سنہ ۱۹۴۱ء	نمبر ۲

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ہے   ممالک غیر سے آٹھ روپیہ   نمونہ سات آنہ

یادگار پریم چند

مشہور رسالہ زمانہ کان پور

کا

"پریم چند نمبر"

جسمیں

منشی پریم چند کے پرانے دوستوں اور اردو کے بہترین انشا پردازوں اور شاعروں کے چونتیس مضامین نثر اور نیرہ نظمیں ہیں ۔

جسمیں

منشی پریم چند کی زندگی اور ادبی کارناموں کا ایک جامع اور مکمل مرقع پیش کیا گیا ہے ۔

اور

منشی جی کی تصانیف کی فہرست، ان کا عکس تحریر اور مختلف اوقات کی آٹھ ہاف ٹون تصاویر بھی ہدیۂ ناظرین کی گئی ہیں ۔

حجم خالص مضامین ۱۶۵ صفحات تصاویر ٹائیٹل علاوہ قیمت مجلد صرف ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

المشتہر

منیجر زمانہ کانپور

نمبر اور سچے موتیوں کا

سفید سرمہ

مصنفہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر۔ کر رائے بہادر صاحب ایف سی۔ آر فیلو آف کیمسٹری لندن

آنکھوں کی بیماری و ترقی بینائی کے واسطے مفید ہے اور سب سے بہتر زود اثر دوا ہے ملک روس اور افریقہ وغیرہ کے معزز ڈاکٹروں نے و ہندوستان کے نامور ڈاکٹروں اور حکیموں نے آنکھوں کی بیماری میں اور دوا کو چھوڑ کر استعمال کیا ہے

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اسمیں کامیابی

(۱) نگاہ ناپ کر ہمارا سرمہ لگائیے دو ہفتہ میں روشنی بڑھ جائے گی اور جملہ نقائص چشم دور ہوں گے

(۲) عینک کی ضرورت نہیں رہتی

(۳) دھند۔ ڈھلکا آنسو بہنا، سرخی، کھجلی، سوزش آنکھوں کے سامنے اندھیرا، پلکوں کی اندرونی گوہانی دور ہوتی ہے (۴) کمزور نگاہ سے تاکا سوئی میں بہت جلد پرو لیجیے (۵) پربال، سبل، جالا، پھولی، ابتدائی موتیابند، ناخونہ آنکھوں کے سامنے ڈورا سا آنا بند ہو جاتا ہے لکھنے پڑھنے سے آنکھ کی تکان دور بہت جلد صاف کرتا ہے اور جملہ امراض چشم کیلئے اکسیر ثابت ہوا ہے قیمت فی تولہ ہے محصول ڈاک ۶ رکھے آنے نمونہ ایک روپیہ سے کم قیمت پر نہیں ملتا

ملنے کا پتہ

منیجر نگم کمپنی بنیا چوک کان پور

زمانہ

جلد ۷۷ اگست سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۲

لکھنؤ اسکول کی شاعری

(از سید علی جواد زیدی، ایم۔ اے)

لکھنؤ اسکول کی شاعری کے خلاف اتنا کامیاب پروپیگنڈا کیا گیا ہے کہ آج معمولی طالب علموں سے لیکر فارغ التحصیل مضمون نگاروں تک کے نزدیک لکھنؤ کی شاعری خرافات کا مجموعہ اور گل وبلبل اور انگیا چولی کا ذخیرہ ہے، نہ اس میں جذبات کی تصویر کشی ہے اور نہ حقائق کی گلکاریاں۔ مدرسے ہوں یا اسکول، کالج ہوں یا یونیورسٹیاں، ہر جگہ اساتذہ اور طلبا اسی قسم کے بے سروپا اعتراضات پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ نقادِ سخن بھی اسی کورانہ تقلید میں مبتلا ہیں جیسے معمولی شائقین۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اگر غور کیجئے کہ یہ لکھنؤ اسکول ہے کیا؟ تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اردو ادب کی تاریخ میں تو اس اسکول کا کہیں پتہ نہیں۔ بہرحال اس سلسلہ میں واقعات ذیل پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے:-

(۱) جب جہان آباد (دہلی) برباد ہوا تو وہاں کی ادبی محفل درہم برہم ہو گئی اور طوائف الملوکی اور بے سروسامانی کا ایسا دور دورہ ہوا کہ وہ نامور شاعر بھی جن کی نزاکت مزاج اور قناعت نفس کے افسانے آج تک زبان زد عوام وخواص ہیں گھربار چھوڑنے پر مجبور ہوئے شاہان اودھ کا دربار یارانِ نکتہ داں کے لئے صلائے عام تھا۔ اس لئے چند شاعروں کو چھوڑ کر باقی سب بڑے بڑے شاعر لکھنؤ و گرد و نواح لکھنؤ میں چلے آئے۔ اور یہیں شاعری اور اصلاح شعر میں مشغول ہو گئے۔ اس لئے اگر اردو شاعری کا کوئی لکھنؤ اسکول ہے تو اس کے بانی یہی شعرائے دہلی تھے پھر یہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کی تقسیم کیسی؟

مگر اس تقسیم کے پردے میں سیاسی عنصر کو بھی دخل ہے کیونکہ اُردو شاعری کی یہ تقسیم سلطنۃ اودھ کے زوال کے بعد کی گئی ہے۔ شاہانِ اودھ کی رنگ رلیوں کے تاریک پہلوؤں کو اسی طرح اُچھالا گیا ہے اور ان کی اخلاقی حالت کو اتنا پست و ذلیل بنا کے پیش کیا گیا ہے کہ آج شاید ہی کوئی ایسا ہو جو یہ تسلیم کر سکے کہ شاہانِ اودھ دنیا میں شراب و ساغر اور شاہد و ساقی کے سوا کسی اور چیز سے واقف بھی تھے۔ اب جبکہ ہندوستان میں قومیت کا کچھ کچھ احساس ہو چلا ہے اور تاریخی واقعات کی تحقیق و تدقیق کا شوق بھی پیدا ہو رہا ہے تو لوگوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں۔ نوجوان نقادوں نے جو عموماً قیاس آرائیوں کے مؤید اور کورانہ تقلید کے دلدادہ ہیں اس سیاسی ستور کو حقیقت سمجھ کے غلط واقعات کی بنیاد پر تخیل کا ایک وسیع قلعہ تیار کر دیا۔ اِن میں جن لوگوں کو اپنی ذہانت پر ناز تھا وہ ایک قدم اور آگے بڑھے اور ان کو "واجد علی شاہی سوسائٹی" کا عکس شاعری اور ادب میں بھی نظر آنے لگا۔ چنانچہ اسی شاعری کا نام لکھنؤ اسکول کی شاعری پڑ گیا۔ معلوم نہیں یہ حضرات یہ کیسے بھول گئے کہ آخر داغ کے یہاں یہی خصوصیتیں کیسے سمٹ آئیں' اور آج بھی جلیل کے یہاں کیوں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں

(۲) لکھنؤ کی شاعری پر یہ اعتراضات لکھنؤ کی بربادی کے بعد شروع ہوئے۔ جب علم و ادب کے چرچے کم ہو گئے اور عوام کو روٹی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ قسمتیں گردش میں تھیں اور زمانے کی ہوا کا رخ پلٹ چکا تھا کسے فرصت تھی کہ ان اعتراضات کا جواب دیتا۔ مگر جن لوگوں کی نظر اُردو ادب کے گراں بہا ذخیروں اور اس کی مختلف ادبی تحریکوں کے نشیب و فراز پر ہے وہ میری تائید کریں گے کہ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے اُردو کا تمام پرانا لٹریچر یکساں ہے، وہی مضامین کی محدود فضا ہے اور وہی انداز بیان کی فرسودہ دنیا، قدم قدم پر فارسی شاعری کی تقلید ہے، تبدیل آب و ہوا کا اثر ضرور ہوا ہے۔ مگر وہ کچھ ایسا نہیں ہے کہ جس پر خاص دھیان دیا جائے۔ پھر بھی اگر ہم اُردو غزل گو شاعروں کو ان کے مختلف اسکولوں میں تقسیم کرنا ہی چاہتے ہیں تو مندرجۂ ذیل تین اسکول بنائے جا سکتے ہیں:۔

۱۔ دکن اسکول

۲۔ فارسی اسکول

۳۔ جدید اسکول

دکن اسکول کے ذیل میں اُس زمانے کی شاعری آجائے گی جب شاہانِ اودھ برسر اقتدار تھے اور رعایا کی انتہائی محبت میں انھیں کی زبان میں پریت، پریم، پیا، جوگن اور سجن کے گیت گاتے اور سنتے تھے۔ اس اسکول کی شاعری پر ہندی شاعری کا اثر غالب تھا۔

فارسی اسکول اُن تمام غزل گویوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیگا جو فارسی شاعری سے متاثر تھے۔ یا ہیں، جو فارسی عروض فارسی اندازِ بیان اور فارسی تخییل کو مشعلِ راہ بنا کر شعر وسخن کی منزل میں قدم رکھتے ہیں۔

جدید اسکول کو ہم غالب اسکول بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ خود غالب اپنے کو فارسی شاعر سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ بگذر از مجموعۂ اُردو کہ آں ننگِ من است

لیکن اُس نے اُردو غزل میں اپنی جدّت پسند طبیعت سے مجبور ہو کر انقلابی تبدیلیوں کی بنیاد ڈالی اُس نے اُس زمانے کے قدامت پرستوں کی نگاہ میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ضرور بنالی لیکن غزل گوئی کا معیار بھی بہت بلند کر دیا جن خیالات کو اس کے متقدمین شجر ممنوعہ سمجھے ہوئے تھے۔ اس نے نہایت آزادی سے اُن کو اپنی غزلوں میں ظاہر کیا یہی نہیں بلکہ اُس نے دبی زبان میں اُردو ادب کے اس رُجحان کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی کہ ادب کو غزل ہی تک محدود کر دینا چاہیئے۔ اُس نے ببانگِ دہل پکار کے کہا کہ:۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

اسی جدید اسکول کے متبعین حالی۔ چکبست۔ سرور اور اقبال ہیں، آج کل کے غزل گو اسی جدید اسکول کی تقلید کی کوشش کرتے ہیں، اور ان میں سے اکثر کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

اس تقسیم کے علاوہ اور کوئی تقسیم ممکن نہیں ہے۔ لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کا کبھی وجود نہیں رہا۔ شاعری کے اسکول اس وقت تک نہیں بنائے جا سکتے ہیں جب تک مختلف گروہوں کے شاعروں کے سوچنے کا طریقہ ایک دوسرے سے جداگانہ نہ ہو۔ لکھنؤ اور دہلی اسکول کے شاعروں کا اندازِ تخیل یکساں ہے اگر کسی جگہ کوئی شاعر اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ سامنے آتا ہے تو وہ مستثنیات میں ہے محض ذاتی خصوصیات پر اسکول نہیں بنائے جا سکتے۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض بھی کر لیا جائے کہ کسی زمانے میں "لکھنؤ اسکول" موجود تھا تو کم از کم اس بیسویں صدی میں تو اس کا کہیں وجود باقی نہیں ہے خیالات کی اشاعت کے وسیلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ بڑی حد تک خیالات میں یکرنگی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک خیال دوسرے خیال سے بہت جلد ہم آغوش ہونے کی کوشش کرتا ہے اور بہت سے خیالات جب ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو ہم آہنگی کی شمع روشن ہو جاتی ہے نظم ہو یا نثر خیالات کے اعتبار سے موجودہ صدی [illegible] سب کے سب بہت کچھ یکساں [illegible]

بظاہر اقبال کے ذہن میں پاکستان کا تخیل اس تخیل سے بالکل جداگانہ ہے جو جوش کے ذہن میں متحدہ ہندوستان کا ہے لیکن اسرار و حقائق کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگانے والی نگاہیں فوراً پہچان لیتی ہیں کہ دونوں تخیلات کی روح وہی "احساس اتحاد" ہے جو عام ہو چلا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں "انتہا پسندوں" کی کمی نہیں۔ اس وجہ سے اکثر و بیشتر "قدامت" اپنی پوری قوت سے "جدت" سے جنگ کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے مگر یہ جنگ بھی ہندوستان گیر ہے اور لکھنؤ یا دہلی یا کسی مخصوص خطہ میں محدود نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے موجودہ زمانہ میں لکھنؤ اسکول یا دہلی اسکول کا تذکرہ مذاق سلیم کی ہنسی اُڑانے کے مرادف ہے۔ اس مضمون میں آگے چل کر جس "لکھنؤ اسکول" کا تذکرہ کیا جائے گا وہ بے راہ رو تنقید نگاروں کا مفروضہ اسکول نہیں ہے بلکہ "لکھنؤ اسکول" سے ہماری مراد وہ اسکول ہے جو خیالات کے اعتبار سے کوئی انفرادی حیثیت نہیں رکھتا۔ لکھنؤ یا لکھنؤ کے گرد و نواح میں رہنے والے شعراء کا اور ایسے شعراء کا جو اول الذکر سے فیض یاب ہوئے ہیں، ایک ایسا گروہ بنایا جا سکتا ہے جو یو۔پی کے مختلف گوشوں میں پھیلا ہوا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان شاعروں نے بیسویں صدی میں ادب اردو کی کیا خدمات انجام دی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا انجمن بہار ادب لکھنؤ کے اراکین نے اس بات کا جائزہ لینا چاہا تھا کہ فنی۔ جذباتی اور افادی حیثیت سے لکھنؤ اسکول کی شاعری کا ادبیات اردو میں کیا درجہ ہے۔ مگر یہ تینوں حیثیتیں تھوڑے سے غور کے بعد ایک ہی ہو جاتی ہیں کیونکہ اگر کسی شاعر نے یہ اعتبار فن کوئی اضافہ کیا ہے یا جذبات کی ترجمانی کی ہے تو دونوں کا مقصد افادی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تقسیم سے ایک دماغی بےچینی کا پتہ چلتا ہے۔ ملک کے موجودہ سیاسی ماحول میں دماغی سکون ناممکن ہو گیا ہے کیونکہ یہ انقلاب اور تبدیلی کا دور ہے جس میں مختلف نظریے آپس میں ٹکرا رہے ہیں، مختلف عقائد ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں، مختلف جماعتیں بقا اور فنا کے برزخ میں اضطراب و انتشار کا شکار ہو رہی ہیں یہ وہ وقت ہے جب ہمیں فیصلہ کرنا ہے، ہمارا ماضی ہم سے دور، حال پہلو بہ پہلو اور مستقبل قریب ہے ہمارا مستقبل یا تو ہمارے ماضی اور حال کی کوئی درمیانی صورت ہوگی، یا ہمارے ماضی و حال کا ردعمل۔ دونوں صورتوں میں ہمیں کو فیصلہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فیصلہ پر ماضی کے مقابلے میں حال کہیں زیادہ اثر انداز ہوگا۔ اس لئے حال کے نظریات کا اثر بھی ہم پر زیادہ ہے۔ آج کل دنیا کا نظریہ افادیت پسندانہ ہو گیا ہے، پھر اگر شاعری بھی سراسر افادیت پسند ہو تو کیا مضائقہ ہے، مگر اس کے ساتھ ہی ماضی کی یاد بھی دلوں میں باقی ہے۔ اسلئے موضوع افادی رہا مگر

فن اور جذبات کے لحاظ سے تقسیم بھی کر دی گئی

بہر حال اس وقت میں بھی اس ترتیب کو قائم رکھتے ہوئے شعرائے لکھنؤ کی شاعری کے اُنھیں پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا لیکن قبل اس کے کہ لکھنؤ کے موجودہ دَور کی خوبیاں یا خامیاں گنائی جائیں مناسب معلوم ہوگا کہ اُن قوتوں کا بھی صحیح احساس کر لیا جائے جو اس بیسویں صدی میں عموماً ہماری زندگی کے ہر شعبے پر خصوصاً شاعری پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔

اردو ادب اور بیسویں صدی

ہندوستان میں نہ معلوم کتنے سیاسی انقلابات ہو چکے ہیں لیکن اس کے پہلے جتنے انقلابات ہوئے ان میں عوام کا کوئی حصہ نہیں تھا، صرف اعلیٰ طبقہ کے لوگوں اور بادشاہوں کے درمیان مناقشات ہوتے تھے، لڑائیاں چھڑتی تھیں، فتح و شکست ہوتی تھی بیسویں صدی میں سیاسی تحریک جدید اُصولوں پر شروع ہوئی، انقلاب میں حصہ لینے والوں کا حلقہ وسیع ہو گیا۔ چنانچہ ملک کی سیاسی تحریک رجعت پسندوں کے دائرہ سے نکل کر اعتدال پسندوں اور لبرلوں کی محفلوں میں جلوہ فگن ہوئی، مگر بعد چندے وہاں سے بھی آگے بڑھ گئی۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں عوام کا اثر بہت بڑھ گیا، لاکھوں کروڑوں ہندوستانی کھدر کی ٹوپیاں پہن کر جوق در جوق ترنگے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔

۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۰ء کی سیاسی تحریکیں صحیح معنوں میں عوام کی تحریکیں (جنتا اندولن) تھیں اس طرح جب رفتہ رفتہ ملکی سیاست پر عوام کا قبضہ جمنے لگا تو طبقاتی رعونت کے قلعے بھی مسمار ہونا شروع ہو گئے جو سر بلند تھے انھیں سرنگوں ہونا پڑا، اعلیٰ طبقات کو بھی عوام سے ربط ضبط بڑھانے کی فکر ہوئی مگر عوام سے راہ و رسم پیدا کرنا آسان نہیں ہے چنانچہ جتنا ہی انھیں غور سے دیکھا گیا اتنے ہی انقلابی جذبات کی فراوانی ہوئی، اشتراکیت کا زور بڑھا، قومیت پر ناز کرنے کا موقعہ ملا۔ اور "درباری ذہنیت رکھنے والے" شاعروں اور ادیبوں کی تباہی کا زمانہ آ گیا۔ کیونکہ اب کان اُن نغموں کو سننے کے لئے بےچین نہیں جن میں زندگی کی آزادی کا اظہار نہ ہو اور طبقاتی تفریق کو ختم کر دینے کا مصمم ارادہ کروٹیں نہ لے رہا ہو۔

عوام کی بیداری شاعروں اور ادیبوں پر پوری طرح اثر انداز ہوئی، ایک طرف تو سیاسیات کا اُردو ادب پر اثر پڑنے لگا دوسری طرف مغربی علوم و فنون سے لوگوں کی دلچسپی بڑھنے لگی، کتابوں کے ترجمے کئے گئے اور ادب کی نئی تحریکوں، انداز بیان کی نئی شاہراہوں اور اظہار خیال کے جدید اسلوبوں کا پتہ چلا، اُن میں سے بعض بعض باتیں قابل اخذ و تقلید معلوم ہوئیں مگر اُن کی تقلید میں احتیاط سے کام لیا گیا۔ اسلوب بیان اور متنوع خیالات میں ایرانی شاعری کا بھی پرتو تھا ہندی شاعری کی بھی

جھلک تھی اور مغربی زبانوں کا بھی عکس تھا۔ یہی امتزاج خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گو اُردو کے اکثر شاعر اس امتزاج کو قائم نہ رکھ سکے، مگر لکھنؤ کے چند شاعر اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں خیالات کے اعتبار سے بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ اگرچہ اکثر شاعروں نے اپنا نقطۂ نظر بالکل ذاتی رکھا، پھر بھی اُن کے خیالات پر عوام کے جذبات و خیالات حاوی ہوتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض شاعر اپنی انفرادی شخصیت کھو بیٹھے اور عوام کی دنیائے خیال کا جزو بن گئے۔

اِسی سیاسی ماحول میں بیسویں صدی کا ادب تربیت پا رہا ہے، اس وقت یہ سوال اُٹھانا کہ لکھنؤ کے شعراء نے کوئی فنی خدمت انجام دی یا نہیں بالکل ایسا ہی ہے جیسے اقتصادیات کی کسی کتاب میں جمہوری حکومت کے مختلف نظریوں پر بحث و مباحثہ۔ پھر بھی چونکہ اب تک اردو شاعری دقیانوسی نظریوں کے ماتحت فنی قیود سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکی ہے۔ اس لئے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق جو چیزیں بیکار، بے ربط اور غیر منسلک نظر آتی ہیں اُن پر بھی روشنی ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔

لکھنؤ کی بدنامی اس وجہ سے بھی ہے کہ اُس نے ہمیشہ فنی عیوب و محاسن کا خیال رکھا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، زبان میں صفائی، اسلوب بیان میں تنوع، خیالات میں وضاحت، اظہار مطالب میں روانی اور سلاست، تشبیہات اور استعارات میں جدت اُن کا خاص حصہ رہا ہے۔ جس پر لکھنؤ بجا طور سے ناز کر سکتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں جو چیز خاص طور سے قابل ذکر ہے وہ لکھنؤ کا بلند پایہ ادبی رُجحان ہے۔ اُس نے جب سے دہلی کا علمی خزانہ میراث میں پایا اس وقت سے اس بات کی کوشش جاری رکھی کہ اُردو کو عوام کی زبان بنایا جائے۔ اور ایسے خیالات کو نظم کیا جائے جن سے عوام کو دلچسپی ہو اور جو عوام کی تفریح طبع کا سامان مہیا کر سکیں۔ ایک زمانہ تھا جب اس رُجحان کو سُوقیانہ اور عامیانہ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا، مگر ادبی امارت پرستی کا وہ دَور ختم ہوگیا۔ اب عام طور پر یہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ ادب کو عوام کے جذبات کی ترجمانی کرنا چاہیئے۔ اس بدلے ہوئے ماحول اور تبدیل شدہ فضا میں انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ شاعروں کی خدمات کا اعتراف کیا جائے جو اب تک نشانۂ ملامت بنے ہوئے ہیں۔ درحقیقت یہی اصحاب اُردو ادب میں ایک بڑے انقلاب کے بانی ہیں، کیونکہ انھوں نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کا عام فہم زبان میں بیڑا اُٹھایا ہے۔ چنانچہ موجودہ دَور میں حضرت آرزو کی "خالص اُردو" اپنے ساتھ ایک پیام انقلاب لائی ہے جس کی عظمت کا شاید آج اعتراف نہ کیا جائے لیکن ایک مشترک زبان کی بڑھتی ہوئی تحریک

اور "ہندستانی" کی مقبولیت دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری آیندہ نسلیں حضرت آرزو کو خراج تحسین دینے کے لئے آگے بڑھیں گی۔ مشترک زبان بننے کی صلاحیت موجودہ دور کی مفرّس اُردو یا سنسکرت شبدوں سے بھری ہوئی ہندی میں نہیں ہے۔ میں اپنے ہی مضمون کو جب پڑھتا ہوں تو بار بار سوچتا ہوں کہ کیا یہی مشترکہ زبان ہے؟ مگر ماحول سے میں بھی مجبور ہوں۔ بہرحال "خالص اُردو" نے ہمارے لئے وہ نہر بنا دی ہے جس میں اظہار خیال کی موجیں آنے والی صدیوں میں اُٹھا کریں گی اور ضروریاتِ زمانہ کے مطابق اُن میں مد وجزر پیدا ہوتا رہیگا۔ آرزو کی "سُریلی بانسُری" جو فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں چھاپی گئی ہے آپ ہی اپنی نظیر ہے۔

خالص اُردو کی تحریک ایک فنّی تحریک ہے جس کی صحیح قدر وقیمت کا اندازہ ایک فن کار ہی لگا سکتا ہے۔ خالص اُردو کی غزلوں کو دیکھکر زبان کے اس عبور کا پتہ چلتا ہے جو اس وقت عنقا کی مثال ہے۔ وہ آسان اور دلیسی الفاظ جو کبھی زبان زدِ خاص وعام تھے آج ہم اُنھیں بالکل ہی بھول گئے ہیں، اور وہ الفاظ رفتہ رفتہ مُردہ ہوتے جاتے ہیں اور فارسی، عربی اور سنسکرت کے "روڑے" اُن کی جگہ لے رہے ہیں ان میں چند ایسے الفاظ بھی ہیں جو بعض باتوں کو ایسی خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ کسی زبان کا کوئی لفظ اُن باتوں کو پُورے طور پر ادا کر ہی نہیں سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے شعر کو ملاحظہ فرمایئے

تیرے تو ڈھنگ ہیں یہی اپنا بنا کے چھوڑ دے ۔۔۔ وہ بھی بڑا ہے "باؤلا" تجھ کو جو پاکے چھوڑ دے

یا

اس "اندھیر نگری" میں بتّی نہ ڈھونڈھو ۔۔۔ جو کچھ ہے سو اپنی سمجھ کا اُجالا

"باؤلا" اور "اندھیر نگری" دونوں ایسے لفظ ہیں جن کے مطالب پر کوئی دوسرا لفظ حاوی نہیں ہو سکتا

حضرت آرزو کی خالص اُردو والی غزلیں ایک نئی چیز ہیں۔ کم سواد نقاد انھیں دیکھکر چیں بجبیں ہوتے ہیں اور مختلف اعتراضات کرنے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ خالص اُردو کیا بلا ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ ایک تو اُردو غزل یوں ہی قیود کے بوجھ سے دبی جاتی ہے اس پر یہ مزید قید عائد کرنا کہ فارسی یا عربی کا کوئی لفظ استعمال نہ ہو شاعری کی روح کو مردہ کر دینا ہے۔ مگر یہ حضرات درحقیقت نہ شاعری کی پیچ پیچ منزلوں ہی سے واقف ہیں اور نہ اُنھیں یہی معلوم ہے کہ اُردو کو ملکی زبان بنانے کے لئے کن اَن تھک کوششوں کی ضرورت ہے۔ اکثر اصحاب تو فن تنقید کی چند انگریزی کتابیں پڑھکر نقاد بن گئے ہیں، مگر ان کو کون سمجھائے کہ کسی ملک کی ادبیات پر تنقید کرنے سے پہلے اس پر عبور، تاریخ سے واقفیت، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی ماحول کا علم ضروری ہے۔ ان چیزوں سے قطع نظر جو تنقید ہو گی گمراہ کن ہو گی۔ حقیقی تنقید کے لئے ہمدردی اور تعمیری جذبہ اشد ضروری ہے ورنہ یہی کہنا پڑیگا

رحم اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو   کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بُو
شاعری اور منطقی بحثیں، یہ کیسا قیلِ عام   بُرِّشِ مقراض کا زلفوں کو دیتا ہے پیام
فکر کا جس کی حواسِ "ظاہری" پر ہو مدار   شاعری کے قصرِ مدہوشی میں پا سکتا ہے بار

بہر حال حضرت آرزو کی خالص اُردو کی غزلیں فنی حیثیت سے ایک زبردست لسانی تحریک ہونے کے علاوہ اظہارِ جذبات کے نئے راستے بھی نکال رہی ہیں۔ فارسی شاعروں کی تقلید میں ہم نے اظہارِ جذبات کے راستے محدود کر لئے تھے، مگر حضرت آرزو نے تمام بند دروازے کھول دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کا مصرع سنیئے، فرماتے ہیں "

"کاٹ رہا تھا میں گلا، کہتا تھا کوئی ہائیں ہائیں"

ہمارے کہنہ مشق اور پرانے ڈگر پر آنکھیں بند کر کے چلنے والے شاعر "کہتا تھا کوئی ہائیں ہائیں" کی جگہ "منع کر رہا تھا" یا "روک رہا تھا" نظم فرماتے۔ لیکن "کہتا تھا کوئی ہائیں ہائیں" میں جو بے ساختہ پن شدتِ جذبات، محاکاتی صداقت اور وسعتِ مشاہدہ ہے وہ کسی دوسرے جملے میں مل ہی نہیں سکتی۔

کچھ حضرت آرزو ہی پر موقوف نہیں بلکہ لکھنؤ کے دوسرے بلند مرتبہ شاعر بھی بیش بہا فنی خدمات انجام دے رہے ہیں، حضرت صفی کا یہ شعر پڑھئے:-

دنیا کا ورقِ ہیئتِ اربابِ ہنر ہے   اِک تاش کا پتّہ ہے کفِ شعبدہ گر میں

کیا اس مفہوم کو اس سے بہتر الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے؟ حضرت صفی کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا   ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

دوسرے مصرعے میں شاعر نے جو اندازِ بیان اختیار کیا ہے وہ نہ صرف انوکھا بلکہ فنی حیثیت سے ہمارے ادب میں ایک مستقل اضافہ ہے۔

حضرت اثر کی ذاتِ گرامی بھی مغتنم ہے، اور جو کچھ میں آج اُن کے متعلق کہنا چاہتا تھا وہ اس سے پہلے خود ہی ایک شعر میں نظم فرما چکے ہیں ؎

اثر ہے نام، وطن لکھنؤ، عزیز استاد،   نکالتا ہوں نئے راستے زباں کے لئے

اثر نے اپنے کلام سے اس دعوے کا مکمل ثبوت بہم پہونچایا ہے۔ یہاں کسی مخصوص شاعر کے کلام پر سیر حاصل بحث کا موقع نہیں ہے اس لئے صرف چند اشعار ہی پر اکتفا کی جائیگی، مثالاً ملاحظہ ہو:-

گلوں سے کہتے ہی کہتے نسیم مست ہوئی   ترے خرام کی رنگینیوں کا افسانہ

اس شعر میں جو نازک مضمون پیدا کیا گیا ہے وہ تو اپنی جگہ پر ہے لیکن اس خیال کو جن نُبک

لفظوں اور حسین رنگین پیرائے میں ادا کیا گیا ہے اُس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ "نسیم مست ہوئی"
ان تین لفظوں میں معانی کا ایک موآج دریا بند ہے۔ یہ طرز اثر کا خاص حصہ ہے۔ انکا دوسرا شعر ہے

تجھ پر نثار حسرتیں، حسرتیں کیسی؟ جنتیں　　　چھین لے اور لذتیں، لذتِ غم بڑھائے جا

جذباتی حیثیت سے قطع نظر اثر نے اظہار خیال کا ایک نیا راستہ نکالا ہے اور آنے والی نسلوں کو
یہ بتایا ہے کہ جب مختلف جذبات بیک وقت دل میں موجود ہوں تو اُن کو کس طرح ظاہر کیا جا سکتا ہے
یہ اختصار کی ایک حیرت انگیز مثال ہے، کیونکہ اس میں اختصار کا اختصار اور تفصیل کی تفصیل ہے
الفاظ تبدیل کر دیجئے اور مضمون خاک میں مل جائیگا۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے لفظوں میں یہ سب مفہوم
ادا بھی نہیں کئے جا سکتے۔ اثر کا ایک شعر اور ہے:-

یہ اپنی مستی دہ شیشہ کا ہے افسانہ　　　ستارے ٹوٹ پڑے چھوٹ پڑا جو پیمانہ

دوسرے مصرع میں اثر نے نرالی تشبیہ دی ہے، اور تشبیہ سے وہ کام نکالا ہے جو مصور کے قلم
اور ماہر نفسیات کی زبان سے بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اثر کا ایک شعر اور، اور لیس سے

محشر سے یوں چلے ہیں گنہگار جرم عشق　　　گویا انھیں میں بٹ گیا جتنا غرور تھا

"تخیلی محاکات" کی بہترین مثال ہے جرم عشق کی عظمت کا احساس رکھتے ہوئے اِن مجرموں کا کردار جن
لفظوں میں شاعر نے پیش کیا ہے وہ عرصہ تک یادگار رہیگا۔

زبان کے اعتبار سے لکھنؤ اس گئی گزری حالت میں بھی اقصائے ہند میں اپنا جواب نہیں رکھتا
حضرت آرزو لکھنؤ کے زبان دانوں کے سرخیل ہیں۔ ان کے اشعار پڑھنے سے ٹکسالی زبان کا معیار معلوم
ہوتا ہے، لکھنؤ کی زبان کی شیرینی، سادگی اور بے تکلفی ہر سننے والے کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ ذیل
میں آرزو کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

بھولے بن کر حال نہ پوچھو بہتے ہیں اشک تو بہنے دو　　　جس سے بڑھے بے چینی دل کی ایسی تسلی رہنے دو

بے موت میں مروں تمھیں آتی نہیں حیا　　　کیا چپ کھڑے ہو تیغ کو عریاں کئے ہوئے

وہ کہیں کہ آرزو کو مری غفلتوں نے مارا　　　ابھی ہم یہ بات کہتے تو نہ اعتبار ہوتا

خوف میں رسوائی کے جس کو در سے اُٹھائے دیتے ہو　　　جب وہ پھرے گا مارا مارا، پھر کس کا کہلائیگا

وہ روزہ جوانی کے زور اللہ اللہ　　　کہ جیسے اسی کا زمانہ رہے گا

ظرف خالی کو ٹھوکے دیکھے ٹھنکانے سے کیا؟　　　مُدعا تھی جب ہو کچھ نہ جو گدا لانے سے کیا؟

ہو چکے پتھر بھی تو دو باتوں میں موم ہو گئے　　　[illegible]

جو کہہ کے بھولتا ہو پھر انتظار اُس کا
اے دل کی سادہ لوحی صدقے ترے یقیں پر

دلواؤ نہ ضد، جبر سے بہتر ہے محبت
کٹتی ہے اگر بات تو چلتی ہے زباں اور

ہیں یہی ساقی جو بے پروائیاں
توڑ دیں گی بند بند انگڑائیاں

عشق پر بھی چھا گئیں رعنائیاں
اُف تری توڑی ہوئی انگڑائیاں

ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسب مراتب ہیں
لو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا، اُڑ کے چلا پروانہ بھی

بنے تھے اس لیئے بجلی کہ آنکھ جھپکا دو
بدل کے بھیس یہی رکھتے ہو سامنا کرتے

اس قسم کی سیکڑوں مثالیں حضرت صفیؔ اور اثرؔ کے یہاں بھی موجود ہیں۔

یہ اعتراض بھی اکثر بار بار دُہرایا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے شاعر اپنی تمام توجہ زبان پر مبذول رکھتے ہیں اور خیالات کی پروا نہیں کرتے، مگر اوپر جو اشعار نقل کئے گئے ہیں اُن میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جو صرف زبان کی خاطر کہا گیا ہو۔

یہ ضرور ہوا کہ شعرائے لکھنؤ شاہان اودھ کے دور میں شاعری کے محاسن ظاہری کی طرف زیادہ مائل ہو گئے تھے جس کی وجہ سے خارجی پہلو کچھ زیادہ نمایاں ہو گئے، چنانچہ وہ اشیاء کی ظاہری خوبیوں پر زیادہ نظر رکھتے تھے اور اُن جذبات کا اظہار نہیں کرتے تھے جو اُن کے دیکھنے سے خود ان کے دل میں پیدا ہوتے تھے مگر اس کے لیئے وہ ادب کے دربار میں سزا کے مستحق نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ کیونکہ شاعری سے زیادہ اصلاح زبان اُن کا مطمح نظر تھا۔ اور جب ایک عنصر پر زور دیا جائے گا تو دوسرے عناصر کا مدّھم پڑ جانا فطری ہے۔ لیکن اب شاعری کا داخلی پہلو زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے، چنانچہ آجکل لکھنؤ اور گرد و نواح کے شعرا جذبات کی تصویر کشی اور علم النفس اور فلسفہ کے دقیق مسائل کے حل میں مشغول ہیں۔ اور اب مضامین میں بھی کافی تنوع ہو گیا ہے۔ شاعری کے نظریہ میں بھی خاص تبدیلی ہو گئی ہے "جہان آرزو" میں حضرت آرزوؔ لکھتے ہیں سے

جو سخن ہو اک نیا پیغام ہو
وحی تو ممکن نہیں الہام ہو

اسی طرح اثرؔ نے رسالہ ادب بابتہ ماہ جنوری ۱۹۳۱ء میں ایک مضمون کے دوران میں لکھا ہے:۔

"شاعری جذبات راستی وحسن اعتدار کی انفعالی کیفیت کا اظہار ہے۔ پیکر جذبات کی روح رواں تخیل وتمثیل ہیں۔ الفاظ میں توازن وتناسب اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب خیال میں یکرنگی کے ساتھ تنوع بھی ہو۔ تخیل کی جولانگاہ کل کائنات اور شاعری کا مقصود

روح میں انبساط کی لہر دوڑانا اور اس کا ارتفاع ہے۔ شاعری فطرت اور رسم و رواج کے درمیان رشتۂ اتحاد قائم کرتی ہے۔ یہ بھی شاعری کا فیض ہے کہ مادی اور روحانی عالم کے مشاہدات سے ہم یکساں لذت اندوز ہوتے ہیں۔"

اس مضمون میں ابتک وزن و قوافی کی سختیوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ آرزو نے اپنے دیوان "جہان آرزو" کے مقدمے میں شعر کے چار عناصر ترکیبی بیان کئے ہیں (خیال۔ الفاظ۔ انداز بیان اور وزن عروضی) اس میں وزن عروضی کو چوتھا درجہ دیا گیا ہے۔ اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ تاہم اس میدان میں ابھی تک پہلے ہی کی طرح ہو کا عالم ہے ہاں جب کبھی کوئی شاعر ہندی اوزان میں کچھ نظم کرتا ہے تو دلچسپی کا کچھ نیا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔

لکھنؤ اور جذبات لکھنؤ کی خلقت ہمیشہ سے جذباتی مشہور ہے اور نزاکت تو اُن کی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی نظر آتی ہے۔ اسی لئے شعرائے لکھنؤ کے کلام میں آداب گفتگو نشست و برخاست وغیرہ کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ان پر تصنع کا الزام بھی عائد ہوتا ہے اگو انھوں نے نزاکتِ طبع کے جا بجا مظاہرے کئے ہیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے جذبات سے لاعلمی نہیں ہے اس عہد میں بھی چکبست۔ زوال۔ عزیز۔ جوش۔ آنند نراین ملا۔ حضرت صفی۔ شمیم کرہانی وغیرہ نے اپنی فلسفیانہ۔ مذہبی۔ قومی۔ اخلاقی اور سیاسی نظموں سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں ایک ہلچل سی مچادی ہے۔ اور اُردو شاعری کو دوسری قوموں کی شاعری کے دوش بدوش لاکر کھڑا کر دیا ہے اُن کے تمام جذبات میں اتنا تنوع ہے اور ہر جذبے کے متعلق اتنا لٹریچر فراہم ہو گیا ہے کہ اُن پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ فی الحال صرف اُن خصوصیات کا ذکر کر دینا مقصود ہے جو موجودہ ماحول کی پیدا کردہ ہیں۔

شعر اور جذبات کا باہمی ربط ایک واضح حقیقت ہے، ہمارا ہر فعل ایک جذبہ کا تابع اور ہر بات ایک جذبہ کے ماتحت ہے، مگر ہمارے اکثر جذبے غیر محسوس ہوتے ہیں اور ان کے بار بار طاری ہونے سے ان کا احساس فنا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے غیر محسوس جذبے شاعری کی بارگاہ میں باریاب نہیں ہو سکتے کیونکہ شاعری کو صرف ایسے جذبات کی ضرورت ہے جو اپنے اندر ایک برقی اور طلسمی کیفیت رکھتے ہوں اور جن کی انفعالی شان صاف طور سے نظر آ رہی ہو۔ یہ جذبات مشاہدے اور فکر و غور سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے ہی ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں ہمارے دماغ میں تجزیہ کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ اس چیز کے مختلف اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور وہ

مل کر دل پر کیا متحدہ اثر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دل بیچین ہو کر بہک جاتا ہے اور ذہن میں ایک ایسی خیالی تصویر قائم ہو جاتی ہے جس کے حُسن و قبح پر بحث کرنے کا عقل کو موقع ہی نہیں ملتا۔

اشیاء کی ماہیت دریافت کرنا شاعر کا کام نہیں بلکہ سائنس دانوں کا فریضہ ہے۔ شاعر تو شدّتِ جذبات سے اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی تحقیقات کر ہی نہیں سکتا ہے۔ اُس کا کام صرف اُن جذبات کا اظہار کرنا ہے جو ان چیزوں کے دیکھنے سے اس کے دل پر طاری ہوتے ہیں، وہ وارداتِ قلبی کا ترجمان ہے جس کے لئے دیکھنے والی آنکھیں، سوچنے والا دماغ، محسوس کرنے والا دل اور وجدانی زبان درکار ہیں، جتنا ہی وسیع اور غائر اس کا مشاہدہ ہوگا قوتِ تخیلہ کے معدن بھی اتنے ہی گوہر خیز ہونگے، دل کا احساس جتنا ہی شدید ہوگا، اور زبان میں اس کے بیان کی جتنی کیف پرور صلاحیت ہوگی اتنا ہی شعر کامیاب ہوگا۔

جذباتی شاعری کی ان خوبیوں کا احساس اُردو شاعروں میں انیسویں صدی کے تیسرے ربع کے آخری دَور سے پیدا ہونے لگا ہے۔ جب اُردو زبان ترقی کی اس منزل پر پہونچ گئی تو لکھنؤ کے مردم خیز خطّہ سے انیس نے علم سرداری بلند کیا۔ انیس نے جذبات نگاری میں نفسیاتی سچائیوں کے بیان پر خاص طور سے زور دیا۔ اور ہم بیسویں صدی کے شعراء کے کلام میں بھی انھیں کی پیغمبرانہ تصویر کشی کا عکس دیکھ رہے ہیں۔

قدماء کے کلام میں مایوس کن یکسانیت پائی جاتی ہے، ہر شعر میں ایک ہی جذبہ یعنی جذبۂ یاس کارفرما نظر آتا ہے اور بس۔ لکھنؤ نے جب نفسیاتی حقائق پر زور دینا شروع کیا تو ہمارے شاعروں نے جہاں تک ہو سکا اس خطرے سے بچنے کی کوشش کی، اور اُنھوں نے شاعری کے رجائی پہلو کو بھی اُچھالا اور منظرِ عام پر لاکر پیش کیا۔ چنانچہ لکھنؤ کے شاعروں نے کائنات کے ہر پست و بلند اور نیک و بد کا مطالعہ کرنا اور انھیں نظم کا جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ ان کے جذبات کے تنوع سے امید ہوتی ہے کہ اُن کی شاعری بہت دنوں باقی رہیگی صفی نے اپنے ایک شعر میں اسی بات کو کھلے الفاظ میں نظم کر دیا ہے:-

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

اب جب کبھی کوئی شعر سامنے آتا ہے تو یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں دلی جذبات کا اظہار ہے یا نہیں۔ اس قلب ماہیت کی وجہ یہ ہے کہ اب شاعروں کا ماحول تبدیل ہو گیا ہے جن کی نسبت جوش کو کہنا پڑا کہ ایسا شاعر ہونا چاہیئے کہ:-

راستے کا ذرّہ ذرہ جس کو دیتا ہو صدا نظم کرتا جا مجھے بھی شاعرِ رنگیں۔

کہاں تو زمانہ کی ناقدر شناسی کا دکھڑا رویا جاتا تھا اور کہاں شاعر یہ کہنے لگے :۔

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اگر ماحول اس طرح نہ بدل گیا ہوتا تو یہ شعر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ :۔

جسے میں گُل سمجھتا ہوں لطافت میں نزاکت میں
مذاقِ عام گلشن کا اُسی کو خار کہتا ہے (اعظم کریاتی)

مجھکو ادے نہ سر و ھوکے میں کہیں یہ حُسن بڑا ہی کافر ہے
اس جھوٹی دنیا میں مجھکو مغرور بنائے رکھئے گا (آرزو)

نشۂ مے مانگے کی چیز اس کی بھی کوئی ہستی ہے
جوشِ جوانی کیا کہنا مستی اپنی مستی ہے (آرزو)

یا جیسا کہ اثر نے کہا ہے :۔

جنبش لبوں کو کیا ہوئی ساغر چھلک گیا یہ کیف ہے شراب سی تقریر دیکھنا
وہ رات بھیگی ہوئی وہ کرا ہنا میرا ہر ایک وقت تو ایسا سماں نہیں ہوتا
جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی کچھ انھیں سے دل دیوانہ بہلتے دیکھا
جو سانس ہے رُکی ہے، جو آنکھ ہے لڑی ہے چھیڑا یہ آج کس نے افسانہ بےخودی کا
فلک کا بس نہیں جو جھوم لے جھک کر قدم میرے زمین کوئے جاناں لے رہی ہے امتحاں میرا

صفی کے یہاں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں، مثال کے لئے صرف تین شعر ملاحظہ ہوں :۔

افسانۂ یوسف میں تصویر کے دو رخ ہیں اک دست بداماں ہے اک سر بگریباں ہے
کل ہم آئینہ میں رُخ کی جھرّیاں دیکھا کئے کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے
بزمِ عشرت کا وہ نغمہ جس پر اُن کو ناز ہے غالباً ٹوٹے ہوئے دل کی مرے آواز ہے

عزیز مرحوم کے یہاں بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں :۔

اے ناشناس اہلِ وفا میں ترے نثار کیا سوچتا ہے خوں بھری تلوار دیکھکر
اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

آرزو نے جذبات نگاری میں حیرت انگیز کمال بہم پہونچایا ہے، مثال کے طور پر چند شعر دیکھئے :

جوشِ جنوں میں وہ ترے وحشی کا چیخنا بند اپنے ہاتھ سے درِ زنداں کئے ہوئے
اے ہوائے جاں فزا یہ خلد ہے یا کوئے دوست لے رہا ہوں سانس پر سانس آ رہی ہے بوئے دوست

مل کر دل پر کیا متحدہ اثر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دل بےچین ہو کر بہک جاتا ہے اور ذہن میں ایک ایسی خیالی تصویر قائم ہو جاتی ہے جس کے حسن و قبح پر بحث کرنے کا عقل کو موقع ہی نہیں ملتا۔

اشیاء کی ماہیت دریافت کرنا شاعر کا کام نہیں بلکہ سائنس دانوں کا فریضہ ہے۔ شاعر تو شدت جذبات سے اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی تحقیقات کر ہی نہیں سکتا ہے۔ اُس کا کام صرف اُن جذبات کا اظہار کرنا ہے جو ان چیزوں کے دیکھنے سے اس کے دل پر طاری ہوتے ہیں، وہ واردات قلبی کا ترجمان ہے جس کے لئے دیکھنے والی آنکھیں، سوچنے والا دماغ، محسوس کرنے والا دل اور وجدانی زبان درکار ہیں، جتنا ہی وسیع اور غائر اس کا مشاہدہ ہوگا قوت متخیلہ کے معدن بھی اتنے ہی گوہر خیز ہونگے، دل کا احساس جتنا ہی شدید ہوگا، اور زبان میں اس کے بیان کی جتنی کیف پرور صلاحیت ہوگی اتنا ہی شعر کامیاب ہوگا۔

جذباتی شاعری کی ان خوبیوں کا احساس اُردو شاعروں میں انیسویں صدی کے تیسرے ربع کے آخری دور سے پیدا ہونے لگا ہے۔ جب اُردو زبان ترقی کی اس منزل پر پہونچ گئی تو لکھنؤ کے مردم خیز خطہ سے انیس نے علم سرداری بلند کیا۔ انیس نے جذبات نگاری میں نفسیاتی سچائیوں کے بیان پر خاص طور سے زور دیا۔ اور ہم بیسویں صدی کے شعراء کے کلام میں بھی انھیں کی پیغمبرانہ تصویر کشی کا عکس دیکھ رہے ہیں۔

قدماء کے کلام میں مایوس کن یکسانیت پائی جاتی ہے، ہر شعر میں ایک ہی جذبہ یعنی جذبۂ یاس کارفرما نظر آتا ہے اور بس۔ لکھنؤ نے جب نفسیاتی حقائق پر زور دینا شروع کیا تو ہمارے شاعروں نے جہاں تک ہو سکا اس خطرے سے بچنے کی کوشش کی، اور انھوں نے شاعری کے رجائی پہلو کو بھی اُچھال اور منظر عام پر لا کر پیش کیا۔ چنانچہ لکھنؤ کے شاعروں نے کائنات کے ہر پست و بلند اور نیک و بد کا مطالعہ کرنا اور انھیں نظم کا جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ ان کے جذبات کے تنوع سے امید ہوتی ہے کہ اُن کی شاعری بہت دنوں باقی رہیگی۔ صفی نے اپنے ایک شعر میں اسی بات کو کھلے الفاظ میں نظم کر دیا ہے:۔

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے　　دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

اب جب کبھی کوئی شعر سامنے آتا ہے تو یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں دلی جذبات کا اظہار ہے یا نہیں۔ اس قلب ماہیت کی وجہ یہ ہے کہ اب شاعروں کا ماحول تبدیل ہو گیا ہے جن کی نسبت جوش کو کہنا پڑا کہ ایسا شاعر ہونا چاہیئے کہ:۔

راستے کا ذرہ ذرہ جس کو دیتا ہو صدا　　نظم کرتا جا مجھے بھی اے شاعر رنگیں

کہاں تو زمانہ کی ناقدر شناسی کا دکھڑا رویا جاتا تھا اور کہاں شاعر یہ کہنے لگے :۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اگر ماحول اس طرح نہ بدل گیا ہوتا تو یہ شعر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ :۔

جسے میں گل سمجھتا ہوں لطافت میں نزاکت میں
مذاق عام گلشن کا اسی کو خار کہتا ہے (اعظم کریاتی)

مجھکو ادے نہ سر دھو کے میں کہیں یہ حسن بڑا ہی کافر ہے
اس جھوٹی دنیا میں مجھکو مغرور بنائے رکھیئے گا (آرزو)

نشۂ مے مانگے کی چیز اس کی بھی کوئی ہستی ہے
جوش جوانی کیا کہنا مستی اپنی مستی ہے (آرزو)

یا جیسا کہ اثر نے کہا ہے :۔

جنبش لبوں کو کیا ہوئی ساغر چھلک گیا یہ کیف ہے شراب سی تقریر دیکھتا
وہ رات بھیگی ہوئی وہ کراہنا میرا ہر ایک وقت تو ایسا سماں نہیں ہوتا
جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی کچھ انھیں سے دل دیوانہ بہلتا دیکھا
جو سانس ہے رکی ہے جو آنکھ ہے لڑی ہے چھیڑا یہ آج کس نے افسانہ بے خودی کا
فلک کا بس نہیں جو جھوم لے جھک کر قدم میرے زمین کوئے جاناں لے رہی ہے امتحاں میرا

صفی کے یہاں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں، مثال کے لئے صرف تین شعر ملاحظہ ہوں :۔

افسانۂ یوسف میں تصویر کے دو رخ ہیں اک دست بداماں ہے اک سر بگریباں ہے
کل ہم آئینہ میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے
بزم عشرت کا وہ نغمہ جس پر ان کو ناز ہے غالباً ٹوٹے ہوئے دل کی مرے آواز ہے

عزیز مرحوم کے یہاں بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں :۔

اے ناشناس اہلِ وفا میں ترے نثار کیا سوچتا ہے خوں بھری تلوار دیکھکر
اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

آرزو نے جذبات نگاری میں حیرت انگیز کمال بہم پہونچایا ہے، مثال کے طور پر چند شعر دیکھئے :

جوش جنوں میں وہ ترے وحشی کا چیخنا بندا پنے ہاتھ سے درِ زنداں کئے ہوئے
اے ہو لئے جاں فزا یہ خلد ہے یا کوئے دوست لے رہا ہوں سانس پر سانس آ رہی ہے بوئے دوست

کیا چھٹے گا شوق کافر سے یہ پوشیدہ گناہ　　　دیکھ ہی لیتا ہوں آنکھیں بند کرکے سوئے دوست

نہ اک مذاق نہ اک جنس ہے نہ ایک زباں　　　ہوا ہے اور نہ ہوگا مزاج واں صیاد

الزام خامشی کیوں اُس نازآفریں پہ　　　بنتی ہے جنبشِ لب آکر شکن جبیں پہ

سمجھا ہے اس جنبش لب کا منشا　　　ابھی دوڑتا خون ٹھہرا رہے گا

تاخیر کی بنیاد ہے خود عجلتِ بے جا　　　جلدی ہے جو لکھنے کی تو رکتا ہے قلم اور

ٹوٹے چمک چمک کے ستارے اُمید کے　　　یہ ایک خواب تا بہ سحر دیکھتے رہے

بیخود موہانی کے دو شعر بھی اس ضمن میں قابل تذکرہ ہیں :-

ٹوٹی ہوئی ناؤ دیکھتا ہوں　　　دھارے کا بہاؤ دیکھتا ہوں

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے　　　کبھی لوٹے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

آلِ رضا نے کیا خوب کہا ہے :-

وہ پہلی چوٹ وہ احساس آمد آمدِ عشق　　　اُٹھا جو درد تو دل نے کہا مبارک ہو

طے ہو چکیں شکست تمنا کی منزلیں　　　اب اس کے آگے گریۂ بے اختیار ہے

سراج لکھنوی کے کلام کا عمق اور طرز ادا کی سلاست و روانی کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کے اشعار کے متعدد نمونے پیش کئے جائیں - افسوس اُن کے کلام کا مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا اس لئے صرف چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ۔

جانے والے تری بیگانہ وشی کے صدقے　　　دیکھ ادھر دیکھ کہ ہم سے بھی شناسائی ہے

حسنِ خوابیدہ اُٹھا انگڑائیاں لیتا ہوا　　　فطرتِ بیدار ہے یا صبح کا ہنگام ہے

مجبوریاں ہیں ہمدم، ناچاریاں ہیں ناصح　　　ہم خود نہیں تڑپتے، تڑپائے جا رہے ہیں

ڈوبنے والے لبِ آب بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو روک　　　چادریں پانی کی ہیں یہ دامنِ ساحل نہیں

رندی و مستی کے جذبات نظم کرنے میں لکھنو اپنا ثانی نہیں رکھتا، جگر نے بھی اس موضوع پر قیامتیں برپا کی ہیں :-

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف　　　میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ　　　میں اپنا شیشہ اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

اس سلسلہ میں جوش کی نظم "ناصح مشفق سے خطاب" ایک شاہکار ہے :-

تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ زنہار نہ پینا　　　یہ کیوں نہیں کہتے کہ خبردار نہ جینا

کس طرح نہ ڈوبی ہوئی نبضوں کو ابھاروں ــــ کیونکر نہ جڑوں دل کی انگوٹھی پہ نگینا
کیا عقل ہے کہتے ہو مجھے مائلِ پستی ــــ میں عرش پہ چڑھنے کو لگاتا ہوں جو زینا
واللہ کہ فیضانِ مئے ہوش رُبا سے ــــ انسان کو انسان سے نہیں رہتا ہے کینا
دن کو بھی وہی عقل ہے شب کو بھی وہی ہوش ــــ کوثر کی قسم موت سے بدتر ہے یہ جینا
کیا قہر ہے شب کو بھی نہ ڈھالوں مئے خوش رنگ ــــ دن بھر تو بہاتا ہوں میں بیچارہ پسینا
واللہ اگر دو ل نہ مئے ناب کے چھینٹے ــــ جلتا ہی رہے شب کو بھی جلتا ہوا سینہ
تم کس لئے جلتے ہو اگر آتشِ تر میں ــــ کھیتا ہے کوئی شخص جوانی کا سفینہ
اے ضابطۂ موسم و اوقات کے پابند! ــــ مے خانہ کی ہر رات ہے ساون کا مہینا
واللہ کہ یوں مے سے دمکتا ہے دل جوش ــــ الہام سے جس طرح جھلک اٹھتا ہے سینہ

لکھنؤ کی افادی شاعری | لکھنؤ کی افادی شاعری کا ذکر کرنے سے پہلے ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ افادیت سے کیا مراد ہے۔ مختصر لفظوں میں وہ شاعری افادی کہی جاسکتی ہے جو کسی ایسے مقصد کو پیش نظر رکھکر کی گئی ہو جس کا نتیجہ اُن لوگوں کے لئے فائدہ مند ہو جو شعر پڑھتے ہیں یا جن کے لئے وہ شعر کہا گیا ہے ادھر کچھ عرصہ سے فلسفیوں میں افادیت پسندوں (Pragmatists) کا حلقہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔ ان لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ جو علم ہمیں عملی نتائج سے بے نیاز بنا دے وہ سچا علم نہیں ہے۔ اس نوع کے ادیب اور شاعر اس شاعری کو افادی شاعری کہتے ہیں جو کسی اخلاقی، معاشرتی یا سیاسی مقصد کو پیش نظر رکھتی ہو۔

اِس قسم کی شاعری کی ابتدا حالی، آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی نے کی۔ اسمٰعیل میرٹھی نے اپنے نظریہ کو اپنی نظم "مروجہ شاعری" میں وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں :۔

سخنورانِ زماں کی بھی ہے یہی حالت ــــ کہ اس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑئیے زنہار
سوائے عشق نہیں سوجھتا انھیں مضمون ــــ سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اک طومار
تمام اگلے زمانے کا ہے یہ پس خوردہ ــــ کہ کر رہے ہیں جگالی وہ جسکو سو سو بار
نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگ حکمت و قدرت ــــ نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش و نگار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصول موضوعہ ــــ کہ جھوٹ موٹ کے بن جائیں ایک عاشق زار
صفت ہے دوست کی جلاد و ظالم و غدار ــــ ستم شعار و دل آزار بے وفا، مکار
ہے دلبروں کی بھی شامت نہ منہ رہا نہ کمر ــــ بجائے زلف کے دو اژدہوں کی ہے پھنکار

غریب شیخ یہ ہر دم دو لتیاں جھاڑیں ۔۔۔ کریں مساجد و کعبہ سے دُم دبا کے فرار
کہاں ہے ان کا ٹھکانا، کدھر ہے انکا مقام ۔۔۔ وہی ہے بیتِ صنم اور خانۂ خمّار
کریں گے اس قدر ایمان و دین کی توضیح ۔۔۔ کہ گویا ہیں کوئی ہفتاد پشت کے کفار
اگرچہ ہاتھ میں تسبیح لب پہ ہو توبہ ۔۔۔ بنیں گے شعر میں ہاں مے پرست و بادہ گسار

نہ کچھ خدا کا لحاظ اور نہ انبیا کا ادب
یہ اُن کی لغو بھری شاعری خدا کی مار

یہ تحریک جس نے مولویوں کے آغوش میں جنم لیا آگے چل کر عام تحریک ہو گئی، مگر رفتہ رفتہ پُرانے قدامت پرستوں نے پھر قدامت کی دیوی کے قدموں پر پھول چڑھانے شروع کئے۔ اور اس تحریک کو جس کی ابتدا خود انھوں نے کی تھی نوجوانوں کے لئے چھوڑ دیا۔ اب اس بیسویں صدی میں اس پر ترقی پسند مصنفین نے قبضہ جما لیا ہے، اور اُمید ہے کہ یہ تحریک جدید ترین اصولوں کی تقلید کرتی رہے گی۔

اخلاقی شاعری | اُردو زبان میں اخلاقی شاعری کا جو ضخیم مجموعہ موجود ہے اس کے سرسری مطالعہ کے لئے بھی کافی وقت درکار ہے۔ مگر اخلاقی نظریوں میں یہاں روز بروز نئے اختلافات پیدا ہو رہے ہیں اور پُرانے نظریئے جنھیں لوگ کبھی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اب صرف چند بوڑھے پرستاروں کے حافظوں میں محفوظ ہیں۔ مگر اُن کی حکومت اُن نوجوان دلوں پر سے اُٹھ گئی ہے جن پر آنے والی دنیا کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ پہلے اکبر الٰہ آبادی کہا کرتے تھے کہ :۔

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں ۔۔۔ کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

وہ یہ دُکھڑا رویا کرتے تھے کہ

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں ۔۔۔ اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

لیکن آج نہ اُن کتابوں کی ضبطی کا کوئی طرفدار ملے گا اور نہ اس پردہ داری پر اصرار کرنے والا۔ اشعار میں قناعت، صبر، توکّل، خاکساری کے سبق دینے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب اس کی جگہ "خودی" کے احساس اور دنیا کی تلخ حقیقتوں پر صبر کر کے بیٹھنے کی جگہ زندگی کی جدوجہد میں زور شور سے حصّہ لینے کی تلقین کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ

گو آفت و غم کے مارے ہیں ۔۔۔ ہم خاک نہیں ہیں تارے ہیں
اس جگ کے راج دُلارے ہیں
مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم ۔۔۔ (مجازؔ)

جہاں گذشتہ دور کے سے خیالات رکھنے والے شعراء یہ کہا کرتے تھے کہ:-

سرنگوں چار طرف گنبدِ مینائی ہے
واہ کیا حسن تقاضائے جبیں سائی ہے (مانی جائسی)

وہاں اب ہمارے شعراء یہ کہتے ہیں کہ:-

مذاقِ بندگی عصر کا تقاضا ہے نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر (جوش)

پہلے شعراء یہ سمجھتے تھے کہ اخلاقی اصول ترمیم و تنسیخ کے قابل نہیں، وہ ان اصولوں کو الہام و وحی تصور کرتے تھے اور انہیں تبدیلی کے قائل نہ تھے، اگرچہ کبھی کبھی کوئی آواز ایسی بھی سنائی دیتی تھی کہ ع

"زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"

مگر عموماً اس میدان کے سارے رہرو پرانی لکیر کے فقیر تھے۔ اب اُن کی جگہ آرزو جیسے شاعروں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ماحول کا ایک خاص اثر ہے، اور ہر عمل کا ایک محل اور موقع ہوتا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ

جو ترے عمل کا چراغ ہے وہی بے محل ہے تو داغ ہے
نہ جلا کے بیٹھ اسے صبح سے نہ بجھا کے سوائے شام سے

آج اعظم کے لئے یہ سوچنا اور یہ سوال کرنا ممکن ہو سکا ہے کہ:-

ملوں میں غیر سے طرزِ سلوکِ یار کہتا ہے
اب اس موقع پہ تو کیا لے دلِ خوددار کہتا ہے؟

ورنہ پہلے تو یہ تصور بھی شاعر کی اخلاقی دنیا میں گناہ تھا۔

پہلے شاعر ماضی کی یاد سے دل بہلاتے ہوئے کہتا تھا کہ:-

یادِ ایام کہ بے رنگ تھی تصویرِ جہاں دستِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں (حالی)

مگر اب شاعر پریشان ہو کر کہتا ہے کہ:-

غلعتِ نو زندگانی کو پہنانا چاہیئے قصۂ ماضی کو اک دم بھول جانا چاہیئے (شمیم کرہانی)

غرض اخلاقی شاعری کا معیار بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے اور خشک اخلاقی نظریئے فراموش ہوتے جاتے ہیں۔

آنند نرائن ملا کا نام ایسے شاعروں کی فہرست میں سب سے پہلے لکھا جائے گا جو ہمارے سامنے ایک بلند معیار اخلاق پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں اپنے نظریوں کی تشریح بہت وضاحت سے کی ہے۔ یہ نظم ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ چند بند درج ذیل ہیں:-

جادۂ تاریک طے کر اور منزل دیکھ لو پھر طوفاں سے گذر مینارِ ساحل دیکھ لو

فکرِ رنج و مسرت کر جلوۂ دل دیکھ کر　　مثلِ مجنوں بھول جا صحرا کو محمل دیکھ کر
آرزوؤں کو بنا لے ترجمانِ زندگی
اپنے دل کے ہاتھ میں دیدے عنانِ زندگی

مستقل اپنے ارادوں پر مثالِ کوہ بن　　جی میں آ جائے تو صحرا کو بنا رشکِ چمن
ولولوں کو رکھ مثالِ بحرِ پیہم موجزن　　مشکلیں ہوں لاکھ آنے دے نہ ابرو پر شکن
عاشقِ صادق مآلِ شوق سے ڈرتا نہیں
رہروِ کامل کبھی مڑ کر نظر کرتا نہیں

اپنے سینے کو بنا اک کشتِ زارِ آرزو　　خوں کے ہر قطرے سے پیدا کر شرارِ آرزو
دل وہی دل ہے رہے جو بے قرارِ آرزو　　زیست وہ اچھی جو ہو جائے نثارِ آرزو
لب تمناؤں کے اپنے چوم اے دل بڑھ کے تو
آسماں سے توڑ لا تارے فلک پر چڑھ کے تو

دل کو دے درسِ جنوں اور قابلِ زنجیر کر　　مکتبِ ہستی میں اس کو خوگرِ تعزیر کر
بندۂ تدبیر بن کر شکوۂ تقدیر کر　　آرزو کی قبر پر امید پھر تعمیر کر
اپنی ہستی کی کمر کس اور خدا کا نام لے
زندگی کی جد میں ناکامیوں سے کام لے

یاس کی محفل میں ارمانوں کو جانے ہی نہ دے　　اپنی صورت ناامیدی کو دکھانے ہی نہ دے
آتشِ دل آبِ حسرت سے بجھانے ہی نہ دے　　کچھ بھی ہو چتون پہ لیکن میل آنے ہی نہ دے
نالۂ دل میں بھی اندازِ ترنم ہی رہے
مثلِ گل دل خون ہو لب پہ تبسم ہی رہے

اسی طرح ملا کی مشہور نظم "عیسیٰ" بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اُن کی دوسری نظموں میں بھی اسی طرح کی اخلاقی تعلیمات موجود ہیں۔ لیکن اس جگہ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ ڈاکٹر علیم سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین نے ایک مرتبہ اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ "شاعری جب خطیبانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے تو اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ جب شاعر ناصحانہ انداز میں یہ کہنا شروع کرتا ہے کہ ہم کو یہ کرنا چاہیے اور وہ نہ کرنا چاہیے تو انسان کی آزاد اور مغرور فطرت بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔" ملا کی مندرجۂ بالا نظم میں یہ بات ضرور پائی جاتی ہے۔ مگر دو وجہوں سے ہم انھیں قابلِ معافی سمجھتے

ایک تو یہ اُن کی ابتدائی نظم ہے اور بعد کی نظموں میں انھوں نے اس بات کو محسوس کر کے اس سے احتراز کیا ہے۔ دوسرے ظاہر بین نگاہوں کو تو یہ خطابت معلوم ہوتی ہے مگر جب غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں یہ جذبات عرصہ سے بھرے ہوئے تھے۔ یکایک وہ ان کی شدت سے مجبور ہو کر برس پڑا ہے، گو "آرٹ" کے معروف تخیل نے نظم کو خطابت کا رنگ دیدیا ہے۔

مولانا حسرت موہانی جنھوں نے اپنی زندگی سیاسی ہنگاموں میں بھی اسی طرح گزاری ہے جس طرح شعر گوئی میں۔ اس عہد کے ممتاز معلم اخلاق مانے جاتے ہیں، اُن کے کلام میں ایک نیا فلسفۂ عمل و حرکت ملتا ہے، جو ذیل کے چند شعروں سے اچھی طرح واضح ہوجائے گا:۔

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان روشنیٔ ضمیر سے عقل سے اجتہاد کر
حق سے بقدرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گریز اس کو نہ پیشوا سمجھ اُس پہ نہ اعتماد کر
خدمتِ اہلِ جور کو کر نہ قبول زینہار فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر
غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

اگرچہ حسرت کے یہاں بھی اکثر پرانے شاعروں کی طرح تلوّن مزاجی ہے جس کا ثبوت خود اُن کی سیاسی زندگی سے بخوبی ملتا ہے۔ چنانچہ یاس کی اس شدید مخالفت کے باوجود وہ مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں، یہ شعر اُن کی اسی ذہنیت کی غمازی کرتا ہے کہ:۔

ہم نے یہ مانا کہ یاس کفر سے کمتر نہیں پھر بھی ترا انتظار دیکھئے کب تک رہے

جوش ہندوستانی زبان کے شاعروں میں "شاعرِ انقلاب" مانے جاتے ہیں لیکن بعض اوقات اُن کا نظریۂ اخلاق بھی امارت پسندوں کے نظریہ سے مشابہ ہوجاتا ہے۔ مثلاً اپنی نظم "چادر کی بھیک" میں وہ اُس سماج کے نظام کو تباہ کر دینے کے قابل نہیں بتاتا جو کڑکڑاتے جاڑے میں ایک بڑھیا کے لئے ایک چادر مہیا نہیں کر سکتا بلکہ اس پر ماتم کرتا ہے کہ خود اس کے پاس ایک چادر نہیں کہ اس بڑھیا کو اڑھا سکے، مگر پھر بھی آخری شعر میں اُنھوں نے اپنے کو سنبھالا ہے اور ایسا اندازِ بیان اختیار کیا ہے جو سوسائٹی کے لئے تازیانۂ عبرت ہے۔ یہ چھوٹی سی نظم خلافِ معمول بہت سہل زبان میں لکھی گئی ہے، اس لئے اسے بھی نیچے نقل کرتا ہوں:۔

معاذ اللہ اس شدت کی سردی — نہیں سا چڑھتا کسی صورت سے پارا
ترشح ہو رہا ہے ہلکا ہلکا — دھوئیں میں گم ہے دریا کا کنارا
صدا یہ دے رہی ہے ایک بڑھیا — کہ بابا میں بہت ہوں بے سہارا
ہوائیں چل رہی ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی — اڑھا دو کوئی اک چادر خدارا
مدد میں کر سکوں لے جوش کیونکر — کہ خود گردش میں ہے میرا ستارا
فقط ہلکی سی اس بڑھیا کو چادر — خدایا، داورا، پروردگارا

احسان بن دانش جو پنجاب میں رہتے رہتے پنجابی سمجھے جانے لگے ہیں اصل میں یو۔پی، کے رہنے والے ہیں، اور ان کی شاعری میں جہاں تک انداز بیان اور سلاست زبان کا تعلق ہے صاف طور پر لکھنؤ کی شاعری کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے بھی کئی اخلاقی نظمیں لکھی ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ کہیں بھی اُنھوں نے خطیبانہ رنگ اختیار نہیں کیا ہے۔ ان کی مشہور نظم "تین جنٹلمین" میں اُنھوں نے آدھی رات کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے

محوِ خواب ناز تھا جاگیرداروں کا غرور — اب نہ آتی تھی غلاموں کی صدائے جی حضور

لیکن ان کے ذہن میں بھی شرافت کے متعلق قدامت پرستوں کا خاص تصور قائم ہے۔ چنانچہ انھوں نے تین جنٹلمینوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ:۔

پھر گئی تھی ان کو قسمت ان بنوں میں چھوڑ کر — بیٹھ جاتی ہے شرافت جس جگہ دم توڑ کر
مفلسی کی ان چٹانوں سے تھا ان کا سامنا — جن سے ہو جاتا ہے مشکل دین و ایماں تھامنا

شاعر کے دل میں صرف شرافت ہی کے دم توڑنے سے درد نہیں اُٹھتا بلکہ اُس کو یہ تصوّر بھی ڈراؤنا اور بھیانک معلوم ہوتا ہے کہ غریبی اپنی انتہائی حد کو پہونچ کر انسان کو دین و ایمان سے بھی غافل کر دے گی۔ انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے پیش نظر انسانوں کی مفلسی سے اتنا متاثر نہیں ہے جتنا اس خوف سے کہ دین کی بقا مشکل ہو جائیگی۔ ان سب کے باوجود احسان کی جو چیز ان تمام لغزشوں کی تلافی کر دیتی ہے وہ ان کا باغیانہ نظریہ ہے جو پنجاب کی فضاؤں میں اکثر دب تو جاتا ہے مگر جسے شاعر چھپا بھی نہیں سکتا۔ اس کی جیتی جاگتی مثال اسی نظم کا یہ شعر ہے:۔

ملک والے یوں ہوں اپنے ملک میں روٹی سے تنگ
دیکھو چھڑ جائے نہ زرداروں اور بھوکوں میں جنگ

اس سلسلہ میں یہ کہنا غالباً بیکار ہوگا کہ اُردو کے تمام شاعروں نے ایسے تمام مذہب پرستوں سے

اظہار بیزاری کیا ہے جو گندم نما جو فروش ہوتے ہیں۔ ریا کاری کو یہ لوگ بہت بڑا گناہ سمجھتے رہے
آثر نے کیا خوب رُباعی کہی ہے ؎

دوزخ دُنیا ہوئی ہے مکاروں سے — شرمندہ معصیت ہے کرداروں سے
مذہب پردہ ہے جن کی غداری کا — اللہ کی پناہ! ایسے دینداروں سے

تقدیر کا اعتقاد اور ایسا اعتقاد جو تدبیر سے بے نیاز کردینے کی گھات میں رہتا ہو خدا جانے کہاں سے اُردو کے تمام شاعروں کے دماغوں پر مسلط ہوگیا ہے۔ آرم لکھنوی کا شعر ہے کہ

سعی ہے بیکار آؤ بیٹھ کر روئیں آرم — پائے شل اُٹھتے نہیں اور دُور ہے منزل ابھی

یا اسی طرح آثر کی ایک رباعی ہے کہ

جو راہ چلے ہم وہی تقدیر چلی — کشتی سوئے ساحل صفت تیر چلی
ناگاہ وہ طوفان حوادث اُٹھا — تقدیر چلی اور نہ تدبیر چلی

مگر ان تعلیمات کے عام اور ہمہ گیر ہونے کے بعد بھی رملا اسکی ہمت رکھتا ہے کہ وہ بلند آہنگی کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ ع "بندۂ تدبیر بن کر شکوۂ تقدیر کر"

اصلاح معاشرت اور شاعری

جب سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ شاعری کا کام صرف دل کا بہلانا نہیں، بلکہ نوع انسانی کے لئے فائدہ پہونچانا بھی ہے اُس وقت سے کئی شاعروں نے معاشرتی اصلاح پر دھیان دینا بھی شروع کیا ہے۔ معاشرت کی اصلاح اسی فلسفہ کے ماتحت کی جاسکتی ہے جو سوسائٹی کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہو۔ ہاں اگر معاشرت میں اصلاح کی جگہ انقلاب پیش نظر ہو تو شاعر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ سماج کے مروجہ فلسفہ کی پابندی کرے۔ وہ آزاد ہے کہ جس فلسفہ کی چاہے تلقین کرے۔ ہندوستانی شعرا میں عام طور سے یہ ہمت مفقود رہی ہے۔ ادھر سات آٹھ برس سے البتہ زمانہ کی بدلی ہوئی ہوا نے انھیں کچھ جری بنا دیا ہے، مگر اب بھی اُن میں پوری طور پر جرأت نہیں آئی ہے۔ دو ایک مستثنیات ضرور ہیں مگر اس سے کوئی عام قاعدہ نہیں بن سکتا۔

معاشرتی اصلاح کا بیڑا سب سے پہلے حالی اور آزاد نے شعر کے ذریعے اُٹھایا تھا۔ اُن کا میدان عمل بہت تنگ تھا رفتہ رفتہ متاخرین اس دائرہ کو وسیع کرتے گئے اور چکبست کے زمانے تک تو گویا رُت ہی بدل چکی تھی۔ اُن کی نظم "پھول مالا" کو دیکھئے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے — خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز
رُخ سے پردے کو ہٹایا تو بہت خوب کیا — پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز

لیکن اسی کے ساتھ کس شد و مد کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ

خاک میں دفن ہیں مذہب کے پرانے کھنڈر تم یہ سوئے ہوئے فتنے نہ جگانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے راگ ایسا کوئی ان کو نہ سکھانا ہرگز

اکبر الہ آبادی اس کے خلاف جدت پسندوں کی ہر بات قابل مضحکہ سمجھتے تھے، یہی نہیں بلکہ وہ نیتوں پر بھی حملے کر جاتے تھے[1]۔ مثلاً کہتے ہیں کہ

کچھ غرض اور ہے احباب نہ اس شک میں رہیں بس یہ ہے شوق کہ پبلک کی جھکا جھک میں رہیں
نہیں منظور نمازوں میں گذاریں راتیں ہاں کمیٹی ہو تو الجھے ہوئے بک بک میں رہیں
نغمۂ مرغ سحر سے نہیں انجن کو غرض پیٹ انگاروں سے بھر لیجئے بھک بھک میں رہیں

جوش کی اکثر نظمیں اصلاح معاشرت کے نصب العین کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہیں، ان کی نظم "ذاکر سے خطاب" اس اعتبار سے کامیاب ترین ہے، اس میں انھوں نے انقلابی نظریے پیش کئے ہیں، جب یہ نظم لکھی گئی تھی تو اخبارات کے کالم اس کے جواب میں سیاہ کئے گئے تھے اور منبروں کی بلندی سے بڑے غیظ وغضب کا اظہار کیا گیا تھا، مگر اس نظم نے خاطر خواہ نتائج پیدا کئے اور بڑی حد تک طرز ذاکری میں صحیح طریقہ کی اصلاح شروع ہو چکی ہے

اسی طرح جوش نے اس رسم کا بھی مذاق اڑایا ہے کہ جب ریل کسی دریا کے پل پر سے گزرتی ہے تو مذہبی لوگ دریا میں پیسے پھینک دیا کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ

اے مسافر پل سے گنگا کے گزرتی ہے جو ریل پھینکتا ہے کس لئے پیسے یہ کیا کرتا ہے کھیل

جوش کو آج کل کے طالب علموں سے بھی شکایت ہے کہ انھوں نے "نسوانیت کی ہر رنگین ادا سیکھ لی ہے"۔ وہ نوجوانوں کو میدان عمل میں سرگرم کار دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کی "نسوانی معاشرت" کے سخت مخالف ہیں۔ اس موقع پر وہ بہت تند و تیز طنز سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

نازکی کا اقتضا پتلی چھڑی باندھے ہوئے شوق کنگن کا کلائی میں گھڑی باندھے ہوئے

اور وہ نوجوانوں سے سوال کرتے ہیں کہ ع "نلے میں قربان رن میں نکلوگے اسی انداز سے"

[1] کون کہہ سکتا ہے کہ یہ حملے اکثر و بیشتر حق بجانب نہیں ہیں (ا۔ نہ)

اپنی مشہور نظم "کمسن کے لئے موت ہے شوہر کا بڑھاپا" میں اُنھوں نے ہندوستان کی اس قبیح رسم کے خلاف بھی پُورا زورِ قلم صرف کیا ہے کہ یہاں بعض اوقات شادی میں عمر کے تفاوت کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ اور نوجوان لڑکیوں کی زندگی کو جہنّم کا نمونہ بنا دیا جاتا ہے یہ رسم رفتہ رفتہ اُٹھتی جا رہی ہے پھر بھی ابھی باقی ہے اور اسی لئے جوشؔ کو ایسی نظم کہنے کی ضرورت ہوئی۔ "فتنۂ خانقاہ" میں اُنھوں نے ریاکار صوفیوں کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے اور صاحبانِ فہم کو یہ غور کرنے کی دعوت دی ہے کہ کیا اس صورتِ حال کو اسی طرح باقی رکھنا چاہئیے؛

سیاسی شاعری سیاسی تحریکوں نے ہماری شاعری پر جو اثر ڈالا ہے اُس کا ایک مختصر سا خاکہ میں اس مضمون کے شروع میں پیش کر چکا ہوں۔ اب صرف اُن کے ارتقا سے بحث کروں گا سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے اس بیس سال کے قلیل عرصہ میں جس طرح ہندوستانی سیاست نے کئی رنگ بدلے ہیں اسی طرح شاعری بھی چولے بدلتی رہی ہے۔ ایک چیز جس کا میں نے مضمون کے حصۂ اول میں ذکر نہیں کیا ہے وہ مسلمانوں کا سیاسی رُجحان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان ابتدا سے ملک کی تحریکِ آزادی میں انفرادی طور پر شامل رہے، مگر اجتماعی طور پر وہ صرف تحریکِ خلافت ہی کے سلسلے میں کانگریس کے قومی پلیٹ فارم پر یکجا ہوئے۔ پہلے تو جو قوم سب سے زیادہ انگریزوں سے نفرت کرتی تھی اور جذبۂ انتقام سے لبریز تھی وہ مسلمان ہی تھے، مگر رفتہ رفتہ سر سیّد اور مولانا نذیر احمد کے سے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کو برطانیہ کی دوستی کا سبق پڑھانا شروع کیا۔ علی گڑھ کالج سرکاری حیثیت سے (Muslim mass contact (Centre) مسلم ربطِ عوام کا مرکز بن گیا۔ اس لئے وہ سرکاری حکومت کے اُلجھاوے میں پڑ کر پُرانی باتیں بھول گئے۔ لیکن خلافت کی تحریک کے سلسلے میں ہندوستان کے دونوں بڑے فرقوں نے برطانوی سامراج کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا۔ لیکن یہ تحریک چونکہ سیاسی سے زیادہ مذہبی تھی اس لئے مصطفےٰ کمال پاشا کے عزم و استقلال کو دیکھ کر مسلم لیڈروں نے اس تحریک کی کامیابی سے مایوس ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس عرصہ میں مسلمانوں کی اقتصادی اور سیاسی حالت انتہائی پستی کو پہونچ چکی تھی۔ یاس اور قنوطیت اُن کو گھیرے ہوئے تھی۔ فطری طور سے اقبالؔ کے فلسفۂ خودی نے اور "پین اسلامزم" کی تحریک نے انھیں اپنا گرویدہ بنانا شروع کیا۔ لیکن عوام کی حالت اقتصادی حیثیت سے روز بروز گرتی ہی جا رہی ہے۔ اس لئے اب ان نغموں میں بھی اُن کے لئے دلچسپی کا کوئی سامان باقی نہیں رہ گیا اور وہ کھُلّم کھُلّا ایسے پلیٹ فارم پر جمع ہونے کے لئے تیار ہیں جو سامراجی

نظام اور سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے میں اُن کا مددگار ثابت ہو۔ یہ تمام رجحانات صاف طور سے شاعری میں ظاہر ہیں۔

اکبر کی طنز سے بھری ہوئی ظریفانہ شاعری ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً برٹش راج کی خوبیاں بیان کرتے کرتے کس خوبی سے نظم کو ختم کرتے ہیں :۔

جب اتنی خوبیاں موجود ہیں یہاں اکبر تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اسکے ڈیم فول بھی ہے

یا اس خیر خواہی کی وجہ کتنی نفسیاتی بتائی ہے جو برطانوی سامراج کو ہندوستان میں اپنے ماننے والوں سے بطور خراج ملتی ہے۔ اکبر کے نزدیک خیر خواہی وہ ہے جو اس لئے ہو کہ ہم جس کی خیر خواہی کرتے ہیں وہ اس کے قابل ہے، اس کے اعمال و افعال اور اس کا طریق کار اتنا پسندیدہ ہے کہ اس کی بد خواہی کا تصور بھی نہیں آسکتا۔ مگر یہ بھی کوئی خیر خواہی میں خیر خواہی ہے کہ صرف اس لئے حضور سرکار کرتے ہیں کہ اگر نہ کریں گے تو سزا بھگتیں گے، وہ کہتے ہیں کہ :۔

جو خرد مند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات خیر خواہی وہ نہیں جو کہ ہو ڈر سے پیدا

یا اس بات کو کتنے لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ برطانوی سامراج کے حامی ہندوستانیوں کو تباہی کے گھاٹ اتارنے سے پہلے اُن پر ایسا جمود اور بےحسی طاری کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ یہ محسوس بھی نہ کر سکیں کہ اُن کا گلا کاٹا جا رہا ہے ؎

قتل سے پہلے ہے کلوروفارم شکر ہے اُن کی مہربانی کا

اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ دوسری قوموں پر جب کوئی بیرونی طاقت اپنا قبضہ جمانا چاہتی ہے تو اس کے خلاف انتھک کوششیں کرتے ہیں مگر ہندوستانی خود اس غلامی کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ؎

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

اکبر کو اس کا بھی صدمہ ہے کہ یورپ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام ایشیا کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور اس عظیم الشان براعظم پر بسنے والی ہر قوم نیند میں مست پڑی ہے ؎

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی

وہ ہندوستانیوں کی غفلت کا ہر ایک جگہ ماتم کرتے ہیں، اُن کے آپس کے نفاق پر آنسو بہاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس سے بڑے بڑے کاموں کے لئے بنائے گئے ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنا مرنا

یہ کہاں کی عقلمندی ہے ؎

بنائے ملت بگڑ رہی ہے لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں ۔۔۔ مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا ابھر رہے ہیں
کٹی اگر اتحادِ ملت ہوئیں رواں خونِ دل کی جوئیں ۔۔۔ ہم اس کو سمجھے ہیں آبِ صافی نہا رہے ہیں نکھر رہے ہیں
قفس ہے کم ہمتی کا جس میں پڑے ہیں کچھ پردہ ہائے رنگیں ۔۔۔ اسی پہ مائل ہے طبعِ شاہیں نہ بال ہیں یاں نہ پر رہے ہیں

مولانا شبلی نعمانی زیادہ تر ایک نثار، مورخ اور تنقید نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں، اور عام طور پر لوگ یہ کم جانتے ہیں کہ وہ شاعر بھی تھے، مگر وہ شاعر تھے اور انھوں نے شاعری کے ذریعے بہت ہی مفید خدمتیں انجام دی ہیں۔ اُن کی نظمیں اکثر سیاسی ہیں اور انھوں نے دل کھول کر اپنے سیاسی خیالات کا نڈری سے اظہار کیا ہے۔ مثلاً "احرار" کے متعلق کہتے ہیں کہ

یہ اعتراض آپ کا بیشک صحیح ہے ۔۔۔ "احرار" قوم میں ہیں بہت خامیاں ابھی
چلتے ہیں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ ۔۔۔ گم گشتہ طریق ہے یہ کارواں ابھی
زود اعتقادیاں ہیں، تلون ہے، وہم ہے ۔۔۔ ہو جاتے ہیں ہر ایک سے یہ بدگماں ابھی
دل میں نہ عزم ہے نہ ارادوں میں ہے ثبات ۔۔۔ جھیلے نہیں ہیں معرکۂ امتحاں ابھی
بے اعتدالیاں ہیں ادا کے کلام میں ۔۔۔ باہر ہے اختیار سے ان کی زباں ابھی
ہر دم ہیں گو مسائلِ ملکی زبان پر ۔۔۔ ان میں سے ایک بھی تو نہیں نکتہ داں ابھی
یہ سب بجا درست مگر سچ جو پوچھیئے ۔۔۔ جو کچھ کہ ہے یہ ہے اثرِ رفتگاں ابھی
چلنے میں لڑکھڑاتے ہیں ایک اک قدم پہ پاؤں ۔۔۔ چھوٹے ہیں قیدِ سخت سے یہ سخت جاں ابھی
آئے کہاں سے قوتِ رفتار پاؤں میں ۔۔۔ کچھ بیڑیاں ہیں پاؤں کی بندِ گراں ابھی

غوں غاں ہے کچھ مباحثِ ملکی نہیں، ہیں یہ
اک طفل ہے سیاستِ ہندوستاں ابھی

مولانا شبلی نے کئی برس پہلے مسلم لیگ کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہی آج بھی حرف بحرف صحیح نظر آتی ہے، جو کہہ گئے وہ پتھر کی لکیر ہو کر رہ گیا۔ اتنا زمانہ گزرا، فضا بدل گئی مگر مسلم لیگ نہ بدلی اُن کی نظم اس قابل ہے کہ اس کا بغور مطالعہ کیا جائے ؎

پختہ کاروں کے لیے آلۂ تسخیر ہے یہ ۔۔۔ نوجوانوں کو صلائے طمعِ خام بھی ہے
رہنمایانِ نو آموز کا ہے مکتبِ درس ۔۔۔ زینۂ فخر و نمائشگریِ عام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں ۔۔۔ محسنِ قوم بھی ہے خادمِ حکام بھی ہے

ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی جس طرح صرف میں اک قاعدہ ادغام بھی ہے
اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا ساماں ہے درست ورقِ سادہ بھی ہے کلکِ خوش اندام بھی ہے
یہ تو سب کچھ ہے مگر ایک گزارش ہے حضور گرچہ یہ سوء ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے

مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے

ظریف مرحوم ظریفانہ شاعری کرتے تھے لیکن اسی طرز خاص میں سیاسیات کے نکتے بیان کر جاتے تھے۔ اُن کی نظم "افیونیوں کا رجز" بہت مشہور ہے جو انھوں نے جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء" کے زمانے میں کہی تھی، اور چھپتے ہی اس قدر مقبول ہوئی کہ ہر زبان پر جاری تھی۔ اسکے چند شعر یہ ہیں :-

ہم لوگ ہیں افیونی جب رنگ جما دیں گے جرمن ترے نقشے کو مٹی میں ملا دیں گے
برلن ہی میں دم لیں گے واللہ جو چڑھ دوڑے افیون کے منتکی کی جب باگ اٹھا دیں گے
تو ہم سے بہادر یا ہم تجھ سے بہادر ہیں پلنگ سے ذرا چونکیں پھر تجھکو بتا دیں گے
میکسم اسے سمجھے گا لشکر ترا اے جرمن ہم ڈیڑھ تھمے حقے کی گڑگڑ جو سنا دیں گے
ہے گولیاں کھانے کی دن رات ہمیں عادت افیون کی ڈبیا تو دیکھے تو دکھا دیں گے
سرکار کے دشمن کو ہم کوس کے کھا لیں گے اور اپنے تصور سے نام اُسکا مٹا دیں گے
رستم سے سوا طاقت ہو جائے گی ہم سب میں جب چائے میں بالائی تھوڑی سی ملا دیں گے
آنے تجھے ہم ڈھیلے ماریں گے ایلے جرمن خاکی تری وردی کو مٹی میں ملا دیں گے
لا اپنے کروزر کو دیکھیں تو وہ کیسا ہے ہم گومتی میں ڈونگیا پہ چڑھ چڑھ کے بھگا دیں گے
بلجم سے کہو تیرا جب ملک ملے تجھکو ہم اندرہِ ہمدردی کچھ اور بڑھا دیں گے
دعدوں کو ہمارے تو سچ جان کے جیکارہ لے تو سہی برلن بھی ہم تجھ کو دلا دیں گے
ہم روس سے ناخوش تھے اب اُس سے بہت خوش ہیں ٹھیکے پہ جو آئے گا افیون پلا دیں گے
شاباش ہے اے اٹلی لینا تو مرے شیرا جرمن سے لڑے جا تا ہم لوگ دعا دیں گے
ترکوں سے کوئی کہدو کیوں لڑتے ہو اے آغا تم جان اگر دو گے جرمن تمھیں کیا دیں گے
جن لوگوں کے کہنے سے تم جان گنواتے ہو بھیا یہی سب مل کر اک روز دغا دیں گے

واللہ، ظریفِ ایسا لکھا یہ رجز تم نے
ہم سب کا ارادہ ہے چندے سے صلہ دیں گے

اس نظم میں ظریف نے ۱۹۱۱ء کی سیاسیات پر بڑی خوش اسلوبی سے تبصرہ کیا ہے۔ یہ ادب اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے جس کی نظیر ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی۔ بہرحال ظریف لکھنؤ ہی کے شاعر تھے۔ اسی زمانے میں ظریف مرحوم کے بڑے بھائی مولانا صفی لکھنوی نے وہ شہرہ آفاق نظم لکھی جو ہر زبان پر جاری ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے اور اُن احساسات کا اظہار کیا ہے جو اس وقت ہر مسلمان کے دل میں موجود تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت مسلمانوں کا سیاسی رُجحان کیا تھا ؎

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو دکھا دیں گے | مشرق کا سرا اُٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہیں | بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے
ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ | شعلے بھڑک اُٹھیں گے دامن جو ہوا دیں گے
ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن | وقت آنے دو وقت آنے پھر تمکو بتا دیں گے
فاران پہ گرجے تھے برسے تھے جہاں بھر میں | گھر کر جو کہیں کڑکے طوفان اُٹھا دیں گے
مرجھائی ہوئی کھیتی ہم اب ہیں تو کیا غم ہے | چھینٹے ہمیں رحمت کے پھر نشو و نما دیں گے
جڑ ہم نے پکڑ لی ہے کلّے نئے پھوٹیں گے | گر خاک میں بھی ہم کو اِک بار ملا دیں گے
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے | اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں | یہ صور جہاں پھونکا مردوں کو جلا دیں گے

اے جذبۂ اسلامی جس دل میں نہ تو ہو گا
یہ نظمِ صفی پڑھکر ہم اس کو سنا دیں گے

اس زمانے کی باتیں اسی زمانے کے ساتھ گئیں، بعد کی نظموں میں یہ بات نہیں ملتی۔ تحریک آزادی کو شاعر رفتہ رفتہ اس کے صحیح مفہوم میں سمجھنے لگے۔ اب محض برطانیہ کی مخالفت سے اُن کی تشفی نہیں ہوتی تھی بلکہ اب وطن دوستی کا سچا جذبہ اور آزادی کی سچی محبت اُن کے کلام کا جزو بن گئی۔ چکبست نے اپنی "ہوم رول" والی نظم میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے، مثلاً:

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اس تحریک نے آگے بڑھکر کچھ اور رنگ بدلا اور آزادی کی خیالی تصویروں نے رفتہ رفتہ عملی جامہ پہننا شروع کیا۔ عوام سے ربط بڑھانے کے سلسلے میں رہنمایانِ وطن کو سماج کے نظام میں

ایک عظیم الشان انقلاب کی ضرورت محسوس ہونے لگی چنانچہ رفتہ رفتہ یہ تحریک اشتراکی بن گئی چنانچہ یہی انقلاب آجکل کے تمام شاعروں کی سیاسی نظموں کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس وقت بھی اکثر شعرا آزادی کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہیں۔

اس سلسلہ میں مجھے آل احمد صاحب سرور کا مضمون "جدید اُردو شاعری کے بعض میلانات" یاد آتا ہے جس میں انھوں نے جوش کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ صحیح معنوں میں انقلابی نہیں اور انقلاب کے ظاہری اور غارت گر پہلو سے خوش ہوتے ہیں، اُن کی نظر اُس خاک و خون سے گزر کر آنے والے سماجی نظام اور اس کے غیر معمولی حسن تک نہیں پہونچتی جس کے سامنے خاک و خون کا کھیل کوئی وقعت نہیں رکھتا۔" وغیرہ وغیرہ۔ موجودہ شاعری پر ایک حد تک میرا اعتراض بھی ہے کہ وہ انقلاب کے جذباتی پہلو زیادہ اُجاگر کر دیتی ہے، مگر اس حسن سے سروکار نہیں رکھتی جو انقلابی نظریوں اور ادب کے ہم آغوش ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے، تاہم میری نظر میں سرور صاحب کے اعتراض کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔

درحقیقت موجودہ سماجی نظام اتنے عرصہ سے قائم ہے اور اپنے لئے ایسی ہموار فضا پیدا کر چکا ہے کہ اس کا اُس وقت تک خاتمہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ دو اقتصادی قوتیں یعنی سرمایہ اور مزدوری (رع) اپنے تمام متعلقات کے ایک دوسرے سے سر بگریباں نہ ہو لیں یہ خود انقلاب نہیں بلکہ انقلاب کا پیش خیمہ ہوگا۔ بہرحال شاعر اس بارے میں اس وجہ سے مجبور ہے کہ اس کی دنیا جذبات کی دنیا ہے۔ اس لئے وہ خاک و خون میں غلطاں مناظر سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ مگر وہ روتا نہیں، بلکہ ایک انقلابی کی طرح خوش ہوتا ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کے فلسفہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر میری ناچیز رائے میں اقبال کی آخر عمر کی شاعری میں فلسفہ زیادہ ہے اور شاعری کم ہے۔

میں اس شاعری کے لئے اُن شاعروں کو معاف کرنے کا طرفدار نہیں ہوں جو اب میدان میں آرہے ہیں۔

جوش جب یہ کہتا ہے کہ

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

دیکھ کر میرے جنوں کو ناز فرماتے ہوئے
موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے

تو اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں ۔

قسم اس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے
کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے

اٹھو وہ صبح کا غرفہ کھلا، زنجیرِ شب ٹوٹی   وہ دیکھو پو پھٹی، غنچے کھلے، پہلی کرن پھوٹی

اُٹھو، چونکو، بڑھو، منھ ہاتھ دھو، آنکھوں کو مل ڈالو

ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو

سرور صاحب شاید ایک نظم میں شاعر کا مکمل فلسفہ ڈھونڈھتے ہیں۔ حالانکہ کسی نظم سے زیادہ "نامکمل" دنیا میں کوئی چیز نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر علیم صاحب کا بھی خیال ہے کہ آج کل کی اُردو شاعری میں "مرثیہ" زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ شاعری ہم میں جذبۂ ہمدردی تو پیدا کر دیتی ہے مگر وہ عزم نہیں پیدا کرتی جو اس نظام کے مٹانے پر ہم کو آمادہ کر دے۔ لیکن عام طور سے موجودہ دور کے نوجوان شعراء میں یہ بات نہیں ہے۔ مثال کے لئے جوش کی نظم "کسان" اور مجاز کی نظم "مزدور کا گیت" کافی ہیں۔

غرض اِن تمام باتوں کو پیش نظر رکھکر جب لکھنؤ اور نواح لکھنؤ کے شعراء کے کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے تو لکھنؤ اسکول اور لکھنؤ کے شعراء کے خلاف پروپیگنڈے کی حقیقت کھل جاتی ہے اگرچہ کہنے والے اب بھی کہہ سکتے ہیں

ممکن ہے کہ تو جس کو سمجھتا ہے بہاراں

اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں کا

قندِ پارسی

(از حضرت طالب دہرہ دون)

تا حسنِ تو بکشورِ خوبی علم زدہ   یکسر بنام جملہ حسیناں قلم زدہ

خال سیہ است بر رخ نیکوئی آں نگار   یا شاہِ حبش خیمہ بباغ ارم زدہ

گردید گرد باد صبا در ہوائے او   تا دستِ خود بطرۂ پُرپیچ و خم زدہ

خوں ریخت و جاں گرفت زِ عشاق اہلِ دل   ایں طُرّہ رہزنیست کہ راہِ عدم زدہ

ساید تمام عمر بآں سنگِ آستاں   گاہے قضا جبیں بجبینم رقم زدہ

برپا شدہ است حشر کہ بر خاکِ من زناز   آں سرو ناز فتنۂ محشر قدم زدہ

پرسی چہ حال طالبِ بیکس کہ کیست ایں   آوارہ خانماں و غریب است و غم زدہ

"شبنم"

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بی۔ اے ایل ایل بی)

بدل رہا ہے دوبارہ نظام عالم کا ۔۔۔ اڑے گا دم میں پھریرا سحر کے پرچم کا
ستارہ خاک نشینوں کا ماہوش چمکا ۔۔۔ بساط حسن میں سکہ رواں ہے شبنم کا
ازل سے وقف تمنائے دُر فشانی ہے
جواب بحر ہے کہنے کو بوند پانی ہے

متاع ہستی بے بود کھونے آتی ہے ۔۔۔ گلوں کی مانگ میں موتی پرونے آتی ہے
جبین نور کو اشکوں سے دھونے آتی ہے ۔۔۔ مآل حسن پہ ہر صبح رونے آتی ہے
جڑے ہوئے ہیں نگینے سے چشم پرفن میں
چھٹک رہے ہیں ستارے سے تاج گلشن میں

وفور شوق میں سجدے بچھائے جاتی ہے ۔۔۔ وفا کے نام پہ آنسو بہائے جاتی ہے
مگر کلی ہے کہ دامن بچائے جاتی ہے ۔۔۔ کس اعتبار پہ ہستی مٹائے جاتی ہے
سپرد خاک چمن عشق کا خزانہ ہے
ہنوز تشنۂ تکمیل یہ فسانہ ہے

شراب آتش گل تیز تر ہے پانی سے ۔۔۔ کہ مل رہی ہے گلے مستی جوانی سے
پڑی ہے اوس سی شبنم پہ بدگمانی سے ۔۔۔ تمام اشک ہے سوز غم نہانی سے
یہی سزا ہے حسینوں سے دل لگانے کی
ہزار حیف کہ دنیا میں ہے خطا نیکی

ولی گجراتی تھے یا دکنی؟

سید ظہیر الدین مدنی۔ ایم۔ اے

شاہ ولی محمد کے دکھنی اور گجراتی ہونیکا جھگڑا بہت پرانا ہو چکا ہے لیکن اسقدر دلچسپ ہے کہ اس بحث لطف سے خالی نہیں۔ ولی پر ہر مضمون سے اسکی وطنیت پر ایک نت نیا پہلو نکلتا ہے ولی کے دکن یا گجراتی ثابت کرنے کے لئے کوئی مضمون نگار قیاس سے کام لیتا ہے کوئی اسکی زبان کو ثبوت میں لاتا ہے اور کسی کو جذبۂ وطنیت کھینچے لئے جاتا ہے۔ لیکن لکھنے والوں نے زیادہ تر اس کو دکھنی ثابت کرنے میں اُن کی زبان ہی کو دلائل کا مرکز بنایا ہے۔

میری نظر سے آجتک جتنے تذکرے اور مضامین گذرے انہیں سے زیادہ تر ولی کو دکھنی بتلاتے ہیں۔ لیکن ان مضمون نگاروں نے جس چیز پر دلائل کی بنیاد رکھی ہے وہ گلے سے نہیں اتری اور دل چاہا کہ میں بھی اسکی تہ تک پہونچنے کی کوشش کروں۔

شکر خدا کا کہ ولی اپنے مذہب و ملت پیر و مرشد کے متعلق ایسی ایسی باتیں کہہ گئے ہیں کہ انکے سنت جماعت ہونے اور زبدۃ العارفین قطب الواعظین علامہ شاہ نور الدین اور شاہ وجیہ الدین صاحبان کے عقید تمند ہونے میں کسی کو شک و شبہ ہو نہیں سکتا۔ ورنہ خدا معلوم اسپر بھی کیا کیا بحثیں ہوتیں۔

میں صرف زبان کا پہلو پیش کرتا ہوں جسکو جناب احسن مارہروی مرحوم اور دیگر فاضل مضمون نگاروں نے ولی کے دکھنی ہونے کی سند میں پیش کیا ہے جناب احسن کلیات ولی شایع کردہ انجمن ترقی اردو میں لکھتے ہیں:

> بارہویں صدی ہجری کے تمام تذکروں میں جنکو ان حالات سے زیادہ قربت زمانی حاصل ہے ولی کو دکھنی اور اورنگ آبادی لکھا گیا ہے۔ اس صورت میں متاخرین کا بغیر کسی کافی ثبوت کے احمد آبادی یا گجراتی لکھدینا ناقابل تسلیم ہے۔
>
> چونکہ ولی کے تمام اہم واقعات　　گم ہیں اسلئے نیا سا کہا جاسکتا ہے کہ صوبہ گجرات میں طالبعلمی کے سوا کسی سلسلۂ معاش و ملازمت نے زیادہ یا تمام عمر قیام رکھنے پر مجبور کیا ہو۔ اس طرح

احمد آبادی مشہور ہو گئے ہوں۔ (اصل وطن۔ صفحہ ۱۵)

مندرجہ بالا سطروں سے احسن صاحب کا یہ خیال مترشح ہوتا ہے کہ ولی نے اپنی عمر کا کچھ حصہ گجرات میں بسر کیا اور غالباً اس وجہ سے وہ احمد آبادی مشہور ہو گئے۔ لیکن کیا اس قیاس کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ ولی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ دکن میں بسر کیا ہو اور اسطرح دکنی مشہور ہو گئے ہوں اور شاید یہی وجہ ہو کہ آن کے کلام میں چند دکنی محاورے اور الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ولی کا دکن میں عمر بسر کرنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ جس ملک میں شاعر، عالم، ہنرمند وغیرہ کی قدر ہوتی ہے وہیں وہ جاتے ہیں۔ جب کسی انقلاب حکومت کی وجہ سے ملک کو خیرباد کہتا ہے جسطرح مصحفی امروہہ سے دلی اور لکھنو چلے گئے۔ اسیطرح ولی بھی شائد گجرات چھوڑ کر دکن گئے ہوں۔ میر صاحب بھی کچھ عرصہ کے لئے دلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔ اسیطرح ولی بھی گجرات چھوڑ کر دکن گئے ہوں گے۔ انکی کشش کے لئے آزاد۔ سراج جیسی ہستیاں موجود تھیں اگر اسوقت کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ گجرات میں خانہ جنگیاں اس حد تک بڑھی ہوئی تھیں کہ چند شریف خاندانوں نے گجرات کی سکونت کو ترک کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ لہذا علامہ شاہ وجیہ الدین صاحب کے پوتے شاہ اسد اللہ گجرات چھوڑ کر بیجاپور تشریف لے گئے۔ شائد اسیطرح ولی بھی دکن گئے ہوں گے اور دکنی لب ولہجہ میں غزلیں کہی ہوں۔

آگے چل کر جناب احسن نے کلیات ولی میں "ولی یقینی دکنی ہے" کی سرخی کے تحت چند اشعار اور چند محاورے دیئے ہیں اور کلیات کے صفحہ ۱۰۲ پر تمام ایسے محاورے علیحدہ دیئے ہیں جو دکن کے سوا کہیں نہیں بولے جاتے ہیں۔ میں انمیں سے چند قابل اعتراض محاورے پیش کرتا ہوں۔

دسنا۔ بولنا۔ انکھاں۔ پلکاں۔ ہور۔ نکو۔ باتاں۔ تجھ سری۔ اچنبو۔ چاکھا۔ نین۔ جن نے۔ ان نے من۔ اپس۔ کنبے۔ وہانچہ۔ ہنچھ۔ آتا۔ ادایاں جھاڑ۔ اچو لگ۔ انہوں کو۔ پروانگی چپ۔ کدھی ناخون۔ پونچھ۔ بگی۔ وغیرہ۔

یہ ان چند محاوروں کو جناب احسن نے دکن میں سنا اور یہ حکم لگا دیا کہ یہ دوسرے صوبوں میں نہیں بولے جاتے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شائد جناب احسن گجرات تشریف نہیں لائے ورنہ یہ خیال رفع ہو جاتا۔ اور ولی کو دکنی ثابت کرنے کے بجائے وہ اسے گجراتی ثابت کرتے۔

سیوائی۔ دسنا۔ بگی۔ نکو اور جب تمام محاورے گجرات کے دیہاتوں میں اور بڑے شہروں میں زبان زد عام ہیں۔ اور نہایت بے تکلفی سے استعمال کئے جاتے ہیں اور اسکی سند یہ ہے کہ ۱۳۸ھ ۱۹ء میں

جناب مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو دہلی اور جناب پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی گجرات کے دورے پر تشریف لائے تھے اور جب سورت سے قریب مقام ہانسوٹ میں مولوی صاحب نے وہاں کے لوگوں کی تقریریں سنیں تو فوراً فرمایا کہ یہ قدیم اردو کا نمونہ ہے۔

اسکو بالفاظ دیگر اسطرح کہا جائے کہ گجرات کے گاؤں میں ابتک ولی کی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اب ولی کے چند گجراتی ہمعصروں کا کلام ملاحظہ فرمائیے۔

احمدی رہے نادر خیالاں میں ملے شوریدہ حالاں میں
ہوئے صاحب کمالاں میں کدہر آکر کدھر نکلے

ذیل کے اشعار نازنی پٹھان قصہ میں سے لئے ہیں یہ قصہ کسی شخص نے جسکا تخلص عابد تھا ۱۱۱۲ھ سے ۱۱۲۰ھ تک میں منظوم کیا ہے۔

ارے خان ایوی نہ کر بات تنے نہ کر بات ایوی تو کیسر کنے
اگر ل کریں کافراں فیل و قال شہر سے میں دونگا انھونکو نکال

اب ذرا غور فرمایئے۔ جناب احسن فرماتے ہیں:۔

بعض الفاظ گجرات و دکن میں ضرور مشترک ہو سکتے ہیں۔ مگر اس شاذ اشتراک کو کثرت اختصاص پر ترجیح دینا تحقیق کا خون کرنا ہے (اصل وطن صفحہ ۱۵) ناظرین اب شاذ اشتراک اور کثرت اختصاص پر غور فرمائیں۔ جناب احسن کے الفاظ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ولی گجراتی تھے کیوں کہ ولی کے کلام میں صرف تین محاورے خالص دکھنی ہیں اور باقی سب کے سب مشترک ہیں جو اسوقت تو کیا آج بھی بولے جاتے ہیں۔

رہا اب سوال گھگری کا جوڑا اور "کربلہ دھار چوٹی" کا تو یہ ولی نے دکن میں سنا ہوگا اور ایک نادر چیز سمجھ کر شعر میں کھپایا ہو۔ اکثر شعرا دیگر صوبوں کی نادر چیزوں کا ذکر کر کے آخیر میں نوٹ لگا دیتے ہیں۔

جناب احسن فرماتے ہیں اسیطرح ایسے بعض اشعار جن میں کسی تخیل و خصوصیت سے سحر بنگالہ یا شہر سورت اور دلی کی جمنا کا ذکر آگیا ہو۔ ان کو پڑھکر جیسے گارسان دی تاسی کی طرح یہ سمجھ لینا کہ اسکا قائل سورت دہلی یا بنگال کا رہنے والا ہے ایک لاطائل خیال اور بے سروپا بات ہے (اصل وطن صفحہ ۱۵)

ناظرین غور فرمائیں کہ جب گارسان دی تاسی کو سورتی۔ دہلوی یا بنگالی سمجھنے کا حق نہ تھا

تو دوسروں کو ولی کے دو چار محاورے اور گجگری کا جوڑا اور کریلا دھار چوٹی پر سے یہ حکم لگا دینے کا کیا حق تھا کہ ولی دکنی ہے۔

جناب احسن نے غزل نمبر ۲۵-۳۶-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۴-۵۴-۶۶-۷۷ اور ۷۸ پر حکم لگا دیا ہے کہ یہ خالص دکنی محاوروں میں ہیں۔ لیکن باستثنائے ۳۶-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱ سب محاورے اب تک گجرات میں بولے جاتے ہیں۔ جناب احسن صفحہ ۵۹ پر نوٹ میں فرماتے ہیں کہ مندرجہ بالا نمبر کی غزلیں خالص دکنی محاوروں میں ہیں۔ نیز یہ بھی آپکا قیاس ہے کہ شاید یہ غزلیں کسی اور قدیم شاعر کی غزلیں دیوان ولی میں شامل کر دی گئی ہوں۔

یہ قیاس درست بھی ہو سکتا ہے لہذا اس قیاس کی بنا پر ولی کو دکنی نہیں کہہ سکتے تاوقتیکہ کہ ولی کا صحیح کلام دستیاب نہ ہو۔ ولی کی مثنوی "در فراق گجرات" میں ولی کے اشعار سے مترشح ہے کہ ولی گجرات سے دکن گئے، تو ان کو اس کے چھوڑنے کا بہت غم ہوا۔ اور اسی بنا پر اپنے دل کو تسلی دینے کو مطلع میں فرماتے ہیں۔

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں پھر اسکے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

میری بحث صرف زبان پر تھی جسکے متعلق میں نے اپنے خیالات عرض کر دیئے جناب احسن ہر پہلو کی جانچ پڑتال کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ولی دکنی تھے اور میں یہ گذارش کرتا ہوں کہ اس پہلو کو اگر بغور دیکھا جائے تو ولی گجراتی ثابت ہوتے ہیں۔

لطفِ کلام

(حضرت لطیف انور گورداسپوری)

ہے ابھی دل میں دردکا آغاز بیٹھی جاتی کیوں مری آواز
شمع جل جل کے بجھ گئی آخر مرگِ پروانہ کا تھا یہ انداز
زحمتِ دامِ گستری نہ اٹھا کب بدلتی ہے فطرتِ شہباز؟
مشکلِ زیست ہو گئی آساں اے غمِ عشق! تیری عمر دراز
دام ہو یا قفس ہو یا گلشن میری فطرت ہے ہر جگہ پرواز

شاد کیا ہو ابھی تو ہیں انور
راہ میں اور کچھ نشیب و فراز

پروانہ

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ، بی۔اے، ایل ایل۔بی وکیل شاہجہانپور)

اے کہ تو روزِ ازل سے محوِ روئے شمع ہے
خرمنِ ہستی کو تیرے جستجوئے شمع ہے

انجمن میں اے حریصِ لذتِ آزارِ دوست
خاک کر دیتی ہے تجھکو آتشِ رخسارِ دوست

گرچہ پیغامِ اجل ہے شمع کی الفت تجھے
رخصتِ فریاد بھی دیتی نہیں غیرت تجھے

بوالہوس ہوتے ہیں نالاں دوست کی بیداد سے
پختہ مغزانِ جنوں بیگانہ ہیں فریاد سے

دہر میں تو در حقیقت رازدانِ عشق ہے
تیرے مذہب میں خموشی ترجمانِ عشق ہے

جان دیکر لطف اندوزِ بقا ہوتا ہے تو
اللہ اللہ شمع کے آغوش میں سوتا ہے تو

تجھکو حاصل ہے سکوں آرام گاہِ یار میں
بلبلِ شوریدہ سر محوِ فغاں گلزار میں

تیرا سینہ اضطرابِ شوق کا گنجینہ ہے
تو بھی انساں کی طرح اِک عاشقِ دیرینہ ہے

آہ یہ ضبط و تحمل یہ خموشی کی ادا
دل کو برماتی ہے تیری جاں فروشی کی ادا

عشق کے عالم میں غوغا بے زبانی سے تری
گرمیِ بازارِ الفت بے نشانی سے تری

اے قتیلِ خنجرِ غم اے شہیدِ بے زباں
داب و آدابِ محبت تو نے سیکھے ہیں کہاں

ایک ناکس اور گُہر آمائے اسرارِ وفا
ایک ناچیز اور یہ آشوبِ غم کا حوصلا

قلب تیری بیخودیِ شوق پہ قربان ہے
ایک میں کیا، انجمن کی انجمن حیران ہے

تیرے اندازِ جنوں ہیں اس قدر حیرت فزا
یہ گماں ہوتا ہے تو انساں سے بازی لے گیا

اِس ستائش سے نہ اے ناداں ہو سرمستِ غرور
تیری حدِ وسع سے انسان کی منزل ہے دور

اس کے رُتبے کو پہونچنا واقعی دشوار ہے
بیخودی کے واسطے کچھ ہوش بھی درکار ہے

بخش دیتی گر تجھے فطرت مذاقِ آگہی
کشورِ الفت کی مل جاتی تجھے شاہنشہی

اے کہ تو ہوش و خرد سے دہر میں بیگانہ ہے
نامکمل تیری الفت کا ابھی افسانہ ہے

بزمِ عالم میں ہے تو جاندادۂ حُسنِ مجاز
تیری نظروں سے ہے پنہاں جلوۂ معنی کا راز

شمعِ روشن سے ہے محفل میں پریشانی تری
حُسنِ صورت کی طرح الفت بھی ہے فانی تری

شمعِ روشن سے ہے محفل میں پر افشانی تری
حُسنِ صورت کی طرح الفت بھی ہے فانی تری

شمعِ کشتہ کی محبت سے تجھے پرہیز ہے
طلعتِ شمعِ فروزاں اشتیاق انگیز ہے

گو فروغِ شمع کی ہے زندگانی ایک رات
عشق پر لازم نہیں پابندیٔ مرگ و حیات

اے کہ تو اک عمر سے ہے دامِ صورت میں اسیر
از زنِ ہندو طریقِ عشقِ صادق یاد گیر

آرزو جس طرح مٹتی ہے دلِ مضطر کے ساتھ
خاک ہو جاتی ہے وہ بھی قالبِ شوہر کے ساتھ

قابلِ عزّت جہاں میں یوں تو ہر دیوانہ ہے
شمعِ کشتہ پر جو قرباں ہو وہی پروانہ ہے

ابرِ نوبہار

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔اے ایل ایل بی)

نمود ہے سحاب کی نگاہِ بادہ بار سے
بھڑک رہی ہیں بجلیاں فروغِ لالہ زار سے

جوانیاں برس رہی ہیں ابرِ نوبہار سے
لپٹ رہی ہیں بدلیاں شعاعِ زرنگار سے

نگاہِ شوق لٹ گئی بہار میں بہار سے
ٹپک پڑی شرابِ حُسن گل تو گل ہیں خار سے

مچل رہی ہیں شوخیاں چھلک رہی ہیں مستیاں
جلو میں آبشار کے کنارِ جوئبار سے

ٹپک رہی ہے بوند بوند شبنمِ نظر فروز
لٹک رہی ہیں شاخ شاخ موتیوں کے ہار سے

نکھر رہی ہے مو بمو ہزار رنگ و بُو
جوانیٔ بہارِ حُسن حسن کے ابھار سے

ہر ایک موجۂ خنک لئے ہوا ہی رو میں برف
کلی کلی ہے سیمتن ہوائے خوشگوار سے

چڑھا رہی ہے عرش پر نشیب کو مسار کو
اُتر رہی ہے چاندنی فرازِ کوہسار سے

یہ کچھ عجیب سیر ہے جگر کا حال غیر ہے
لگی ہے ایک آگ سی شراب کی پھوار سے

بُنیادی تعلیم

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

از مسٹر مبشر علی صدیقی، ایم۔ اے، بی۔ ٹی (علیگ)

افراد { مہاتما
ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم،
ایک قومی تعلیمی ادارے کے پرنسپل،
معلّم،

وقت:۔ آجکل کا زمانہ مقام:۔ ہندوستان

مہاتما:۔ بُنیادی طریقۂ تعلیم ملک میں مقبول ہو رہا ہے، بچّے اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ نئی روشنی کے معلّم اس کی اہمیّت کو محسوس کرتے ہیں، قدامت پسند ناک بھوں چڑھاتے ہیں (قدموں کی چاپ اور دروازے کا کھُلنا) آئیے حضرات، آپ لوگوں سے بہت دنوں میں ملاقات ہوئی۔

ڈائرکٹر:۔ مہاتما جی! مزاج اچھے ہیں

مہاتما:۔ کرپا ہے بھگوان کی،

پرنسپل:۔ مہاتما جی! ہمارے نئے تعلیمی تجربے کو تین سال کے قریب ہو گئے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اب اس کا جائزہ لیا جائے اور بنیادی تعلیم کو تنقید کے آئینہ کے سامنے لایا جائے۔

ڈائرکٹر:۔ کچھ صوبوں میں بنیادی تعلیم جاری کی گئی، بعض میں کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے، بعض میں دق کے مریض کی طرح آخری سانسیں لے رہی ہے اور بعض میں اس کا جنازہ بھی نکل چکا۔

مہاتما:۔ ڈائرکٹر صاحب! آپ کے یہاں ریاست میں اس کا تجربہ کیسا رہا، میرے خیال میں اگر تعصب کی عینک کو اُتار کر دیکھا جائے تو بُنیادی قومی تعلیم میں فی الواقع اگر ایک طرف ہندوستان کی بیکاری کا حل ہے تو دوسری طرف بچّہ کو اپنی پوشیدہ صلاحیتیں اُبھارنے کا کافی موقع ملتا ہے۔

ڈائرکٹر:۔ مہاتما جی! آپ کا خیال درست ہے، بچّہ اور زندگی کے بیچ میں اس پرانی تعلیم نے "کتاب"

کی ایک ایسی دیوار حائل کردی ہے جو بچّہ کو کسی اور چیز کے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی ہے، ہمارے یہاں اس کا تجربہ ہو رہا ہے، ناکامی کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

(معلم اندر داخل ہوتا ہے)

پرنسپل:۔ آئیے ماسٹر صاحب! چند سال پہلے آپ نے ہمارے یہاں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی فرمائیے آپ کے نارمل اسکول میں بنیادی تعلیم کا کیسا کام ہو رہا ہے؟

معلم:۔ میں نے کئی ایک ایسی جماعتوں کو غور سے دیکھا جہاں بنیادی طریقہ پر تعلیم دی جارہی تھی، بچّے ہنسی خوشی کام کر رہے تھے۔ اِس صوبہ کے تمام پرائمری اور مڈل اسکولوں میں درجہ ۲ تک بنیادی تعلیم لازمی قرار دیدی گئی ہے اور اس سال سے درجہ ۳ میں بھی اس کا نفاذ ہوجائیگا۔ سب ڈپٹی انسپکٹر ڈرائنگ ماسٹر اور نارمل اسکولوں کے بیشتر ماسٹر بنیادی تعلیم کا ریفریشر کورس مکمل کرچکے ہیں۔

ڈائرکٹر:۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ معلمین کی ذہنیت میں بھی اس سے کچھ تبدیلی ہوتی ہے یا نہیں، ورنہ ؎

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں
آنکھ کھُلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

معلم:۔ انسان کی ذہنیت کو بدلنا واقعی بڑا مشکل کام ہے، ایکس ریز کی طرح انسان کے دل کی حالت معلوم کرنا ہر ایک کا کام نہیں، یہاں بڑے بڑے عقلمند ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ میں نے بہت سے معلمین کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ بنیادی تعلیم کا طریقہ محض خیالی ہے اور اُسے مستقل طور پر عملی جامہ پہنانا مشکل ہے اس کے رائج ہونے سے ہمارے مدرسے کارخانے تو بن جائیں گے لیکن علمی لیاقت مفقود ہو جائیگی اور بچّوں کا ادبی ذوق پست ہوجائیگا۔ ہمارے مدرسوں سے اچھے بڑھئی اور لوہار فارغ التحصیل ہو کر نکلیں گے لیکن اچھے سائینٹسٹ دان، سیاست داں، ادیب اور انشاپرداز کم نکلیں گے۔

ڈائرکٹر:۔ اس قسم کے اعتراضات عرصہ ہوا کئے گئے تھے ہم نے اس وقت ان کا جواب بھی دیدیا تھا لیکن میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں، پُرانے طریقۂ تعلیم نے ہمارے یہاں کتنے فلسفی، شاعر، سیاست داں اور انشاپرداز پیدا کئے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر مان لیا جائے کہ موجودہ بنیادی طریقہ بھی (حالانکہ یہ غلط ہے) اس قسم کے افراد پیدا کرنے سے قاصر ہے لیکن ان کے بجائے تندرست افراد اور اچھے شہری پیدا کرتا ہے تو کیا حرج ہے؟ اسکول چھوڑنے کے بعد ایک نوجوان طالب علم اس دنیا میں اپنے آپ کو ایک اجنبی تصور نہ کریگا بلکہ زندگی کی دوڑ میں برابر کا حصّہ لیگا۔ اسمیں خود اعتمادی اور عمل کرنے کی قوت پیدا ہوگی اور وہ سماج کا ایک مفید رُکن بن سکے گا۔

پرنسپل:- ابتدا میں ہر اسکیم پر اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ لیکن جب تجربہ کی کسوٹی پر اُسے پرکھا جاتا ہے تو اُس کے جوہر خالص سونے کی طرح چمکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی خامیاں دھندلی نظر آتی ہیں تو رفتہ رفتہ دنیا اُسے قبول کر لیتی ہے۔ ماحول اور ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلیاں اور اضافہ کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ مجموعی طور پر افادی اور عملی حیثیت سے بہت کامیاب بن جاتی ہے۔

مہاتما:- ہمیں تعلیم میں قدامت پرستی کے خلاف عرصہ تک جنگ کرنا پڑیگی، پرانے اُستادوں کی ذہنیت کو بدلنا پڑیگا، نئے اُستادوں کو نئے سانچے میں ڈھالنا پڑیگا تب کہیں جاکر یہ قید خانے (بقول برنارڈ شا) صحیح معنیٰ میں مدرسے بن سکیں گے۔ اس کے ساتھ ہمیں اُستاد کا درجہ سماج میں بھی مقرر کرنا پڑیگا۔

پرنسپل:- استاد کا درجہ سماج میں........ ہمارے سماج میں استاد کا درجہ کانسٹبل یا پٹواری سے بہت نیچے اور خدمتگار سے کچھ آگے ہے۔ اس کی تنخواہ ایک کلرک کی تنخواہ سے کم اور چپراسی کی تنخواہ سے کچھ زیادہ ہے۔ سماج نے اس کی خدمات کو ٹھکرا دیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اس ملک میں کسی کو احساس نہیں، اس ناقدری کی وجہ سے اسمیں رفتہ رفتہ کمتری کا احساس پیدا ہوگیا ہے۔ اگر سماج نے اُستاد کی ہمت افزائی نہ کی تو اس نئی تعلیم کی تمام کوششوں کا نتیجہ معلوم!

مہاتما:- ہمیں تصویر کا تاریک رُخ نہ دیکھنا چاہیئے، نا اُمید ہونے کی کوئی وجہ نہیں، نئی قدریں پُرانی قدروں کی جگہ لیں گی۔ سماج استاد کی قدر کرے گا اور ضرور کرے گا

ڈائرکٹر:- سماج استاد کی قدر کرے گا اس میں کوئی شبہ نہیں، لیکن استاد کو بھی سماج کی ضرورتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ استاد نے اپنے ناقص طریقوں سے بچوں کی صدہا نسلیں تباہ و برباد کردیں، اُن کی ہمتیں پست کردیں، اُن کے خیالات محدود کر دیئے اور کتابوں کے انبار سے اُن کی جھکی ہوئی پیٹھ کو اور جھکا دیا۔

ان کی اس تعلیم سے پایا کسی نے جب فراغ

دردِ دل دردِ جگر دردِ بصر دردِ دماغ

اگر موجودہ جنگ میں فوج کو ہوائی لڑائی کی تمام باتیں نہ بتلائی جائیں مکمل ہتھیار نہ دیئے جائیں ہوائی حملوں سے بچنے کی تدابیر نہ سکھلائی جائیں، دشمن پر موقع پاکر قابو حاصل کرنا نہ معلوم ہو تو نتیجہ سوائے شکست کے اور کیا ہوسکتا ہے۔ مگر ہمارا اُستاد جو پُورے سماج کی فوج کو تیار کر رہا ہے اگر ایک بچہ کو بھی غلط طریقہ سے تعلیم دیوے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہجائیگا

اور جس طرح ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے یہ بچہ پورے سماج کو گندہ کرے گا
معلم :۔ کلام قطع ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ نئی تعلیم اور نیا سماج استاد سے کیا توقع کرتا ہے اور اس پر کونسی پابندیاں عاید کرنا چاہتا ہے۔

پرنسپل :۔ نئی تعلیم اُستاد سے توقع کرتی ہے کہ وہ بچے کو اس کی نفسیات کے مطابق تعلیم دے بالفاظ دیگر استاد کے لئے علم النفس کی ابتدائی باتیں جاننا ضروری ہے۔ بچہ کوئی ٹھوس چیز نہیں جو ہمیشہ ایک سی حالت میں رہے۔ عمر کے ساتھ اس کے خیالات اور رُجحانات میں تبدیلی ہوتی ہے استاد اپنا طریقہ تعلیم ان رُجحانات و میلانات کے مطابق ترتیب دے۔ استاد کو تعلیم کے نئے طریقوں سے واقف ہونا چاہیئے لیکن موقع اور ضرورت کے لحاظ سے اُسے خود اپنا ایک نیا طریقہ بنانا پڑے گا، ایک طریقہ بذاتِ خود خواہ کتنا اچھا ہو تمام بچوں کے لئے ہر موقعہ پر مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ اُستاد کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی فطرت کے خلاف کوئی کام نہ کرے۔

معلم :۔ بنیادی طریقہ اس سلسلہ میں استاد کی کہاں تک مدد کر سکتا ہے؟

پرنسپل :۔ آپ کو یہ بات ڈائرکٹر صاحب سمجھائیں گے۔

ڈائرکٹر :۔ بنیادی طریقہ کوئی نیا طریقہ نہیں ہے۔ اس پر بیشتر مغربی ممالک میں عمل کیا جا چکا ہے۔ ہم نے ہندوستان کی ضرورتوں کے مطابق اس میں تبدیلیاں کردی ہیں۔ یہ طریقہ صرف دماغی کام کرنے کے بجائے ہاتھ اور آنکھ سے کام کرنے پر بھی زور دیتا ہے۔ بچہ کی اختراعی قوتوں کو اُبھارنا اس کا اوّلین مقصد ہے۔ بنیادی طریقہ بچہ میں فن کارانہ نظر (Artistic Sense) پیدا کرتا ہے۔ کارڈ بورڈ کاٹتے وقت، لکڑی کا کام کرتے وقت، سُوت کاتتے وقت، ڈیزائن بناتے وقت، رنگ بھرتے اور باغبانی کا کام کرتے وقت ان کا جذبۂ عمل بیدار ہوتا ہے اور کام میں کھیل کا لطف آنے لگتا ہے۔ بچہ بغیر کسی دباؤ کے کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس کو گھر پر بھی جاری رکھنا چاہتا ہے۔ ان عملی کاموں کے ذریعہ ہم اُسے ابتدائی حساب مادری زبان اور تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم دیتے ہیں، ایک بے جان مضمون کی تعلیم نہیں بلکہ مربوط طریقہ پر جس میں روزمرہ کے واقعات اور زندگی کی حقیقتوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہم حرفہ سے بیشتر مضامین کا ربط قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ حرفے مختلف اقسام کے اور حسب ضرورت ان میں سے کوئی سا حرفہ انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے مدرسوں کو مدرسۂ عمل کہنا زیادہ موزوں ہوگا جہاں بچہ ہر کام اپنے تجربہ کی بنا پر سیکھے گا۔

معلّم:۔ بحث طویل ہوتی جاتی ہے، لیکن ایک بات اور دریافت کرونگا، بنیادی طریقہ پر تعلیم اس وقت دی جاسکتی ہے جب معلّمین اس کے اُصولوں کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اُن کی کامیابی کا اُنھیں یقین ہو جائے۔ لیکن تمام معلّمین کو کس طرح اس نئی تعلیم کے اُصولوں سے واقف کرایا جائے؟ اس اسکیم کی کامیابی بغیر اس قسم کے استادوں کے مشکل ہے۔

ڈائرکٹر:۔ آپ کے صوبہ میں بیشتر معلّمین جیسا آپ نے فرمایا بنیادی طریقۂ تعلیم سے واقف ہو چکے ہیں۔ کچھ معلّمین اور ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ اس صوبہ کی تقلید اور دوسرے صوبوں کو بھی کرنا چاہئیے۔ لیکن یہ کام بغیر حکومت کی مدد کے مشکل سے چل سکے گا۔

پرنسپل:۔ مجھے اس خیال سے اتفاق ہے۔ اگر حکومت نے ہماری اس سلسلہ میں مدد کی تو لازمی بنیادی تعلیم ۷ سال سے ۱۴ سال تک کی عمر کے بچّوں کے لئے ملک میں جاری ہو جائیگی، اور اس کا اثر آپ کو چند سال کے بعد معلوم ہوگا۔ ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جائے گی، اور اس طرح سے جہالت کی جڑ کٹ جائے گی۔

مہاتما:۔ ہمیں تعلیم بالغان کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئیے۔ اگر ان کو تعلیم نہ دی گئی تو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوگی۔

ڈائرکٹر:۔ بنیادی تعلیم، تعلیم بالغان، صنعتی و حرفتی تعلیم اور اس کے ساتھ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی اعلیٰ تعلیم اس ملک میں نوجیون کا کام کرینگی۔ جمہوریتوں کی فتح کے ساتھ تعلیم کا مستقبل وابستہ ہے۔ کیونکہ آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کے نظام میں اس قسم کی تعلیم کے لئے کوئی گنجایش نہیں۔ ہندوستان میں بنیادی تعلیم کی یہ کوششیں بچّہ کو وہ آزادی دے رہی ہیں جو اس کا جائز اور فطری حق ہے۔

(پردہ)

اے جوانی!

(از حضرت الطاف مشہدی)

جوانی! مری کیف پرور جوانی | بہت مختصر ہے تری زندگانی
مگر اس میں بھی کام کرنا پڑے گا | وطن کی محبت میں مرنا پڑے گا
اگر تجھ کو اپنے مشاغل ہوں پیارے | ہوس، بیخودی، زمزمے، ماہ پارے
تو میری طرف سے اجازت ہے تجھکو | بڑھاپا کہیں تجھ سے بہتر ہے مجھ کو

جنم اشٹمی

(رائے زادہ گوبند پرشاد آفتاب بی۔اے)

سمندروں کو بھی جس بوند کی تمنا تھی	جس ایک ضو کے لئے تھے نجوم چشم براہ!
جس ایک ذرّے کو مہران و مہر چاہتے تھے!	جس ایک لَو کا چراغانِ برق تھا دلخواہ!
جس ایک گل کی ہوا میں ریاضِ گیتی تھا	جس اوس کے لئے بیتاب تھا جہانِ گیاہ
جس ایک دُر کیلئے اضطرار نیساں میں تھا	جو ایک دانہ تھا سب خرمنوں کی زیرِ نگاہ!
نہالِ دہر تھے سر دُھنتے جس ورق کے لئے	جس ایک رنگ کی تکتی تھی راہ چشمِ نگاہ!
جس ایک خس کے لئے مضطرب تھی جانِ جہاں	جس اک جھلک کیلئے شام ہوگئی تھی سیاہ!
جس ایک لمحہ کا تھا منتظر زمانِ ازل	جس ایک منظرِ دلکش پہ تھی ابد کی نگاہ!
جس ایک طوبیٰ کی آمد پہ صدقے تھا فردوس	لگائے کان تھے جس دُھن پہ سازِ جنت گاہ!
جس ایک مس کے لئے برق کو قرار نہ تھا	جس ایک جھونکے کی رہ دیکھتا تھا ابرِ سیاہ!
کھلی زمانے کی تھی آنکھ جس ادا کے لئے	جس ایک جلوہ مضطر پہ طور کی تھی نگاہ!

چمک کے برق تجلّائے طور وہ آئی

سری کرشن کا سارا جہاں ہے مجُرائی

ماتمِ ٹیگور

(از منشی تلوک چند محروم بی، اے)

(۱)

دل رو رہا تھا ماتمِ اقبال میں ابھی
چرکا لگا اک اور، کہ ٹیگور بھی گیا!
دستِ قضا سے آج لٹا کاروانِ ہند
شاعر، گورو، محبِّ وطن، فلسفی گیا!

(۲)

روشن تھا جس کے نام سے ہندوستان کا نام
وہ ماہتابِ اوجِ درخشندگی گیا
جانے سے اس کے محفلِ ہستی اُجڑ گئی
کشافِ معنیٔ صُوَرِ زندگی گیا!

(۳)

اُٹھتی ہے آج ہُوک دلِ کائنات سے
لہرا رہے ہیں ماتمی نغمے فضاؤں میں
ساون کے گیت نوحوں میں تبدیل ہو گئے
طوفاں ہیں اشک، آہ کے کالی گھٹاؤں میں!

(۴)

تہذیب۔ شاعری۔ ادب۔ انسانیت کی جاں
وہ افتخارِ عصر، عدیم النظیر تھا
خلوت میں ایک زاہدِ مرتاض اور فقیر
جلوت میں پُرشکوہ، امیرِ کبیر تھا!

(۵)

محلوں میں اُس کا جسم بہ ناز و نعم پلا
کھیتوں سے والہانہ سدا رہا لگاؤ دل
آسائشیں ہزار مقدر نے دیں اُسے
نوعِ بشر کے غم میں رہا بے قرار دل!

(۶)

محلوں کے رہنے والوں کے دل بھی ملول ہیں
کھیتوں میں بسنے والے بھی ماتم نشیں ہیں آج
ٹیگورِ دل نواز ہوا آسماں نورد
صد گونہ پیچ و تاب میں اہلِ زمیں ہیں آج!

(۷)

ٹیگور، جس نے اپنی نواہائے تازہ سے
طرحِ جہانِ شعر و سخن کو بدل دیا
چشمِ جہاں سے آج نہاں ہو گیا۔ دریغ
روحِ بشر کو جس نے پیامِ ازل دیا!

(۸)

شعر و غزل کے ساغر و مینا سے جلوہ ریز
محفل میں اُس کی دَورِ سُرورِ دوام تھا
ہر گیت روئے شاہدِ اصلی کی اِک جھلک
افسانہ بھی لکھا تو حقیقت پیام تھا

(۹)

دنیا میں یوں تو گرم ہے بازار موت کا
قیمت جو آج ہے، سو ہے جنسِ حیات کی
یہ وہ زیاں ہے جس کی تلافی محال ہے
اے آہ! موت شاعرِ قُدسی صفات کی

(۱۰)

سیر و سفر کو مشرق و مغرب میں دُور تک
وہ باعثِ وقارِ وطن بار ہا گیا
تعلیم نے قدم لئے، پہونچا جہاں جہاں
رونق وطن میں آ گئی، جب واپس آ گیا

(۱۱)

ٹوٹی ہے آہ! اب کے اُمیدِ مراجعت
ایسے سفر پہ رختِ سفر باندھ کر گیا
ہاں بحر و دشت و کوہ سے آنے لگی یہ صدا
ٹیگور عالمِ گُزراں سے گزر گیا!

شاعرِ اعظم ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور

مادرِ ہند نے گوسوامی تلسی داس کے بعد اگر کوئی ایسا فرزند پیدا کیا جو دلوں پر اپنا نقشِ محبت اور دائمی اثر ثبت کر جائے تو وہ شاعرِ اعظم ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کی ہستی تھی جنھوں نے ۷ اگست ۱۹۴۱ء کو کچھ اُوپر اسّی سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد اپنے آبائی مکان واقع کلکتہ میں انتقال فرمایا۔ اور نہ صرف ہمیں بلکہ دنیا بھر کے قدر دانانِ علم وفضل کو ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئے۔ مرحوم علومِ متداولہ اور فنونِ لطیفہ کے لحاظ سے تو یکتائے زمانہ تھے ہی لیکن روحانی اعتبار سے بھی وہ ایک مہرشی کے فرزند سعید تھے اور اُن کی روحانی عظمت کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر قائم تھا۔ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کے انتقال پُرملال سے دنیا کا ایک بہت بڑا شاعر، ایک زبردست ادیب، ایک پختہ مغز فلسفی، ایک سحر طراز موسیقی کار، ایک بے نظیر مصوّر، ایک بے مثال محبِّ وطن اور ایک بے مثل روحانی پیشوا اُٹھ گیا ہے۔ جس کے انتقال پر نہ صرف تمام ہندوستان میں صفِ ماتم بچھ گئی، بلکہ بیرونی دنیا کے قدر دانانِ علم وفضل کو بھی ایک صدمۂ عظیم پہونچا۔

ابتدائی حالات | ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور خطۂ بنگال کے امیر خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ۷ مئی سنہ ۱۸۶۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مہرشی دیویندر ناتھ ٹیگور اور والدہ کا اسم مبارک شریمتی سارَدا دیوی تھا۔ آپ اپنے والدین کے چودھویں فرزند اور نویں بیٹے تھے۔ ٹیگور کا خاندان بنگال کا ایک بہت قدیم اور محترم خاندان ہے اور گذشتہ دو پشتوں کے اندر اس خاندانِ عالی کے ممبروں نے علوم وفنون میں وہ وہ کارنامے دکھائے ہیں گویا مادرِ وطن کی افسردہ روح کو از سرِ نو زندہ کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خاندانِ ٹیگور کو ہندوستان کی روحِ بیداری سمجھنا چاہیئے۔ مرحوم کے والد مہرشی دیویندر ناتھ ٹیگور اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم وفاضل اور روحانی پیشوا تھے۔ اس طرح ایک خلاق دماغ اور ایک فطرتِ سلیم جو رابندرا ناتھ کے خصوصیات میں داخل تھی وہ اُن کا آبائی ورثہ تھا۔ یہ گویا شفیق باپ کا ہی طفیل تھا جس نے رابندرا ناتھ کو ایک لاجواب شاعر، ایک بے نظیر آرٹسٹ اور ایک عالی دماغ فلاسفر بنا دیا تھا۔

مرحوم کی ابتدائی تعلیم اورینٹل سیمنری "Oriental Seminary" سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد وہ نارمل اسکول میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد شفیق باپ نے سویندر ناتھ، ستیا پرشاد گنگولی

اور رابندر ناتھ تینوں صاحبزادوں کی تعلیم و تربیت ایک پرائیویٹ اتالیق کے سپرد کردی، اور اس طرح تینوں بھائیوں نے پرائیویٹ طور پر ہی ارتھمیٹک، جیومیٹری، ہسٹری، جغرافیہ، گرامر، اور بنگلہ، سنسکرت اور انگریزی زبانیں پڑھیں، اور ابتدائی سائنس میں بھی کچھ شد بد حاصل کرلی۔ لیکن ان علوم متداولہ سے زیادہ ان کی تعلیم موسیقی، جسمانی ورزش پر زور دیا گیا جس کے لئے ماہر فن استادوں کی خدمات حاصل کی گئیں یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کشتی بھی خوب لڑتے تھے۔ اپنے اس زمانہ کے حالات مرحوم نے اپنے مضمون "میرا بچپن" (My Boyhood Days) میں جو "وشوا بھارتی" نامی تماہی رسالہ میں شائع ہوا تھا، نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے تھے۔ اپنے مضمون میں مرحوم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ۱۸۶۸ء یعنی سات ہی برس کی عمر میں انھوں نے شعر و شاعری میں کس طرح قدم رکھا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فطری شاعر تھے۔ ۱۸۶۳ء میں مہرشی دیویندرا ناتھ نے موضع بولپور میں بیس بیگہ زمین خرید کر "شانتی نکیتن" کی بنیاد ڈال دی تھی۔ گیارہ برس کی عمر میں مرحوم بھی اپنے والد کے ساتھ وہاں گئے اور وہ فضا اس قدر پسند آئی کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اسی چھوٹے سے اسکول کو دنیا کی ایک مشہور ترین یونیورسٹی بنادیا ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں انھوں نے اپنے والد کے ساتھ شمالی ہند کی سیر کی۔ ایک مہینہ امرتسر اور چار مہینہ ڈلہوزی میں قیام کیا۔ اور اس دوران میں اپنے والد سے انگریزی زبان، گرامر اور علم نجوم سیکھتے رہے ۱۸۷۴ء میں شمالی ہند کی سیر و سیاحت سے واپس آکر سینٹ زیویرا اسکول میں داخل ہوئے۔ یہاں آ انھوں نے بارہ برس کی عمر میں اپنی ایک نظم "ابھلاشا" (خواہش) لکھی جو "تتو بودھنی پترکا" میں شائع ہوئی۔ تیرہ سال برس کی عمر میں آپ کے سر سے والدہ کا سایہ اٹھ گیا۔

ابتدائی شاعری | مرحوم کی جو نظمیں اب تک منظر عام پر آئی تھیں وہ سب گمنام تھیں۔ آپ کی پہلی نظم ۲۵۔ فروری ۱۸۷۵ء کے اخبار "امرت بازار پترکا" میں شائع ہوئی جو اس وقت ایک اینگلو بنگالی ہفتہ وار اخبار تھا۔ یہ نظم ۱۱۔ فروری ۱۸۷۵ء کے "ہندو میلہ" کے لئے لکھی گئی تھی، جو قوم پرست حضرات کے اہتمام سے سالانہ منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ سرچشمہ علم و فضل میں بھی روانی و طغیانی پیدا ہوتی گئی، اور مرحوم نے شیکسپیر کے مشہور ڈرامہ "میکبتھ" (Macbeth) کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا، جس کا کچھ حصہ "بھارتی" نامی بنگالی میگزین نے اپنے سالنامہ ۱۸۸۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے بعد "بھانو سنہا ٹھاکر" کے نام سے بن پھول نامی ایک طویل نظم لکھی۔ مرحوم کے بڑے بھائی دوجندر ناتھ ٹیگور نے "بھارتی" نامی ایک ماہوار رسالہ جاری کر رکھا تھا جس میں آپ اپنے مضامین نظمیں اور افسانے لکھا کرتے تھے اور کبھی کبھی دوسروں کی تصانیف پر تنقید عالیہ کی بھی داد دیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں لارڈ لٹن کے دہلی دربار والی نظم بھی

لکھی گئی۔ واضح ہو کہ اس سے پہلے ہندوستان میں ایک بہت زبردست قحط پڑ چکا تھا۔

سفر انگلستان ۲۰ ستمبر ۱۸۷۸ء کو مرحوم اپنے بھائی سیتا یندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ جو بعد میں انڈین سول سروس کے پہلے ہندوستانی ممبر ہوئے، تعلیم و تربیت کے لئے انگلستان کو روانہ ہوئے۔ اسی زمانہ میں ان کی نظموں کا سب سے پہلا مجموعہ "کوئی کہانی" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ انگلستان جا کر مرحوم برائٹن کے مشہور پبلک اسکول میں داخل ہو گئے۔ لیکن کچھ دنوں بعد تارکنا تھ پلیٹ (جو بعد میں سر ہو گئے تھے) مرحوم کو لندن لے آئے اور ان کو یونیورسٹی کالج میں داخل کرا دیا۔ جہاں انھوں نے لارڈ مارلے کے بھائی پروفیسر ہنری مارلے کی شاگردی میں انگریزی لٹریچر کی خوب تعلیم حاصل کی۔ انگلینڈ میں بھی مرحوم کو زیادہ تر دلچسپی موسیقی اور برٹش میوزیم سے رہتی تھی۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ اس زمانہ کی نظموں میں سب سے زیادہ مشہور نظم "بھاگنا ناری" (کشتیِ شکستہ) اور ایک منظوم قصہ "ٹوٹے ہوئے دل" ہیں۔

واپسیِ وطن | ۱۸۸۰ء میں مرحوم انگلستان سے ہندوستان کو واپس آ گئے اور اپنے دو ڈرامے جن میں گانے ہی گانے ہیں شائع کئے۔ ایک کا نام "والمیک پرتبھا" (یعنی والمیک کی شاعرانہ قوت تخلیقی) اور دوسرے کا نام "کلم جئیہ" یعنی "مہلک چوٹ" ہے۔ دونوں ڈرامے اسٹیج پر کھیلے گئے جنھیں بنگال کے مایۂ ناز ناول نویس بنکم چندر چٹرجی نے بھی دیکھا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں ریورینڈ کرشن موہن بنرجی کے زیر صدارت بتھین سوسائٹی کا جلسہ ہوا جس میں مرحوم نے اپنی سب سے پہلی پبلک تقریر کی۔ ۱۸۸۶ء میں "ساندھیہ سانگیت" کے نام سے اپنے مختلف گانوں کا مجموعہ شائع کیا۔ ۱۹۰۰ء میں مرحوم نے مسٹر موجمدار کی مدد سے بنکم چندر کے مشہور میگزین "بنگہ درشن" کو از سر نو زندہ کیا۔ اور اس زمانہ کے مشہور اہل قلم حضرات کی علمی امداد و اعانت حاصل کر لی۔ اس رسالہ میں آپ نے برٹش امپریلزم کی دست درازیوں کے خلاف ایک پرجوش مضمون لکھا تھا جس میں جنوبی افریقہ کے بوئروں کی تائید و حمایت کی گئی تھی۔

۱۹۰۱ء میں مرحوم نے اپنی خاندانی ریاست یعنی "ریاست ٹیگور" کی منیجری چھوڑ دی اور شانتی نکیتن میں آ کر رہنے لگے۔ جہاں آپ نے "بولپور برہمچریہ آشرم" نام سے ایک اسکول ہندوستان کے قدیم نمونہ پر جاری کیا۔ یہاں مرحوم طلبا کو خود تعلیم دیتے تھے۔ انھیں قصے کہانیاں سناتے تھے۔ ان کے ساتھ رہتے تھے اور اس طرح اپنا اخلاقی اثر ڈال کر ان کی زندگی مکمل کرتے تھے۔ اس زمانہ میں خاندان ٹیگور کی مالی حالت بھی خراب ہو گئی تھی۔ مگر باینہمہ مرحوم کے علمی، ادبی و سیاسی مشاغل بدستور جاری رہے بدقسمتی سے اس زمانہ میں لارڈ کرزن نے کلکتہ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستانیوں کے

چال چلن پر سخت حملہ کیا تھا، جس کا جواب مرحوم نے اپنے قلم سے دیا۔ اور اس میں بوڑوں کے خلاف برطانوی پروپیگنڈا کی دروغ گوئیوں کا پردہ فاش کیا۔ اور پان ایشیاٹک خیالات کا کھلم کھلا اظہار شروع کر دیا۔

۱۹۰۲ء میں مرحوم کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا جو اپنے پسماندگان میں دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ گئیں۔ چھ مہینے بعد یعنی مئی ۱۹۰۳ء میں مرحوم کی صاحبزادی رینکا فوت ہو گئی۔ بایں ہمہ مرحوم کا قلم جاری رہا اور وہ "بنگہ درشن" میں اپنے ناول "ناؤکا ڈوبی" (غرقاب کشتی) کے اقساط شائع کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں مرحوم نے "راج کٹمب" (خاندان شاہی) اور "گھورو گھوری" (اینٹ کا جواب پتھر) نے بڑے زبردست سیاسی مضامین لکھے۔

سیاسی زندگی | اسی زمانہ میں ہندوستان میں سودیشی کی تحریک جاری ہوئی جس سے مرحوم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اور تحریک مذکورہ کے متعلق ایک خاص جلسہ میں جو منروا تھیٹر کلکتہ میں زیر صدارت رامیش چندر دت، چیتنیہ لائبریری ایسوسی ایشن کے اہتمام سے ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا۔ مرحوم نے "سودیشی سماج" کے موضوع پر اپنا مشہور مضمون پڑھا، اور اس میں سماج کی از سر نو تنظیم و اصلاح کی صورت یہ بتائی کہ سوسائٹی کو انھیں مکتفی بالذات بنیادوں پر قائم کیا جائے جن پر پراچین بھارت کے دیہات قائم تھے۔ اور اسی کے ساتھ ہندوستان کی گھریلو صنعتوں اور فرقہ وارانہ اتفاق و اتحاد کو زندہ کیا جائے۔ جب لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال کے جواب میں بدیشی خصوصاً انگریزی مال کے بائیکاٹ کی تحریک جاری ہوئی تو مرحوم بھی اس میں سراپا غرق ہو گئے بلکہ تحریک کے زبردست لیڈر شمار کئے جانے لگے۔ لیکن ۱۹۰۷ء تک مرحوم کے سیاسی جوش میں ردعمل پیدا ہوا کیونکہ جن لائنوں پر سودیشی تحریک کو جاری کیا جارہا تھا وہ مرحوم کو پسند نہیں تھیں۔ اس لئے وہ تمام باتوں سے دست کش ہو کر اپنے شانتی نکیتن میں گوشہ نشین ہو گئے۔

یہ گوشہ نشینی ہی گویا مرحوم کے آئندہ دماغی عروج کا پیش خیمہ تھی۔ گوشہ عافیت میں جتنا زیادہ سکون ملا اتنی ہی مرحوم کے دل و دماغ نے ترقی کی، اور اسی کے بعد مرحوم کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا جس میں انھوں نے اپنے لافانی ادبی کارنامے انجام دئیے۔ مرحوم کا سب سے بڑا اور مشہور ناول "گورا" بالاقساط رسالہ "پرباسی" میں نکلنے لگا۔ اور اسی زمانہ میں مرحوم نے اپنا مشہور ڈرامہ "سوردوتسب" لکھا جسے شانتی نکیتن کے طلبا اور اسٹاف نے اسٹیج پر کھیلا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے اپنی سوانح عمری "بنگ بھاسکر کا میکھک" لکھی اور "راجہ" نامی ایک تمثیلی ڈرامہ تصنیف کیا۔ اور انگریزی افسانوں کی طرف بھی توجہ کی۔ چنانچہ آپ کا پہلا انگریزی افسانہ "ماڈرن ریویو" بابت مئی ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں "جیون سمرتی" کے نام سے اپنے سوانح حیات لکھے جو رسالہ "پرباسی" میں شائع ہوئے۔

سیر و سیاحت ۱۹۱۲ء میں شاعرِ اعظم پھر انگلستان تشریف لے گئے جہاں آپ نے مشہور مصور سر ولیم راتھنسٹین سے ملاقات کی سر ولیم نے اپنے دولت خانہ پر منتخب لوگوں کے جلسہ کا اہتمام کیا جس میں مرحوم نے اپنی بہت سی نظمیں سنائیں اور لوگوں کے دلوں پر سکہ جما دیا۔ لندن میں مرحوم کی ملاقات برنارڈ شا، ایچ جی ویلس، اسٹیفورڈ بروک، جان میسفیلڈ، بوڈکنسن، برٹرانڈ رسل، وغیرہ وغیرہ مشہور عالم ادیبوں سے ہوئی اسی زمانہ میں آپ کو ادبیات کا "نوبل پرائز" بھی ملا۔ اور دنیا بھر سے مبارکباد کے خطوط اور تار برسنے لگے۔ اور گورنمنٹ ہاؤس کلکتہ میں بنگال کے گورنر لارڈ کارمائیکل نے معززین کی ایک جماعت کثیر کے سامنے نوبل پرائز اور تمغہ آپ کی نذر کیا۔ اسی زمانہ میں آپ کو دنیا کی سیر و سیاحت کا شوق ہوا، اور یورپ، امریکہ، جاپان چین، مصر، ٹرکی، ایران اور بہت سے دوسرے ملکوں کی سیر کی اور ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے اور "ملک الشعراء ایشیا" کا خطاب پایا۔ ۱۹۳۰ء میں مرحوم ایک بار پھر سیر و سیاحت کو نکلے اور اس مرتبہ آپ روس بھی گئے۔ اس طرح مرحوم نے گیارہ بار سفر کئے۔

آخری ایام ہمارے شاعرِ اعظم پر دنیا بھر سے اکیڈیمک اعزازات کی بارش ہوتی رہی ۱۹۳۹ء میں شانتی نکیتن میں ایک "ہندی بھون" کھولا گیا جس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا۔ اور ۱۹۴۰ء میں مہاتما گاندھی نے بھی جا کر مرحوم سے نیاز حاصل کیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے شانتی نکیتن میں کانووکیشن کا ایک خاص جلسہ کر کے آپ کو "ڈاکٹر آف لٹریچر" کی ڈگری دی، مرحوم کو گورنمنٹ کی طرف سے بھی "سر" کا خطاب عطا ہوا جو بعد میں جلیانوالا باغ کے واقعہ سے متاثر ہو کر انھوں نے واپس کر دیا۔ ۱۹۴۱ء میں بھی جب وہ زندگی کی آخری منزل طے کر رہے تھے۔ ان کا ادبی شغل بدستور جاری رہا، اور انھوں نے اپنی سوانحعمری کی آخری قسط سے دنیا کو فیضیاب کیا۔ ان کو مرتے دم تک اپنی یونیورسٹی "وشو بھارتی" کا خیال رہا، اور چلتے چلتے بھی انھوں نے اپنی جائداد کا بہت بڑا حصہ اس کے نام وقف کر دیا۔ آہ ایسے آدمی دنیا میں کہاں پیدا ہوتے ہیں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اقوالِ زرّیں

زندگی بہار کا خوشنما اور حسین پھول ہے، اور موت خزاں کے زرد پتوں کے مانند ہے۔
ہم دنیا کا غلط مطالعہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہم کو دھوکا دیتی ہے۔
محبت شعور کی بیداری اور تکمیلِ احساس کا دوسرا نام ہے۔
گفتگو کی دلآویزی وہ دولت ہے جو محبت کی شدت سے پیدا ہوتی ہے۔

(ٹیگور)

تنقید کتب

ساز و آہنگ

یہ مولانا سیماب اکبرآبادی کی دلکش نظموں کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے۔ مولانا ممدوح اردو شاعری کے ماہر کامل تسلیم کئے جاتے ہیں اور آپ کا حلقہ تلامذہ بھی بہت وسیع ہے۔ اسلئے آپ کے کلام پر تنقید کرنا تحصیل حاصل ہے۔ البتہ اس کتاب کے مضامین سے ناظرین کو روشناس کر دینا ضروری ہے۔ اس میں مولانا کی اکیسٹھ مختلف نظمیں ہیں جو بہ لحاظ موضوعات پانچ ابواب میں تقسیم کی گئی ہیں۔ پہلے باب میں قومیت، سیاست اور وطنیت کے متعلق نظمیں ہیں۔ دوسرے میں مذہب اخلاق اور معاشرت سے بحث کی گئی ہے۔ مذہبی معتقدات پر نظمیں علیحدہ درج ہیں اور ایک علیحدہ باب میں بچوں کے لئے خاص نظمیں ہیں یوں تو اس مجموعہ کی سبھی نظمیں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں لیکن تیسرے باب کی نظموں میں جو حکیمانہ تنقید کی گئی ہے۔ وہ خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ صوفیوں کے سلسلے میں مولانا سیماب نے حافظ شیرازی کے مشہور مصرعہ کی تضمین کی ہے۔ صوفی کہتا ہے ؎

شب کو اکثر مصرعہ حافظ یہ تھا میں پڑھتا | "چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند"

اسی نظم کا ایک قابل قدر شعر یہ بھی ہے ؎

چیستان انسان کا انجام اور آغاز ہے | زندگی بھی اک معمہ، موت بھی اک راز ہے

بچوں کے لئے مولانا سیماب نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ بہت پیاری ہیں مگر ان نظموں میں بعض الفاظ ایسے آگئے ہیں جو کمسن بچوں کی سمجھ سے باہر ہیں، مگر حیف ہیں مولانا سیماب جیسے قادر الکلام شاعر ذرا سی فکر کے بعد زیادہ عام فہم لفظوں میں بدل سکتے تھے

پانچویں باب کے آخر میں "تاج محل" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، اُسے کیا بلحاظ بلندی تخیل اور کیا بلحاظ منظر نگاری اور ترکیبوں کی شگفتگی اگر بیانیہ شاعری کا شاہکار سمجھا جائے تو بیجا نہ ہوگا بہر حال یہ مجموعہ اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں میں آپ اپنی نظیر ہے۔ اسکا حجم ۲۰۰ صفحات ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ قصر الادب، دفتر "شاعر" آگرہ۔

کلیات میر تقی میر

کارپردازان مطبع منشی نولکشور نے خدائے سخن" میر تقی میر کے جملہ اصناف کلام کا ایک نفیس مجموعہ ترتیب جدید کے ساتھ خاص اہتمام سے شایع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں میر کے چھ دیوان غزلیات بترتیب حروف تہجی، مختلف اشعار، تضمین، مثلث، مخمس، رباعیات، مستزاد، قطعات، ترکیب بند، قصائد، مثنویاں، ہجویات، مرثیے، ساقی نامے، واسوخت سبھی تمام وکمال درج کر دیئے گئے ہیں مختلف نسخوں کو ملا کر اسکی تصحیح بھی کردی گئی ہے۔ جہاں کہیں دوسرا نسخہ ملا وہ حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے غزلیں اور دوسری چیزیں اس طرح درج کی گئی ہیں کہ ہر غزل اور ہر نظم کے چاروں طرف سرخ جدول کردی گئی ہے جس سے ہر صفحہ میں رنگینی اور نظر فریبی پیدا ہو گئی ہے۔ شروع میں مولانا عبدالباری آسی نے جامع اور ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں مختلف ذرایع سے امداد لیکر میر کی زندگی کے خاص خاص واقعات پر بحث کی گئی ہے مولانا آسی نے اس مقدمے میں اکثر مقامات پر دلچسپ نکات پیدا کیے ہیں۔ میر کو ہوئے تقریباً ڈیڑھ سو سال گذر چکے ہیں، مگر اُن کی زبان اسقدر صاف اور سلیس ہے کہ آج بھی ہم اسے "ٹکسالی زبان" سمجھ سکتے ہیں، پھر بھی اتنے عرصہ میں بہت سے الفاظ محاورے متروک ہو گئے ہیں جو اب بولے نہیں جاتے، اور بہت سی ترکیبیں غیر مانوس ہو گئی ہیں۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ شامل کردی گئی ہے جس میں ایسے ضروری لفظوں اور محاوروں کی تشریح کردی گئی ہے۔ بہرحال اب تک میر کے کلام کے جتنے مجموعے شایع ہو چکے ہیں ان میں کلیات کا درجہ بہت ممتاز ہے اور اسکی اشاعت پر ہم نامور مطبع منشی نولکشور کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ اس مطبع نے اس مجموعے کو شایع کر کے اردو کی بڑی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ، جلد، سب اعلیٰ ہے اس مجموعہ کا حجم ایکہزار صفحات ہے۔

ملنے کا پتہ: مینیجر صاحب نولکشور پریس لکھنؤ۔

خطوط غالب (جلد اوّل)

رقعات غالب کی بہت سی جلدیں مختلف ناموں سے شایع ہو چکی ہیں، ان میں عود ہندی اور اردوئے معلیٰ، بہت پرانی ہیں لیکن انمیں مرزا کے بہت سے خطوط نہیں ہیں جو انھوں نے اپنے شاگردوں اور احباب کے نام لکھے تھے۔ اس کے علاوہ ان کتابوں میں تحریف یا سہو کاتب ہو نیسے اکثر اصلی عبارت مسخ ہو گئی ہے شکر ہے کہ مولوی مہیش پرشاد صاحب صدر شعبہ اردو و فارسی ہندو یونیورسٹی بنارس نے بڑی تلاش و تحقیق اور عرق ریزی سے سالہا سال کی محنت کے بعد خطوط غالب کے مختلف مجموعوں کی عبارتوں کا مقابلہ کر کے خطوط کی تصحیح کی انھوں نے غالب کے دیگر خطوط بھی جو مطبوعہ کتب میں موجود

نہیں تھے مختلف ذرائع سے جمع کر کے جدید ترتیب کے ساتھ حتی الامکان تاریخوار اس کتاب میں درج کر دیئے ہیں بعض خطوط کے عکس بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں انبکہ جو کسی مطبوعہ کتاب میں نہیں تھے اور جو خود مرزا غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مختلف بزرگوں کے ادبی خزانوں میں محفوظ تھے انھیں میں ایک خط وہ بھی ہے جو مرزا نے میر مہدی مجروح کے نام لکھا تھا۔

غالب کے خطوط اردو لٹریچر کا خزانہ ہیں۔ جسے جناب منشی مہیش پرشاد صاحب نے اس مجموعے میں محفوظ کر دیا ہے۔ شروع میں مولف کا دیباچہ بھی ہے جس میں ان خطوط کے متعلق تلاش و تجسس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی پروفیسر عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ غالب نے اصل میں کیا لکھا ہوگا اور کتابوں میں کیا چھپ گیا ہے۔ غرض ڈاکٹر صاحب کی توجہ سے یہ مجموعہ خاص طور پر قابل قدر ہو گیا ہے مولوی مہیش پرشاد صاحب نے بھی اس مجموعے کو مرتب کر کے اردو ادب کی ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے جسکے لیے قدردانان اردو کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیے۔ یہ مجموعہ اردو ٹائپ میں چھپا ہے اور چار سو صفحات سے زائد پر ہے۔ قیمت ساڑھے چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ: ہندستانی اکیڈمی الہ آباد۔

بیان غالب

کلام غالب پر متعدد شرحیں موجود ہیں۔ موجودہ شرح کی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں جناب آغا محمد باقر صاحب۔ ایم۔ اے نے اختصار کے ساتھ ان تمام شرحوں کو یکجا کر دیا ہے جن اشعار پر شارحین میں اختلاف ہے ان کو بھی واضح کر دیا گیا ہے اسطرح پڑھنے والا آسانی سے یہ سمجھ جائے گا کہ اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں دیوان غالب کی یہ ایک عمدہ شرح ہے جس نے دوسری شرحوں کی ضرورت کو کم کر دیا ہے۔ طالب علموں کے لیے اسکا مطالعہ ضروری ہے۔ شروع میں پوری غزل دیدی گئی ہے اسکے بعد ہر شعر کا مطلب درج ہے۔ قیمت مجلد ڈھائی روپیہ۔ غیر مجلد دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

مغل بادشاہوں کی ہندی

اس کتاب میں پنڈت چندربلی پانڈے نے یہ دکھایا ہے کہ اردو کب اور کیونکر پیدا ہوئی۔ پنڈت جی نے اپنے دعوے کی دلیل میں حسب ضرورت حوالے بھی دیئے ہیں جو قابل غور ہیں۔ میرے خیال میں اردو کے ہر بہی خواہ کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ کتاب ہندی میں ہے ملنے کا پتہ۔ ہندی ناگری پرچارنی سبھا کاشی۔ قیمت آٹھ آنہ ۸/

لطفِ سخن

(حضرت آرزو لکھنوی)

یہ داستانِ دل ہے، کیا ہو ادا زباں سے
آنسو ٹپک رہے ہیں لفظیں ملیں کہاں سے

ہے ربط دو دلوں کو بے ربطیِ بیاں سے
کچھ وہ کہیں نظر سے کچھ ہم کہیں زباں سے

یہ روتے روتے ہنسنا ترتیبِ ذکرِ غم ہے
آیا ہوں ابتدا پر چھیڑا تھا درمیاں سے

حاصل تو زندگی کا تھی زندگی یہیں کی
اب میں ہوں اِک جنازہ اُٹھوا دو آستاں سے

اِس طُولِ خامشی کا زورِ بیاں بھی دیکھا
تھی بات میرے دل کی نکلی تری زباں سے

جب حُسنِ خود نما ہے اور عشقِ رخنہ افگن
اس کشمکش میں پردہ نکلے گا درمیاں سے

میدانِ امتحاں میں اے بے غرض محبت
دل کی زمین تو نے ٹکرا دی آسماں سے

اے جذبِ شوقِ منزل ممنونِ غیر کیوں ہوں
خود راستہ بدل کر بچھڑا ہوں کارواں سے

ہر گام پر ٹھٹھکنا، ہر بار مڑ کے تکنا
او مسکرانے والے کیا لے چلا یہاں سے

آنکھوں سے ہے یا عیاں کی شعلے نکل رہے ہیں
تنکے دبائے منہ میں نکلا ہوں آشیاں سے

دل کا سکوں گنوا کر ہوں آرزو پشیماں
کچھ لیکے رکھ نہ چھوڑا کیوں جنسِ رائگاں سے

مسٹر نقی احمد خاں فاطمی، بی۔اے، ارشاد

آہ اے ضعف! عجب زمزمہ پرداز ہوں میں
ساز میں مِل کے جو رہ جائے وہ آواز ہوں میں

نالۂ دل تجھے اللہ سلامت رکھے
نَے سے نکلے ہوئے نغمے کا ہم آواز ہوں میں

کیوں نہ گونج اُٹھے تری محفلِ عشرت اے دوست
اِک شکستِ طربِ ساز کی آواز ہوں میں

نالۂ دل پہ فدا جس کے فغانِ بلبل
ہم صفیرِ چمنِ سوز کا وہ ساز ہوں میں

دلِ پُر غم ہے کہ ہے مرکزِ اسرارِ وجود
ہستیِ کون و مکاں جس سے ہے وہ راز ہوں میں

منشی سکھدیو پرشاد سنہا بسمل الہ آبادی

یہ مجھ کو غم ہے کس لئے، یہ میں ہوں کیوں ملال میں
وہ آئے ہیں نہ آئیں گے کبھی مرے خیال میں

ادھر ہوں میں ملال میں اُدھر ہے دل ملال میں
کوئی نہیں خیال میں تو کچھ نہیں خیال میں

وہ اس طرف وہ اُس طرف وہ ہر کہیں وہ ہر جگہ
جو ہے کمی تو صرف ہے مری ہی دیکھ بھال میں

کرم کی شان اور ہے غضب کی شان اور ہے
کبھی کوئی جلال میں کبھی کوئی جمال میں

جواب کیا جواب تھا، جواب لاجواب تھا
کلیم اُلجھ کے رہ گئے سوال ہی سوال میں

مرے کہ تو جیئے مگر یہ کہہ دے بسمل ادا
کمی کرے نہ وہ چھری نہ آئے فرق چال میں

(پنڈت پرتھی ناتھ شوق)

تارے اُتار لائی تخئیل آسماں سے
ذوقِ طلب کی رفعت پہونچی کہاں کہاں سے

دیر و حرم میں ہر سُو ڈھونڈھا نظر نہ آئے
جلوے دکھا رہے ہو پوشیدہ تم کہاں سے

فطرت میں ہو وہ پنہاں یا حُسن میں نہاں ہو
سوزِ تپش سے مطلب دل کو ملے جہاں سے

صیاد کچھ نہیں ہے صحنِ چمن میں اپنا
وابستہ اک خیالی دنیا ہے آشیاں سے

صورت ہی اُس کی حالِ ابتر کی ترجماں ہے
پھر شوق کیا سنائے رودادِ غم زباں سے

(منشی تلوک چند محروم بی۔اے)

مایوس ہو کے میری بے ربطیِ بیاں سے
مانوس ہو گیا دل ہنگامۂ فغاں سے

دیر و حرم کے جھگڑے سب دُور ہیں یہاں سے
دنیا الگ ہے اپنی دنیائے این و آں سے

دنیائے رنگ و بو میں عنقا ہے دلنوازی
بیگانہ گوشِ گُل ہے بلبل کی داستاں سے

جانِ جہاں وہ خود ہے اور جسم دہر فانی
قائم نظامِ عالم ہے ربطِ جسم و جاں سے

وہ بھی تری عنایت یہ بھی تری عنایت
باران و برق دونوں آتے ہیں آسماں سے

اس جلوہ گاہ میں ہیں مسحور دیدہ و دل
جاں ہے دوچار یارب اک سخت امتحاں سے

پائے طلب نہیں یہ وقفِ روش ہے لیکن
دستِ سوال میرا اونچا ہے آسماں سے

کیا دوزخی نظارے دکھلائے ہیں فلک نے
انساں پہ آگ انساں برسائے آسماں سے

وحشت کے ہاتھ بک کر کیا کر رہا ہے انساں
ویرانہ بن رہے ہیں بازار کہکشاں سے

پاتے ہیں اہلِ دل بھی مضمون پسند خاطر
اہلِ زباں بھی خوش ہیں محروم کی زباں سے

نوٹ: حضرت آرزو، حضرت شوق اور منشی تلوک چند صاحب محروم کی غزلیں آل انڈیا مشاعرہ کانپور کے لئے جو ریڈ کراس فنڈ کے سلسلے میں ۲۶ اپریل ۱۹۴۱ء کو ہوا تھا لکھی گئی تھیں۔

چھوٹا ناگپور اردو مرکز رانچی

اُردو اور ہندی کی ناگوار بحث عرصہ سے جاری ہے۔ یہ بحث اُن لوگوں کے لئے بیحد تکلیف دہ ہے جو ان دونوں زبانوں کو اپنی زبان سمجھتے ہیں، اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو دونوں زبانوں کو اپنی زبان نہیں سمجھتے وہ ایک بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ گنگا اور جمنا ہندوستان کی دو ندیاں ہیں، دونوں کی اپنی اپنی خصوصیتیں ہیں، اور اپنی جگہ مفید، یہ کہاں کی منطق ہے کہ گنگا کی ترائی میں بسنے والے اور اُسکی لہروں سے دلچسپی لینے والے یہ چاہیں کہ جمنا خشک ہو جائے، اُس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اُردو اور ہندی دونوں کا اپنا اپنا رنگ ہے، اُردو میں ایک خاص صفائی ہے اور ہندی میں ایک خاص گھلاوٹ اور رس ہے۔ اس لئے اصلی ضرورت تو اس بات کی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی معاون بنکر ترقی کریں۔ لیکن ملک کی بدنصیبی ہے کہ یہاں ہر بات پر ایک جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اُردو ہندی کے مسئلے میں بھی یہی ہوا۔ لہٰذا ان دوستوں نے بہت سا وقت اسی فضول جھگڑے میں خراب کر دیا۔ اگر یہ آپس کی جنگ میں وقت خراب کرنے کی جگہ تعمیری خدمت انجام دیتے تو آج ہماری یونیورسٹیوں میں اُردو اور ہندی زبان ہی میں تعلیم دی جا سکتی۔

بہرحال واقعات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کیجا سکتیں اور یہ واقعہ ہے کہ خیرخواہانِ ہندی نے اُسکی اشاعت میں جس سرگرمی سے حصہ لیا اُس کا عشر عشیر بھی اُردو کے بہی خواہوں نے نہیں کیا۔ آج سارے ملک میں سیکڑوں ہندی ادارے ہندی کی اشاعت و ترقی میں مصروف ہیں۔ لیکن اُردو کے بہی خواہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں البتہ جب بیٹھے بیٹھے طبیعت اُکتا جاتی ہے تو کوئی کانفرنس کر لیتے ہیں یا کوئی مشاعرہ، اور سمجھتے یہ ہیں کہ اُردو کی زندگی کے لئے یہ کافی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو البتہ اُردو کے لئے خود کو وقف کر چکے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک وسیع پیمانہ پر جو کچھ تعمیری کام ہوا ہے اسی انجمن نے کیا ہے۔ اور جب سے انجمن کا صدر دفتر حیدرآباد سے دہلی آیا ہے وہ اُردو کی اشاعت میں آگے قدم بڑھاتی جا رہی ہے۔ چنانچہ اب اس نے کتابوں کی اشاعت، جلسے اور کانفرنسوں کے علاوہ ایک اور کامیاب قدم آگے بڑھایا ہے جو زیادہ مفید اور مُوثر ہے۔

ہماری مراد چھوٹا ناگپور اُردو مرکز سے ہے۔ یہ مرکز رانچی میں اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ وہاں کے باشندوں میں منظم طور پر اُردو کی اشاعت کا کام کیا جا سکے۔ چھوٹا ناگپور میں قدیم اقوام آباد ہیں جو

اُردو سے بالکل ناواقف ہیں، گو ان میں تعلیم بہت زیادہ ہے۔

چھوٹا ناگپور اُردو مرکز نے اب آدی باسیوں میں اُردو کی اشاعت کا کام باضابطہ طور پر شروع کر دیا ہے۔ اور جو اطلاعیں آئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرکز اپنی عمر کے لحاظ سے اپنے مقصد میں خاصی کامیابی حاصل کر رہا ہے۔ اور اکابرانِ ملک نے اس کی امداد شروع کر دی ہے۔ چنانچہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی نے مرکز کو پچاس روپیے ماہوار کی امداد دینا منظور کیا ہے۔ ان کے علاوہ جناب شعیب قریشی مدار المہام بھوپال اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی پروفیسر جامعۂ عثمانیہ نے پانچ روپیے ماہانہ کی رقم عنایت کی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ دوسرے حضرات بھی جو اُردو سے دلچسپی رکھتے ہیں اس مرکز کی امداد کی طرف جلد ہی توجہ فرمائیں گے۔　　(س ع)

ایڈیٹر صاحب کی آنکھوں میں جو تکلیف ہے اس کی اطلاع پچھلے پرچہ میں دی جا چکی ہے۔ مئی میں پٹنہ سے واپسی پر اُن کی داہنی آنکھ میں درد معلوم ہوا تھا جو خفیف علاج کے بعد فوراً اچھا بھی ہو گیا تھا لیکن جون میں جب وہ راجپور میں مقیم تھے تو یہ درد پھر اُٹھا، مگر باوجود تکلیف کے روزانہ مشاغل کے علاوہ لکھنے پڑھنے کا کام بھی اُسی رفتار سے جاری رہا۔ واپسی پر جب میڈیکل کالج لکھنؤ میں معائنہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ پتلی کھسک گئی ہے (Detachment of retina) چنانچہ ۲۲۔ جولائی کو وہ کلکتہ تشریف لے گئے، لیکن وہاں ڈاکٹر کا کوئی اُمید افزا جواب نہ ملنے پر ایک ہی ہفتہ میں واپس آنا پڑا۔ اسی اثنا میں بمبئی کے مشہور معالج چشم ڈاکٹر ٹی۔ پی۔ یاماجی سے مشورہ لیا گیا جنھوں نے فوراً بمبئی آنے کی رائے دی چنانچہ ۱۳۔ اگست کو کامیابی کے ساتھ آپریشن ہو گیا اور ایک ہی ہفتہ کے بعد پٹی کھولنے پر کامیابی کی پوری اُمید نظر آئی۔ اُمید ہے کہ ستمبر کے پہلے ہفتہ تک اُن کو اسپتال سے باہر آنے کی اجازت مل جائے گی۔

جولائی کا پرچہ ایڈیٹر صاحب خود مرتب کر کے گئے تھے۔ موجودہ پرچہ کا بھی زیادہ حصہ انھیں نے مرتب کیا ہے، بلکہ اس تکلیف کے زمانہ میں ستمبر کے لئے بھی چند مضامین کی وہ نظر ثانی کر گئے ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہوں، آمین　　(بھوشن)

اس پرچہ کا آخری فارم پریس میں تھا کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی صاحب کے افسوسناک انتقال کی اطلاع ملی۔ عرصہ سے آپ تپ دق جیسے مہلک مرض میں مبتلا تھے۔ افسوس کہ ۲۰ اگست کو آپ نے انتقال فرمایا اور ہندوستان کا ایک بلند پایہ مزاح نگار عالم جوانی میں داغ مفارقت دے گیا۔

افسوس ہے، ۲۷ اگست کو جناب فانی بدایونی کا حیدر آباد میں انتقال ہو گیا۔

THE ZAMANA, SEPTEMBER 1941 REGD. No. A147

زمانہ

مرتبہ:- دیا نراین نگم

جلد ۷۷	ستمبر ۱۹۴۱ء	نمبر ۳

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (۵) — بیرون ہند آٹھ روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

نمونہ سات آنہ (۷)

زمانہ

جلد ۷۷ — ستمبر ۱۹۴۱ء — نمبر ۳

تعلیم کے نئے اصول

(۱) دیہاتی مدرسے

از مسٹر محمد بشیر علی صدیقی بدایونی، ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

اس زمانے میں تعلیم کا مفہوم وہ نہیں رہا ہے جو اُنیسویں صدی میں یا بیسویں صدی کے آغاز میں تھا۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ لیکن میرا مطلب اس سے ہرگز یہ نہیں ہے کہ اِس سے قبل کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، اور کسی نئے اُصول کا طریقۂ تعلیم میں استعمال نہیں کیا گیا۔ روسیو، پستالوزی فروبل اِن سب نے تعلیم کے نظریوں میں خوشگوار تبدیلیاں پیدا کیں، اور تعلیم کی تاریخ میں ان کا نام عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔ تعلیم کوئی ایک جگہ رہنے والی چیز تو ہے نہیں کہ اس کے اُصولوں میں کوئی تبدیلی نہ ہو بلکہ وہ تو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے، نئے تجربات کئے جاتے ہیں، نئے نظریات قائم کئے جاتے ہیں، پُرانے اُصولوں کو جدید تحقیقات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے اور ملک کی ضرورت اور وقت کے مطابق ان میں ترمیم بھی کی جاتی ہے "نئی تعلیم" New Education کی اصطلاح سے اب ہمارے کان تھوڑے بہت آشنا ہو چکے ہیں، اور نئی تعلیم کے وفد Delegation. نے ہندوستان کا چند سال ہوئے دورہ بھی کیا تھا۔ اس کے بعض اراکین نے اس موضوع پر الہ آباد، علی گڈھ، بنارس وغیرہ میں تقریریں بھی کی تھیں۔ نہایت افسوس ہے کہ ہمارے دیہاتی مدارس باوجود ٹریننگ حاصل کرنے کے اس کی اہمیت کو نہیں محسوس کرتے، اور ان میں سے بیشتر اُسی

پرانے ڈھرے پر تعلیم دیتے ہیں (جیسے کتابیں رٹانا کہنا زیادہ موزوں ہوگا) جیس پر کہ میں پچیس سال پیشتر ان کے پیشرو تعلیم دیتے تھے۔ مجھے کئی ایسے دیہاتی مدرسوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو باوجود کافی بحث و مباحثہ کے اسی بات پر قائم رہے کہ تعلیم کا جدید مفہوم تصوری ہے اور اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ ان اُستادوں کا سب سے زیادہ اصرار امتحان کی تیاری پر تھا غالباً وہ اس کو سب سے زیادہ اہم سمجھتے تھے۔ تعلیم کا جدید مفہوم بچّہ کی انفرادیت کو قائم رکھنے اور اس کی صلاحیتوں کو اُبھارنے پر بہت زور دیتا ہے، وہ بچّہ کو سوسائٹی کا ایک کامیاب رُکن بنانا چاہتا ہے۔

تعلیم کا جدید نظریہ بچّہ کے نفسیاتی مطالعہ پر بہت زور دیتا ہے۔ علم النفس کے ابتدائی اصولوں کو جانے بغیر بچّوں کو تعلیم دینا دراصل اُن کی فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ جو استاد بچّہ کی جبلت کے خلاف اُسے تعلیم دیتا ہے وہ ایک سماجی جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ علم النفس کی جدید تحقیقات نے معلمین کے لئے نئی معلومات کا ایک ذخیرہ فراہم کردیا ہے۔ اور جدید اصولوں پر تعلیم دینے والے مدرس کا فرض ہے کہ وہ ان کے سمجھنے کی کوشش کرے۔ زندگی نئے نئے تجربات کا دوسرا نام ہے۔

تعلیم کا جدید نظریہ پرانے ڈھرے پر پڑھانے والے اُستادوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اور پڑھانے کے نئے طریقوں پر زور دیتا ہے۔ کتابیں رٹانا بچّوں کی اختراعی قوت کو سلب کرنا ہے۔ تعلیم کے نئے طریقے مثلاً منصوبی طریقہ (Project Method) ڈالٹن پلان منٹسوری طریقہ سب بچّہ کی صلاحیتوں کے اُبھارنے میں معاون ہوتے ہیں۔ آجکل کھیل اور تعلیم میں کچھ فرق نہیں سمجھا جاتا، بلکہ تعلیم میں کھیل اور کھیل میں تعلیم شامل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

بچّہ کا احترام:۔ جدید نظریہ بچّہ کو ایک محکوم کی حیثیت سے پیش نہیں کرتا، وہ اس کا احترام کرتا ہے، اور اس پر اچھے دائمی اثرات ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچپن میں جو عادتیں پڑجاتی ہیں وہ زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ اُستاد اپنی لیاقت، اپنے طرزِ عمل اور ہمدردی سے بچّے میں اچھی عادتیں پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

بچّہ کی شخصیت کی افزائش:۔ تمام بچّوں کو ایک لکڑی سے ہانکنا اصولی غلطی ہے ہر بچّہ اپنی مخصوص شخصیت کا مالک ہے، وہ سماج کا فرد ایک رکن ہے۔ لیکن ہم اُس کی انفرادی ضرورتوں کو کسی طرح نظرانداز نہیں کرسکتے۔ یہ سچ ہے کہ بہت سی باتیں بچّوں میں یکساں

دتی ہیں، لیکن پھر بھی کوئی دو بچے بالکل ایک سے نہیں ہوتے۔ جدید نظریہ بچہ کی انفرادی مشکلات دحل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اُسے اپنے ماحول میں اچھی چیزیں اپنی ضرورتوں کے موافق نخب کرنے کا پورا موقعہ دیتا ہے۔ اس طرح بچہ کو اپنی اختراعی قوتیں اُبھارنے میں مدد ملتی ہے

بچہ کی شخصیت اور اسکول:۔ جدید تعلیم بچہ کی شخصیت پر صرف اس صورت میں زور دیتی ہے جب وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کام کرے۔ جب بچہ کا تعلق دوسرے بچوں سے ہوگا تو اُس کی پوشیدہ قوتیں بیدار ہونگی اور وہ ان سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکے گا۔ اسکول میں ایسے مواقع فراہم کرنے چاہئیں جن سے بچے مل کر کام کرنا سیکھیں۔

اتحاد و اتفاق:۔ اسکول میں بچوں کی انجمنیں (Socities) بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اسکاؤٹ کیمپ، تقریر کرنے کی مجلسیں، فوٹو گرافی کی انجمن، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال کے کلب اور عجائب خانہ (Meuseum) ان کی تعلیمی اہمیت سے غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا۔ اگر کسی ہوشیار اور لائق مدرس کی سرپرستی حاصل ہو جائے تو بچوں کی یہ انجمنیں ایک چھوٹا سا خاندان معلوم ہونگی، جن میں ہر ایک بچہ اپنے جوش اور ولولہ، خود اعتمادی اور قوت فیصلہ کا اظہار کر سکے گا:۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ذہنی آزادی:۔ جدید تعلیم اس بات پر زور دیتی ہے کہ بچہ کو ایسا ماحول فراہم کیا جائے کہ وہ ذہنی آزادی حاصل کر سکے۔ وہ چیزوں کے متعلق خود رائے قائم کرنا سیکھے اور اُن کے سمجھنے کی کوشش کرے۔ دوسروں کی بتائی ہوئی باتیں اور اُصول ممکن ہے کہ اچھے ہوں لیکن جب تک اُنھیں تجربہ کی کسوٹی پر نہ کسا جائے کوئی خوشگوار نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

انبساط و دلجمعی کے لئے تعلیم:۔ جدید تعلیم اس بات پر زور دیتی ہے کہ بچہ ہنسی خوشی پڑھنا لکھنا سیکھے۔ جب کام "بیگار" کی شکل اختیار کر لیتا ہے اُس وقت اس کو چھوڑ دینا مناسب ہے ایسا کام کرنے سے بجائے فائدے کے اُلٹا نقصان ہونے کا احتمال ہے۔ اُستاد کو نئے طریقوں کا استعمال کرنا چاہیئے تاکہ بچوں کی دلچسپی برابر قائم رہے۔ اگر پڑھنے لکھنے میں کھیل کود کا لُطف آ جائے تو بہت اچھا ہے۔ حرفوں کے ذریعے جو تعلیم دی جاتی ہے اُس میں سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ بچے سُوت کاتتے وقت تکلی چلاتے وقت، باغبانی کرتے وقت یہ محسوس نہیں کرتے کہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں بلکہ ان کو تعلیم غیر شعوری طور پر خود ہی حاصل ہو جاتی ہے۔

مدرسۂ عمل:۔ جدید تعلیم "کتابی مدرسہ" کی بجائے "مدرسۂ عمل" پر زور دیتی ہے۔ مدرسۂ عمل میں بچے کتابوں کو محض حوالہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مدرسہ ایک قسم کی تجربہ گاہ ہو جاتا ہے اور ہر بچے کو موقعہ ملتا ہے کہ وہ اپنے حسب ضرورت نئے نئے تجربے کرے۔ اپنے تجربہ سے وہ جو کچھ سیکھتا ہے وہ کتابی معلومات سے کہیں زیادہ اثرات میں دیرپا ہوتا ہے۔ امریکہ کے مشہور فلسفی اور ماہر تعلیم جان ڈیوی نے شکاگو میں اسی غرض کے لئے بجائے ایک معمولی مدرسہ کے مدرسۂ عمل قائم کیا تھا۔ اور بچوں کو منصوبی طریقہ سے تعلیم دیتے تھے۔ اس میں ان کو اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ انھوں نے تعلیم کے متعلق خود اپنے نظریات قائم کئے اور دنیا کے صف اول کے ماہران تعلیم میں ان کا شمار ہونے لگا۔ آڈلف فیریئر (Adolph Farrier.) نے اپنی مشہور کتاب "مدرسۂ عمل" میں اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ بچہ کی دماغی تربیت کے ساتھ ہاتھ اور آنکھ کی بھی تربیت ہونا ضروری ہے۔ مدرسۂ عمل میں بچہ بیکار نہیں رہتا کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔

جدید تعلیم کے ان نظریوں کے ماتحت اگر ہم اپنے یہاں کے دیہاتی مدرسوں کو دیکھیں اور اُن کے طریقۂ تعلیم پر غور کریں تو شاید اِن اصولوں کے متعلق ہمیں تھوڑی دیر کے لئے کہنا پڑے "ایں خیال است و محال است و جنوں"۔ بیشتر دیہاتی پرائمری مدارس میں صرف ایک یا دو معلم ہوتے ہیں۔ زیادہ بچے ان کے سپرد کئے جاتے ہیں، اُن کی تنخواہیں قلیل ہوتی ہیں (۷ روپیہ ماہوار یقیناً ناکافی ہیں) اُن کو شہر کی سی سہولتیں بھی مہیا نہیں۔ ان کو تمام مضامین پڑھانا پڑتے ہیں اور اس طرح حالانکہ وہ جدید طریقوں سے واقف ہوتے ہیں لیکن ان کا استعمال نہیں کرتے۔ کئی مرتبہ میرے طالب علموں نے مجھ سے کہا کہ آپ کے بتائے ہوئے جدید اُصول سر آنکھوں پر لیکن ان پر عمل کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ غالباً اس سے تو کوئی دیہاتی پرائمری اسکول کا مدرس انکار نہیں کر سکتا کہ سنٹرل یا نارمل اسکول چھوڑنے کے بعد تعلیم کے متعلق اُن کے خیالات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر وہ طبیعت پر تھوڑا سا جبر کرکے اِن اُصولوں پر پڑھائیں تو گو شروع میں اُن کو دقتیں ضرور ہونگی لیکن بچوں کو اس سے بہت فائدہ پہونچے گا اور اُن کی اختراعی قوتیں اُبھر آئیں گی۔ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت قوم کی تعمیر ہے۔ ہمارے دیہاتی مدرس جغرافیہ پڑھانے میں بجائے لوہے اور شیشے کے گلوب کے کارڈ بورڈ کا گلوب استعمال کر سکتے ہیں ماڈل نرم اور چکنی مٹی کے اچھی طرح بنا سکتے ہیں۔ نقشے بھی بجائے دبیز کاغذ پر تیار کرنے کے معمولی کاغذ پر تیار کئے جا سکتے ہیں اور اب بنیادی طریقۂ تعلیم (Basic Education.) کے رائج

ہوجانے سے ان کی یہ مشکلیں ایک حد تک خود بخود رفع ہوجاتی ہیں۔ وہ بچوں کو کاتنے، بُننے تکلی چلانے، باغبانی کا کام کرنے میں مشغول رکھ سکتے ہیں۔ جب وہ شہر کسی اپنے کام سے آئیں تو بچوں کے حسب مذاق تصویریں اور نقشے خرید کر لے جا سکتے ہیں۔ اس تھوڑی سی رقم خرچ کرنے سے وہ بچوں کو ایک غیر فطری طریقۂ تعلیم سے بچا لیں گے۔

دیہاتی مدرسوں کا معائنہ سال میں دو تین مرتبہ ہوتا رہتا ہے، لیکن جب تک معلموں کی ذہنیت نہ بدلے گی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر تیسرے سال دیہات کے معلموں کو تین ماہ کے لئے سنٹرل یا نارمل اسکولوں میں پھر بھیجا جائے یا بہت سے سنٹرل اور نارمل اسکولوں میں پرانے طلبا کا جو سالانہ اجتماع ہوتا ہے اس میں محکمہ ڈپٹی انسپکٹروں کے معرفت پوری تنخواہ پر چھٹی دے تاکہ وہ شامل ہوسکیں۔ اور اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور دوسرے اساتذہ تعلیمی نمائش اور اسی قسم کی دوسری چیزیں اس دوران میں کریں۔ پرانے طلبا کے سامنے نمونے کے سبق نئے طلبا اور اُن کے اساتذہ پڑھائیں، تقریریں کریں اور اہم تعلیمی مباحث پر سیر حاصل بحث کی جائے۔ علاوہ ازیں پرانے طلبا سے کسی تعلیمی موضوع پر مضامین لکھائے جائیں اور اُن کی ہمت افزائی کے لئے اسکول تمغے یا کتابیں وغیرہ انعام میں دے۔ ایک دوسری کمی جو میں محسوس کرتا ہوں وہ نارمل اسکولوں میں مطبوع رسالوں کا نہ ہونا ہے قلمی رسالے اس کمی کو پورا نہیں کرسکتے۔ اگر تمام اس قسم کے اسکولوں کے لئے محکمہ ششماہی یا سالانہ ایک رسالہ اردو اور ہندی میں شائع کردیا کرے تو میرے خیال میں دیہاتی مدرسوں کو اس سے بہت فائدہ پہونچے گا۔ مضامین اساتذہ نئے طلبا اور پرانے طلبا لکھیں گے اور اس طرح ہر دیہاتی مدرس کے ہاتھ میں سال کے آخر میں ایک کتاب ہوگی جو اُسے نئی تعلیمی تحریکوں سے واقف کرے گی۔ لیکن اس قسم کے رسالوں کا چندہ بہت کم رکھنا چاہیئے تاکہ ہر ایک مدرس خرید سکے۔

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے آبادی کا ایک بہت بڑا حصّہ دیہاتوں میں ہے۔ اگر یہاں کے بچوں کی تعلیم صحیح اُصولوں پر ہوگی تو ملک و قوم دونوں کے لئے فائدہ مند ہوگا۔ مدرّسین کو خود اس میں دلچسپی لینا چاہیئے کیونکہ دنیا میں اکثر کام بغیر کسی مالی فائدہ کے صرف عوام کی بہبودی کے لئے بھی تو لوگ کردیا کرتے ہیں۔ دوسری طرف اگر محکمہ کے حکّام نے "اُونہہ" کردی اور یہ بیچارے اسی طرح چیختے رہے تو بھی کسی خوشگوار نتیجہ کی اُمید نہ رکھنا چاہیئے۔

مثنوی کرشن سداماں

(منشی شیام موہن لال جگر بریلوی، بی۔اے)

اگلے وقتوں میں تھا برہمن ایک — بھولا بھالا غریب مسکین نیک

ایک بیوی تھی خوشخصال اُس کی — نیک ہر بد میں شریک حال اس کی

زن خوشخو کا تھا سوشیلا نام — اور سداماں تھا اُس غریب کا نام

اُنس تھا اس کو گوشہ گیری سے — زہد و طاعت سے اور فقیری سے

رات دن اس کو ہر کے نام سے کام — کچھ ہو دنیا میں اپنے کام سے کام

کچھ سروکار مال و زر سے نہ تھا — کچھ تعلق کسی بشر سے نہ تھا

فکر کھانے کی تھی نہ پینے کی — کوئی سُدھ بُدھ ہی تھی نہ جینے کی

رزق اگر پیٹ بھر نہیں ہے تو ہو — تن پہ کپڑا اگر نہیں ہے نہ ہو

مل گیا کچھ تو کھا لیا اُس نے — نہیں تو فاقہ ہی کیا اُس نے

بھوک لگتی تھی اُس کو اور نہ پیاس — گرمی سردی کا تھا نہ کچھ احساس

لو ہری نام سے لگائے تھا — سارے سنسار کو بھلائے تھا

نورِ حق کی تھی جوت سینے میں — ایک امرت تھا اُس کے جینے میں

قلب روشن تھا جان بھی روشن — اُس کے دم سے جہان بھی روشن

(سداماں سے سوشیلا کی التجا)

ہے فقیری کو مال و زر سے بیر — ہوتے ہیں مفلسی میں اپنے غیر

رفتہ رفتہ یہ اُن کا حال ہوا — زندگی کاٹنا محال ہوا

پہونچی نوبت یہ تنگ حالی سے — اُن کو فاقے پہ فاقے ہوتے تھے

کوئی ہمدرد و غمگسار نہ تھا — وقت بگڑا تھا کوئی یار نہ تھا

اب سوشیلا سے صبر ہو نہ سکا — جان پر اور جبر ہو نہ سکا

بولی یوں عاجزی سے اے مہراج — اے مرے ناتھ ایک عرض ہے آج

اب تو یہ دکھ سہا نہیں جاتا — چپ رہوں تو رہا نہیں جاتا

آہ کیا ہو گیا تمہارا حال — جسم پر رہ گئی ہے کھال ہی کھال

لکڑیاں ہو گئے ہیں ہات اور پاؤں — گھل کے تم رہ گئے ہو اپنی چھاؤں

مجھ کو اب تک نہ دکھ ستاتا تھا — وقت کٹنے کو کٹ ہی جاتا تھا

چپ بھی بیٹھی میں کر رہی تھی بسر — کچھ شکایت نہ لاتی تھی لب پر

ایک دانہ نہیں ہے اب گھر میں — پھوس باقی نہیں ہے چھپر میں

جان کر مفلس اور خوار ہمیں — کوئی دیتا نہیں اُدھار ہمیں

ٹوم چھلا بھی میرے پاس نہیں — گرو رکھ لاؤں کچھ یہ آس نہیں

دھجیوں کو کئے ہوئے دامن — بیٹھی رہتی ہوں اپنا ڈھانکے تن

گھر میں مہماں کوئی اگر آئے — کس کی مرجاد لاج بھی جائے

ننگ و ناموس پر بن آئی ہے — ایسا جینا بھی بے حیائی ہے

یوں تو مجھ سے جیا نہیں جاتا — خون اپنا کیا نہیں جاتا

ضبط اب تک بہت کیا ہم نے — صبر کو آزما لیا ہم نے

دھرم کو ہاتھ سے نہ جانے دیا — حرف مرجاد پر نہ آنے دیا

کاٹے کٹتے نہیں ہیں اب ایام — کھال تک بیچ دوں چلے گر کام

پڑ رہے جب ہوں جان کے لالے — دھرم کو کوئی کس طرح پالے

کرشن بھگوان کے یہاں جاؤ — حالِ زار اپنا جا کے دکھلاؤ

وہ ہی دکھ درد میں ہمارے ہیں — ساتھ کھیلے ہوئے تمہارے ہیں

بڑے فیاض ہیں سخی ہیں وہ — بے نواؤں کی زندگی ہیں وہ

ساری دنیا کو پالتے ہیں وہی — کام سب کے نکالتے ہیں وہی

اُن کی ہو جائے گر نگاہِ کرم — چین سے زندگی گزاریں ہم

(سداماں کا سوشیلا کو سمجھانا)

جانتا ہوں میں اپنا سب احوال ۔ جانتا ہوں میں تم کو جو ہے ملال
دُکھ بہت سہتی ہو یہ جانتا ہوں ۔ کچھ نہیں کہتی ہو یہ جانتا ہوں
لاکھ سختی ہو سب کرتی ہو ۔ جان پر اپنی جبر کرتی ہو
ایک ڈھانچہ سا رہ گیا ہے بدن ۔ چیتھڑے ہیں بجائے پیراہن
ہے مگر بے سبب رنج و ملال ۔ رکھو اپنا ذرا بلند خیال
تم زر و مال کی ہوس کرو ۔ میں جو کہتا ہوں اُس پہ دھیان دھرو
مال و زر کوئی اچھی چیز نہیں ۔ دھنی بھگوان کو عزیز نہیں
چور کا خوف ہے نہ جان کا ڈر ۔ پاؤں پھیلا کے سوتے ہیں بے زر
دھن سے باطن سیاہ ہوتا ہے ۔ دھن سے صدہا گناہ ہوتا ہے
دھن کی خواہش بخیل کرتی ہے ۔ آدمی کو ذلیل کرتی ہے
دھن کے پیچھے جو جان کھوتے ہیں ۔ بعد مرنے کے سانپ ہوتے ہیں
دھن سے ملتا ہے تن کو جب آرام ۔ نہیں آتا زباں پہ ہر کا نام
جو یہ دُکھ درد اور مصیبت ہے ۔ سچ تو یہ ہے بڑی سعادت ہے
یہ گھڑی امتحان کی سمجھو ۔ جو مصیبت پڑے خوشی سے سہو
آدمی غم کی آگ میں تپ کر ۔ نکھر آتا ہے جیسے خالص زر
چند روزہ ہیں یہ غم و آلام ۔ رنج و راحت نہیں کسی کو قیام
چند روزہ یہ زندگانی ہے ۔ چند روزہ جہانِ فانی ہے
جس طرح آج تک ہوئی ہے بسر ۔ یوں ہی کٹ جائیں گے یہ شام و سحر
جس نے پیدا کیا ہے پالے گا ۔ مارنا ہوگا مار ڈالے گا
چھوٹنے دو نہ صبر کا دامن ۔ کرشن بھگوان کا کرو سُمرن
اپنا تن من جو اُن پہ وارے ہیں ۔ وہی ساد ھارمن کو پیارے ہیں
بادشاہی ہے بندگی اُن کی ۔ زندگی ہے تو زندگی اُن کی
ہر بھجن میں جو دن گذاریں گے ۔ سیدھے سُرلوک کو سدھاریں گے
جانے کو تو میں جاؤں کرشن کے گھر ۔ آتا ہے یہ خیال رہ رہ کر
کرشن بھی اب وہ کرشن ہو گئے ہیں ۔ کہ نہیں اب وہ آسمان و زمیں

سمجھوں کس طرح میرے یار ہیں وہ ۔ میں گدا اور تاجدار ہیں وہ
مجھکو پہچان لیں وہ کیا معلوم ۔ دوست بھی مان لیں وہ کیا معلوم
گھی کے جلتے ہیں جنکے گھر میں چراغ ۔ ہوتے ہیں آسماں پہ اُنکے دماغ
جو جہاں میں عروج پاتے ہیں ۔ اپنے بچپن کو بھول جاتے ہیں
اور جو ان باتوں کا نہیں ہے یقیں ۔ صاف سُن لو یہ مجھ سے ہوگا نہیں
کرشن سے جاکے عرضِ حال کروں ۔ اپنی خاطر کوئی سوال کروں
مانگنے سے ذلیل کام نہیں ۔ منگتے سے بُرا غلام نہیں
بہت اچھا ہے یوں ہی جئے جانا ۔ نہیں منظور ہاتھ پھیلانا
نہیں منظور مانگ کر کھانا ۔ اس سے بہتر ہے مجھ کو مر جانا

(سوشیلا کا جواب)

دھن کو سمجھے ہو تم بُرا اتنا ۔ کبھی اس بات پر بھی غور کیا
دھن سے قائم ہے خیر او رخیرات ۔ دھرم کا جان ہے دھنی کی ذات
دھن سے مندر ہیں اور شوالے ہیں ۔ جو دھنی ہیں وہ دھرم والے ہیں
ہے نہ دنیا نہ دین کا کنگال ۔ اُس سے ہوتا ہے کار خیر محال
حق ادا ہو نہ رشتہ داروں کا ۔ کام نکلے نہ کوئی یاروں کا
آبرو خاک زردھنی کی نہیں ۔ زردھنی کوئی آدمی ہی نہیں
بے زری اور دل کا اطمینان ۔ بے زروں کی عذاب میں ہے جان
بس میں بھوکے کا من نہیں ہوتا ۔ بھوک میں ہر بھجن نہیں ہوتا
دھرم جب جائے نا توانی سے ۔ فائدہ ایسی زندگانی سے
میں نے مانا جہان فانی ہے ۔ اور دو دن کی زندگانی ہے
یوں بُرے حال سے بھی جینا کیا ۔ فاقے کر کر کے خون پینا کیا
پھر یہ سوچو کروگے کس سے سوال ۔ اُن سے جو جانتے ہیں سب کا حال
کب برہمن کو مانگنا ہے بُرا ۔ دان لینا تو کام ہے اُس کا
مانگنے ہی سے گر تمھیں ہے عار ۔ نہ بناؤ گداگری کو شعار
نہ کرو عرضِ حال ظالم سے ۔ نہ کرو کچھ سوال ظالم سے

مانگنا ہے بُرا بخیلوں سے — مانگنا ہے بُرا ذلیلوں سے
اُس سے مانگو نہ تم جو ہو مغرور — اہل نخوت کے سایہ سے رہو دُور
لیکن اہل کرم کی اور ہے بات — اُن سے مانگے سے گھٹ نہ جائیگی ذات
کرشن بھگوان ہیں بڑے دانی — کوئی اُن کا ہوا نہ ہے ثانی
ہیں دھنی اور شیام سندر اور — ندیاں اور ہیں سمندر اور
بے نوا اور غنی زمانے کے — ہیں گدا اُن کے آستانے کے
دردمندوں کے چارہ ساز ہیں وہ — تم گدا ہو گدا نواز ہیں وہ
اور تمھارے تو یار غار بھی ہیں — دل سے ہمدرد و غمگسار بھی ہیں
لب تک آنے نہ دیں گے حرف سوال — تم گئے اور ہو گئے آ کے نہال

(سداماں کی مجبوری اور دوارکا پوری کو روانگی)

نہ چلا ضد کے سامنے کچھ زور — ہوا تیار اُٹھائی لُٹیا ڈور
پر لے جانے کو ہے کچھ سوغات — کرشن کے پاس جاؤں خالی ہات
سب کہیں گے کہ یار آئے ہیں — کوئی تحفہ ضرور لائے ہیں
کنکیاں چاولوں کی تھوڑی سی — مانگ لائی پڑوس سے بیوی
پوٹلی باندھ کر بغل میں دبا — ہات میں اپنے ٹیکے ایک عصا
سر جُھکائے ہوئے خمیدہ کمر — ایک کوپین باندھے ننگے سر
کچھ پریشاں سا اور حیراں سا — اپنی حالت پہ کچھ پشیماں سا
دوارکا کی طرف وہ جاتا تھا — اور یہ دل میں خیال لاتا تھا
میں سوشیلا کے ڈر سے چل تو دیا — جا کے بھگوان سے کہونگا کیا؟
لب تک آنے نہ پائیگی کوئی بات — میں کہاں اور کہاں وہ عالی ذات
ہے سوشیلا تو بے سمجھ نادان — ہر دم اُس کو ہے مال و زر کا دھیان
اس کو کہیے بھی کیا کہ عورت ہے — خواہش راحت اُسکی فطرت ہے
کس کو کہتے ہیں گیان کیا جانے — پریم کی آن بان کیا جانے؟
اور مجھے احتیاج ہی کیا ہے — غم دنیا نہ فکر عقبیٰ ہے
کوئی ارماں نہ آرزو ہے مجھے — مُرلی والے کی جستجو ہے مجھے
ہے وہی اپنا مدعا دل میں — نہیں اب کوئی دوسرا دل میں
کس کا جانا ہے کس کا آنا ہے — اُس کے دیدار کا بہانا ہے
اُس کا دیدار ہو ہی جائیگا — بخت بیدار ہو ہی جائیگا

(دوارکا پوری، سداماں اور کرشن بھگوان)

جب نظر دوارکا پوری آئی — آنکھیں سی کُھل گئیں سداماں کی
منظر اک سامنے تھا عالی شان — اُونچے اُونچے تھے زرنگار ایوان
سونے چاندی کے تھے در و محراب — چوندھیائے نظر وہ آب و تاب
لعل و گوہر جڑے چمکتے ہوئے — پردے رنگیں پڑے جھمکتے ہوئے
جھالریں موتیوں کی لٹکی ہوئیں — دھوپ چھاں سی نظر میں کرتی تھیں
فرش مخمل کے جا بجا تھے بچھے — جھاڑ فانوس جگمگاتے تھے
لیے ہاتھوں میں گُرز اور عصا — پہرے پر پاسبان تھے ہر جا
سامنے باغ کی عجیب بہار — بیل بوٹے شجر قطار قطار
گُلِ خوش رنگ کیاریوں میں کھلے — موتیا موگرا مہکتے تھے
حوضوں میں چھوٹ رہے تھے فوارے — گرتے تھے آسمان سے تارے
مست ہر سو پرند گانے میں — محو کچھ نہر پہ نہانے میں
کہیں کرتی تھیں قُمریاں کوکو — رقص میں مور تھے کہیں لبِ جُو
تھا وہ حیران سا جھجک کے چلا — سوئے در وہ ٹھٹک ٹھٹک کے چلا
بڑھ چلے دربان نے اُسے ٹوکا — قدم اندر بڑھانے سے روکا
پوچھا ہو کون؟ اور کیا ہے نام — کہاں جاتے ہو؟ اور کیا ہے کام
بولا وہ ہے میرا سداماں نام — کرشن بھگوان سے مجھے ہے کام
میرے بچپن کے ساتھ کھیلے ہیں — دونوں ہم اک گرو کے چیلے ہیں
سُن کے دربان مسکرانے لگا — ایک سے اک نظر ملانے لگا
ہاں مگر کچھ زیادہ کہہ نہ سکے — اور کھڑے دیکھتے بھی رہ نہ سکے
ایک نے جا کے یوں محل میں کہا — در پہ آیا ہے اک بھکاری سا
ہڈیوں پسلیوں کا ہے ڈھانچا — سر پہ جھبّر ہے ایک بالوں کا

تن پہ کپڑا نہ سر پہ ٹوپی ہے | اور کمر میں پھٹی لنگوٹی ہے
قحط کا یا وبا کا مارا ہے | آدمی کا ہیکل وبال سا ہے
میں تو سمجھا کہ جم کا دوت آیا | چھٹ کے مرگھٹ سے کوئی بھوت آیا
اپنا بتلاتا ہے سداماں نام | اور بھگوان سے بتاتا ہے کام
کہتا ہے میرے ساتھ کھیلے ہیں | دوست ہیں یار غار میرے ہیں
جب یہ بھگوان کو خبر پہونچی | در پہ آج آئے ہیں سداماں جی
سنتے ہی اٹھ کے دوڑتے آئے | لائے رنواس میں گلے مل کے
سونے کے تخت پر بٹھایا پھر | ہات اور پاؤں کو دھلایا پھر
بولے مجھ پر بڑا ہوا یہ کرم | آپ کے اس زمیں پہ آئے قدم
شکر ہے میرے بھاگ جاگے آج | کہیئے کیسا مزاج ہے مہراج
بھابی اچھی ہیں آپ اچھے ہیں | کیا کیا حالات اور گھر کے ہیں
دی ہے بھابی نے کچھ نہ کچھ سوغات | نہیں آئے ہیں آپ خالی ہات
پوٹلی سی یہ کیا دبائے ہیں | کوئی تحفہ ضرور لائے ہیں
کہہ کے یہ پوٹلی کو کھینچ لیا | دانہ دانہ زمیں پہ پھیل گیا
چھلکے ایک ایک دانہ پھانک چلے | سب نے انگلی دبائی دانت تلے
دو ہی پھنکی میں دیئے دو لوک | رکمنی نے لیا پھر ان کو روک
اور کہنے لگیں پکڑ کر ہات | سنیئے سنیئے ہماری بھی اک بات
سب تو دے ڈالے آسمان و زمیں | ہم کو بھی رہنے دیجئے گا کہیں
پھر لگائی نہ تیسری پھنکی | کھولدی وہ جو بند تھی مٹھی
تھال سونے کے پھر منگائے گئے | کھانے عمدہ لذیذ لائے گئے
خاص اپنی جو اک مسہری تھی | سونے کے واسطے وہ انکو دی
بڑی راحت میں دن گزرنے لگے | اب سداماں جی چین کرنے لگے
یوں ہی کچھ روز مہماں رہ کر | لیکے رخصت چلے سداماں گھر

کایا پلٹ

تھے سداماں تو کرشن کے مہماں | ہو گئے گھر پہ اور ہی ساماں
بحر رحمت جو جوش میں آیا | دم کے دم میں پلٹ گئی کایا
کلفتیں ساری ہو گئیں کافور | پھر گئے دن ہوئے دلدر دور
ایک ویران جھونپڑی تھی جہاں | سونے کا تھا محل بلند وہاں
اب سوشیلا تھی اور دھن ہی دھن | جہاں دیکھو برستا تھا کنچن
دولت اب اس کے پاؤں چومتی تھی | سایہ سی ساتھ ساتھ گھومتی تھی
فکر روزی کی تھی نہ کوئی غم | ساری دنیا کی راحتیں تھیں بہم
دل کو حاصل ہوا جو اطمینان | اپنی نادانیوں کا آیا دھیان
تھا فراموش اگلا حال اسے | بس سداماں کا تھا خیال اسے
ناتھ کو میں نے کیوں کیا حیراں | اس قدر ہو گئی میں کیوں ناداں
کھائے جاتا تھا رات دن یہ ملال | نہیں معلوم کیا ہے ان کا حال
کوئی نامہ نہیں پیام نہیں | کچھ تسلی کا انتظام نہیں
میں تو محلوں میں چین کرتی ہوں | آہ بنتی ہوں اور سنورتی ہوں
وہ نہ جنگل میں رم رہے ہوں کہیں | سیر جینے سے ہو نہ جان حزیں
دھوپ میں ہیں نہ جانے چھاؤں میں آہ | چبھ رہے ہوں نہ خار پاؤں میں آہ
فاقے دن رات انھیں ہوتے ہوں | خاک پر ہی کہیں نہ سوتے ہوں
تف ہے اب میرے ایسے جینے پر | تف ہے راحت کے سر قرینے پر
ان کو جانے پہ کیوں کیا مجبور | آ گیا کیوں مری سمجھ میں فتور
کچھ نہ کی ان کی آن بان کی قدر | ان کی بھگتی کی اور گیان کی قدر
جیسے کچھ ہو رہی تھی اپنی گزر | ہو ہی جاتی دو روزہ عمر بسر
اک نہ اک دن تو مجھ کو مرنا تھا | ان پہ ایسا ستم نہ کرنا تھا
ہو رہی تھی نہ کوئی بیر کے بھی | ان سے کس واسطے میں اڑ بیٹھی
نہیں بھاتے مجھے جواہر و مال | گہنے زیور ہیں جی کا اک جنجال
گل ہیں نظروں میں خار انکے بغیر | گلستاں خار زار انکے بغیر
جان ہے بیقرار ان کے بغیر | زندگی بے قرار ان کے بغیر
یہ محل سونے کا ہے تو کیا ہے | جان جاتی ہوں کاٹے کھاتا ہے

راتیں اور بھی ستائے ہیں　　سینے میں آگ سی لگائے ہیں
ہوک اُٹھتی ہے جلتی ہے چھاتی　　پر جو ہوتے مرے تو اُڑ جاتی
وہ یہاں تھے تو ایک جنت تھی　　جھونپڑی میں بھی کیسی راحت تھی
وہ اکیلے ہی تھے مگر کیا تھا　　گھر ہمارا بھرا بھرا سا تھا
اُن سے ویرانے میں بھی بستی تھی　　اُن کی ہستی بھی کیا ہی ہستی تھی
جھونپڑی لالہ زار تھی اُن سے　　زندگانی بہار تھی اُن سے
دل میں اک پیچ و تاب کھائے ہوئے　　اشک آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے
رات دن در پہ ہی جمائے نگاہ　　بیٹھی چپ دیکھتی تھی اُنکی راہ

(واپسی پر سداماں کی حیرانی و پریشانی)

جب سداماں جی گھر کے پاس آئے　　اِک طلسمات دیکھا گھبرائے
رنگ ہی اور تھا سماں ہی اور　　تھی زمیں اور آسماں ہی اور
شان ہی اور کاروبار ہی اور　　باغ ہی اور تھا بہار ہی اور
نہ وہ کوچہ نہ جھونپڑی ہی تھی　　اک حویلی کھڑی تھی کنچن کی
دھوپ میں وہ ستون اور در و بام　　جگمگاتے تھے آئینے سے تمام
سامنے ایک پُرفضا گلزار　　پھول پھولے ہوئے تھے رشکِ بہار
داسیاں زرق برق پہنے لباس　　ٹکے تھے جن میں گوہر الماس
لدی گہنوں میں سر سے تا بقدم　　کرتی پھرتیں اِدھر اُدھر چھم چھم
سہم کر رہ گئے یہ دیکھ کے رنگ　　کچھ نہ آیا سمجھ میں عقل تھی دنگ
دور اِک کونے میں کھڑے ہو کے　　کہتے تھے دل ہی دل میں رو رو کے
ہائے بھگوان ماجرا کیا ہے　　دو ہی دن میں یہ ہو گیا کیا ہے
کیسے بدلے ہیں آسمان و زمیں　　کچھ بھی میری سمجھ میں آتا نہیں
ہائے میں گھر سے کیوں نکل کے گیا　　پڑ گیا عقل پر میری پردا
میں نے عورت کی بات کیوں مانی　　ہو گئی مجھ سے کیسی نادانی
اور بھی اب تو ہو گیا میں تباہ　　لٹ گئی میری جھونپڑی بھی آہ
میرے پڑ رہنے کا وہ کونا آہ　　اور وہ پھوس کا بچھونا آہ

کس قدر دیتے تھے مجھے آرام　　کیسے ہی گرم و سرد ہوں ایام
اور وہ میرے درد و غم کی شریک　　جان کی پاسبان دم کی شریک
فقر و فاقہ میں غمگسار مری　　وہ سوشیلا وفا شعار مری
رنجِ پیری میں چارہ ساز مری　　راحتِ روح و دلنواز مری
کھا گئی کیا اُسے بھی آہ زمیں　　اب تو دنیا میں کوئی میرا نہیں
اے سوشیلا تجھے کہاں ڈھونڈوں　　کس طرف آہ جانِ جاں ڈھونڈوں
بیکس و بے پر و ناتواں ہوں میں　　زار و بدحال خستہ جاں ہوں میں
کوئی مونس نہیں ہے یار نہیں　　کوئی تدبیر و چارہ کار نہیں
اب کہیں بھی مجھے پناہ نہیں　　موت پر اختیار آہ نہیں
کس قدر مجھ پہ تنگ ہے یہ جہاں　　جاؤں تو میں کہاں ہوں تو کہاں
آہ مارا ہوا نصیبوں کا　　ہائے میں اب کہیں کا بھی نہ رہا
ہوش غائب ہیں عقل ہے حیراں　　اب کہاں جاؤں کیا کروں بھگوان

سداماں اور داسی

تھے بڑے رنج میں سداماں جی　　اُن کے پاس آئی اتنے میں داسی
اور کی عرض ہاتھ جوڑ کے یوں　　آپ ٹھٹکے یہاں کھڑے ہیں کیوں
آئیے آپ ہی کا ہے یہ محل　　دیوی جی درشنوں کو ہیں بیکل
چلئے وہ آپ کو بُلاتی ہیں　　چلئے ورنہ وہ خود ہی آتی ہیں

(سداماں)

تو ہے کون اور کام کیا مجھ سے　　کچھ نہیں میرا واسطہ تجھ سے
میرا گھر اور یہ قصرِ شاہانہ　　مجھ کو سمجھا ہے کوئی دیوانہ
مجھ سے اور دیوی جی سے کیا نسبت　　مجھ سے شاہنشہی سے کیا نسبت
کس لئے مجھ کو وہ بُلانے لگیں　　کس لئے مجھ پہ رحم کھانے لگیں
ہاں میں سمجھا بلا رہی ہیں ضرور　　قید میں ہو گا ڈالنا منظور
چھل نہ کر مجھ سے کیا کہوں تجھ کو　　رہنے دے اپنے حال پر مجھکو
آہ ہے جس جگہ محل اونچا　　تھا وہیں ایک جھونپڑا میرا

اور اُسمیں تھی ایک دیوی بھی جیسے مورت ہو پریم کی کوئی

اب نہ وہ جھونپڑی نہ دیوی ہے خانہ ویرانی ہے مہراجی ہے

جس نے بے خانماں کیا مجھکو یہ محل بھی اُسے مبارک ہو

جان کر بیکس اور غریب مجھے ناتواں پیر و بدنصیب مجھے

کیوں چڑھاتی ہے کیوں ستاتی ہے کیوں کٹے میں نمک لگاتی ہے

(داسی)

ایسی باتیں نہ کیجئے مہراج بھاگ جاگے ہیں ہم سبھوں کے آج

ایک داسی ہوں میں یہ میری مجال دل لگی کر سکوں کہاں ہے خیال

یہ محل اور یہ دھن سب آپکا ہے یہ بہار اور چمن سب آپکا ہے

جھونپڑی کی جگہ حویلی ہے کون دشوار یہ پہیلی ہے

کرِٹھنائیاں جو آپ نے اُٹھائی ہیں پھل وہ انجام کار لائی ہیں

ہے جو سونے کا سامنے یہ محل آپ کی طاعتیں ہوئی ہیں سپھل

کرشن بھگوان کی یہ مایا ہے اس میں حیرت ہی آپ کو کیا ہے

دین پر جب وہ آ اُترتے ہیں ذرّے کو آفتاب کرتے ہیں

ہے یہ جو کچھ کیا اُنھیں کا ہے مال و زر سب دیا اُنھیں کا ہے

آپ کی استری ہیں دیوی جی دیکھئے تو وہ جھانکتی ہیں کھڑی

رات دن در پہ ہی لگائے نگاہ دیکھا کرتی ہیں کب سے آپ کی راہ

مجھ سے گر کچھ خطا ہوئی انجان کیجئے مجھکو معاف ہوں نادان

ہوئیں سب کی دعائیں بارآور آگئے آپ باغ باغ ہے گھر

پھل کی اسمیں کوئی نہیں ہے بات چلئے مہراج جوڑتی ہوں ہات

(سداماں)

تنگ ہوں میں تری ڈھٹائی سے اچھا چلتا ہوں بے حیائی سے

جو دکھایا نصیب نے دیکھا کیا نہ کچھ مجھ غریب نے دیکھا

دیکھئے آگے بخت کیا دکھلائے کہاں لے جائے کس کا بندہ بنائے

(سداماں اور سوشیلا)

گھر میں آئے اُدھر سداماں جی ہات جوڑے بڑھی سوشیلا بھی

تھی اُدھر حیرت اور استعجاب تھے اِدھر شوق و دیدۂ پر آب

ہوئی دو چار جب نظر سے نظر آنکھوں آنکھوں میں کھل گئے دفتر

دونوں جانب نکل پڑے آنسو اُمنڈ آئے اُبل پڑے آنسو

اور سوشیلا نے مضطرب ہو کر رکھدیا اپنا اُس کے پاؤں پہ سر

باہم احوال سب سنائے گئے گیت رادھا من کے گائے گئے

پھر نئی سر سے زندگانی تھی شادمانی ہی شادمانی تھی

(غزل)

مایلِ لطف مہ جبیں ہے آج نگہ ناز دلنشیں ہے آج

اِس تصوّر پہ کیا نثار کروں ہات میں زلفِ عنبریں ہے آج

کیف و مستی بکھیرتی پھرتی نگہ چشم سرمگیں ہے آج

آپ ہیں اور آپ کا جلوہ میرے دل میں کمی نہیں ہے آج

یہ تو موجیں سرور کی سی ہیں کہیں دل میں چبھک نہیں ہے آج

روح کسکی جھلک سے وجد میں ہے غم دل کیف آفریں ہے آج

رقص کرتے ہیں آسمان و زمیں نغمہ زن کوئی مہ جبیں ہے آج

دور تھا جو قیاس سے بھی دور رگ جاں کے وہی قریں ہے آج

کس کے گیسو کا پڑ گیا سایہ خاک دل نکہت آفریں ہے آج

ناز کرتا ہوں اپنی قسمت پر آپ کے پاؤں پر جبیں ہے آج

اپنی کملی میں تاجدار جہاں

جگرِ خستہ و حزیں ہے آج

زعم خودی

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم۔ اے)

بڑے ناداں ہیں جو اس زیست انسانی پہ مرتے ہیں
وہ زندانی جو قید سخت زندانی پہ مرتے ہیں

پشیمانی ہماری ناپشیمانی سے بہتر ہے
پشیماں ہو کے بیٹھے ہیں پشیمانی پہ مرتے ہیں

پرستار خودی کس عکس پر حیران ہوتے ہیں
عدوئے بیخودی ہیں یا کہ حیرانی پہ مرتے ہیں

بھٹک جاتے ہیں جو کچھ اور بھی سمجھائے جانے پر
یہ پتلے عقل کے جو عقل انسانی پہ مرتے ہیں

سرور و انبساط بیخودی سمجھے ہیں نشہ کو
بڑے ناداں ہیں جو اس اپنی نادانی پہ مرتے ہیں

ہماری خود پسندی ہی ہمیں مدہوش لے ڈوبی
مگر ہم ہیں کہ اس نخوت کی طغیانی پہ مرتے ہیں

شکریۂ کشمیر

از جناب الطاف مشہدی

کشمیر کی حسین بہاروں کا شکریہ
دل چھین لینے والے نظاروں کا شکریہ

ہوتے ہیں آسمان محبت سے جو طلوع
ان برق در کنار ستاروں کا شکریہ

پھرتا ہے جن پہ حسن جوانی کی مے کے ساتھ
ان سحر بار سبز کناروں کا شکریہ

لیتی ہے جن میں کروٹیں پُر کیف راگنی
ان ننھی ننھی مست پھواروں کا شکریہ

جو سرخ دامنوں سے الجھتے ہیں وقت سیر
ان خوش نصیب پودوں کے خاروں کا شکریہ

بدمست انکھڑیوں سے ٹپکتی ہے جو شراب
اس کے شباب خیز خماروں کا شکریہ

لے لے کے جن کو اٹھتی ہے محبوبہ نگاہ
ان سبز، سرخ، پیلے سہاروں کا شکریہ

الطاف جا رہا ہوں میں مجبور روزگار
اللہ پھر نصیب کرے یہ حسیں دیار

رائے چندر بھان برہمن

(از مسٹر رفیق احمد مارہروی)

رائے چندر بھان برہمن فارسی زبان کے بلند پایہ اور مشہور شاعر گزرے ہیں، ان کی زندگی کے صحیح حالات قعرِ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، ان تذکروں میں اس درجہ اختلاف ہے کہ صحیح حالات کا متلاشی اُن سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ موجودہ تذکروں میں اس بات کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے اور اُن کے اجداد کس ملک یا دیس سے وارد ہوئے، کوئی ان کا مولد و مسکن دہلی بتاتا ہے اور کوئی آگرہ،[1] کوئی لاہور[2] اور کوئی ان کو کشمیر کا رہنے والا بتاتا ہے۔[3] لیکن جہاں تک میں مختلف و متعدد کتابوں کا مطالعہ کر سکا ہوں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ برہمن کے جدِ اعلیٰ سکندر کے زمانے میں کشمیر[4] سے روانہ ہوئے اور آگرہ میں قیام کیا۔ برہمن کے والد کا نام دھرم داس تھا جنھوں نے جلال الدین اکبر کے زمانہ میں سنسکرت کی تعلیم پوری کرنے کے بعد اسلامی لٹریچر میں بھی پوری دستگاہ پیدا کی اور شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ روز افزوں ترقی کر کے منصب دار سلطنت ہونے کا فخر حاصل کیا۔[5]

۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء میں برہمن پیدا ہوئے، ان کی جائے ولادت کے باب میں بھی اختلاف ہے، زیادہ تحریریں لاہور کے متعلق ملتی ہیں، حالانکہ لاہور کے متعلق خود برہمن نے "انشاء چہارمنی"[6] میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

"ایں نیاز مند بہ دار السلطنت لاہور بمقتضائے لطافت آب و ہوا اقسام خوبہائے کہ دم حالات بہ قسمت اتحادمی زند رسید"

پنڈت چندر بھان شروع شروع میں عبد الکریم میر عمارات (جن کے اہتمام سے تاج محل تیار ہوا) کے پاس لاہور میں رہا کرتے تھے۔ اُنھیں کے ذریعہ افضل خاں شیرازی وزیر اعظم شاہجہاں تک رسائی ہوئی[7]

---

(1) رسالہ اُردو بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۳۰ء

(2) تذکرہ بہار گلشن کشمیر جلد اول صفحہ ۱۱۲ و کتاب امرائے ہنود صفحہ ۱۸۳

(3) ریاست گوالیار کے سرکاری کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب "شاعرانِ کشامرہ" ہے اسمیں برہمن کو کشمیری قرار دیا ہے۔

(4) تذکرہ بہار گلشن کشمیر جلد اول صفحہ ۱۱۲

(5) بہار گلشن کشمیر جلد اول صفحہ ۶۶۳

(6) جلو خانہ ریاست کپورتھلہ میں اس کتاب کا ایک قدیم ترین نسخہ موجود ہے۔ (7) امرائے ہنود صفحہ ۱۸۳

اور اپنی لیاقت و دانائی کی بنا پر وزیر مذکور کے یہاں دیوان مقرر ہوگئے ۔ افضل خاں کی وفات (۱۰۴۸ھ) کے بعد جب بادشاہ لاہور پہونچے تو افضل خاں کے تمام متعلقین اور ملازمین کو پیش ہونے کا حکم ملا ، اس تقریب سے چندر بھان بھی پیش ہوئے ، آدمی زیرک تھے ایک رباعی لکھکر لے گئے ، بادشاہ کے حضور پیش کی ، رباعی آپ بھی سُنیئے :-

شاہے کہ مطیع او عالم گردد — ہر جا کہ سریست او خم گردد

از لسکہ بدورش آدمی یافت شرف — خواہد کہ شرف نیرِ اعظم گردد

یہ رباعی معنوی اعتبار سے بہت دلپذیر ثابت ہوئی اور پنڈت نے اس کو اس قدر خوش خط لکھکر پیش کیا تھا کہ بادشاہ دیکھکر باغ باغ ہوگئے ۔ نوازش شاہانہ سے برہمن کو سرفراز کیا ۔ ملازمانِ اہل قلم میں اسی وقت منسلک کر دیئے گئے ۔ کچھ عرصہ کے بعد شاہزادہ داراشکوہ[۱] کو برہمن کی شاعری ، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی نے گرویدہ کر لیا ۔ اس نے باپ سے برہمن کو مانگ لیا اور اپنے یہاں میر منشی کے عہدے پر مقرر کر دیا ۔ ۱۰۶۶ء میں جب سعد اللہ خاں وزیر سلطنت کا انتقال ہوگیا تو شاہجہاں نے برہمن کو پھر اپنے یہاں بُلالیا اور خطابِ "رائے" سے مفتخر فرما کر دفتر شاہی کا میر منشی مقرر کر دیا ۔ مؤلف بہار گلشن کشمیر کا قول ہے کہ شاہجہاں نے سعد اللہ کے انتقال کے بعد اُن کو اپنا وزیر مقرر کیا[۲] ۔ بہرحال کچھ بھی ہو یہ امر مسلمہ ہے کہ پنڈت چندر بھان کسی نہ کسی طرح اورنگ زیب کے زمانہ سلطنت تک نوازشات شاہانہ سے فیض پاتے رہے[۳] ۔ لیکن جب داراشکوہ قتل کیا گیا تو اس شاعر مزاج برہمن کو اپنے خاص قدر دان اور مربّی کی جدائی بہت شاق گزری اور وہ اتنا متاثر ہوا کہ شاہی ملازمت سے مستعفی ہوکر بنارس چلا گیا اور باقی تمام عمر عبادت و ریاضت میں گزار دی ۔ پنڈت چندر بھان نے ۹۱ سال کی عمر پاکر ۱۰۷۳ھ[۴] میں بنارس ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔ اس نے اپنے زمانۂ امارت میں آگرہ میں ایک وسیع تالاب اور ایک خوش نما باغ تعمیر کرایا تھا ۔ اور باغ کے اندر ایک عمارت بنوائی تھی ۔ افسوس آگرہ کی صدہا دوسری لاجواب عمارتوں کی طرح برہمن کا تالاب اور باغ کی عمارت بھی آج مفقود ہے ۔ صرف باغ کی عمارت کا دروازہ اپنے بانی کی عظمت کے ثبوت میں اب تک برقرار ہے ۔ ۱۸۵۵ء میں یہ باغ ایک انگریز کے قبضے میں تھا ، اس نے آگرہ کے ایک ساہوکار لالہ سورج بھان ساکن محلہ بیلن گنج کے ہاتھ فروخت کر دیا ۔ لالہ سورج بھان نے نہ صرف باغ کے

---

[۱] امرائے ہنود صفحہ ۱۰۳ پر نبیرۂ آدم لکھا گیا ہے ۔ [۲] تذکرہ بہار گلشن کشمیر میں یہ صفحہ ۱۱۲ جلد اول پر یہ روایت شاہزادہ خرم یعنی خود شاہجہاں سے وابستہ دکھائی گئی ہے ۔ [۳] بہار گلشن کشمیر جلد اول صفحہ ۱۱۳ [۴] رسالہ اردوئے معلی اگست ۱۹۱۱ء شمارہ ۸ مولوی حامد حسن صاحب قادری نے تاریخ ادبیات اردو کے صفحہ ۲ پر برہمن کا سال ولادت ۱۰۶۳ھ لکھا ہے اور مؤلف امرائے ہنود نے ۱۰۶۲ھ صفحہ ۱۰۴

قی ماندہ آثار ہی کو محفوظ رکھا بلکہ اُس کی تباہ حالت کی درستی میں بھی کافی دلچسپی لی۔ اُن کے تقال کے بعد اُن کے بیٹے للہ چندر بھان مالک ہوئے، اُنھوں نے بھی باغ کے بانی کے نام کو برقرار کھنے کے لئے اس کی پوری پوری نگہداشت کی۔ عجیب اتفاق ہے کہ زمانہ کے اُلٹ پھیر نے یک ایسا موقع بھی پیدا کر دیا کہ باغ کے بانی اور موجودہ قابض میں نام کی یکسانیت و مناسبت کی مورتیں بھی پیدا ہو گئیں۔

پنڈت چندر بھان نہ صرف ایک ہندو امیر کی حیثیت سے مشہور ہیں بلکہ شاعرانہ اعتبار سے بھی وہ پوری شان و شہرت کے مالک ہیں۔ وہ فارسی کے زبردست شاعر تھے جس کی بنا پر ان کا شمار ساتذہ میں ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے برہمن کے شاعرانہ کمالات کے اظہار کے ساتھ ہی ان کی ذات سے کچھ دلچسپ روایات بھی وابستہ کر دی ہیں۔ مگر ان سے کوئی خاص واقفیت حاصل نہیں ہوتی شلاً ایک دفعہ شاہزادہ دارا شکوہ نے برسر دربار شاہجہاں سے عرض کیا کہ پنڈت چندر بھان نے ایک عجیب شعر کہا ہے، اگر حکم عالی ہو تو انھیں بلا کر وہ شعر حضور کو بھی سنواؤں۔ بادشاہ نے اجازت دی چندر بھان فوراً حاضر دربار ہوئے، دربار میں اور بھی متعدد کاملین موجود تھے۔ اُن کی موجودگی میں برہمن نے بادشاہ کو یہ شعر سُنایا ؎

مرا دلے است بکفر آشنا کہ چندیں بار   بہ کعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

شعر سُن کر بادشاہ کے چہرے پر برافروختگی کے آثار پیدا ہوئے۔ نواب سعد اللہ خاں نے اس بے لطفی کا احساس کر کے فوراً بادشاہ کے حضور عرض کیا کہ سعدی علیہ الرحمہ آج سے چار سو سال پہلے اس کا جواب فرما گئے ہیں، ملاحظہ ہو:-

خرِ عیسےٰ اگر بہ مکہ رود   چوں بیاید ہنوز خر باشد

یہ شعر سنتے ہی بادشاہ مسکرا دیئے۔ برہمن کے شعر سے مزاج میں جو تکدّر پیدا ہو گیا تھا رفع ہو گیا۔ دوسری ایک روایت ہے کہ عالمگیر نے اپنے عہدِ حکومت میں کسی مندر کو توڑنے اور اس کی جگہ مسجد بنانے کا حکم دیا۔ برہمن اُس وقت موجود تھے، انھوں نے برجستہ بادشاہ کو یہ شعر موزوں کر کے سنایا ؎

ببیں کرامتِ بت خانۂ مرا اے شیخ   کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

جہاں تک شاعرانہ آزاد خیالی اور برجستگی کا تعلق ہے برہمن کے فارسی کلام میں اس سے زیادہ

---

[۱] مولف امرائے ہنود لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ افضل خاں کے عہد وزارت کا ہے جب کہ انھیں کے یہاں برسر مشاعرہ برہمن نے یہ شعر پڑھا، اس مشاعرے میں بادشاہ بھی شریک تھے ص ۱۰۵

بلند اور شوخ اشعار ملتے ہیں اور اُن کی برجستگی سے کوئی نہ کوئی حکایت تراشی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو شاعرانہ خیال آرائیوں سے آگے اس قسم کے اشعار کی کوئی اصلیت نہیں۔ آخرالذکر روایت تو بالکل مہمل ہے، اورنگ زیب کے متعلق جو بعض تواریخ نے شہرت دے رکھی ہے اس سے متاثر ہو کر سیکڑوں غلط اور من گھڑت باتیں اس سے وابستہ کر دی گئی ہیں۔ برہمن دارا شکوہ کے قتل کے بعد فوراً بنارس چلے گئے تھے۔ اس وقت تک اورنگ زیب خود اپنی جڑ مضبوط نہ کر سکا تھا۔ اندرونی چیرہ دستیوں اور ریشہ دوانیوں سے ہی اُسے فرصت نہ تھی کہ وہ کسی مندر کو مسمار کرانے اور اس کے بجائے مسجد بنانے کی طرف متوجہ ہوتا اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بڑی حیرت کی بات ہے کہ وہ متعصب بادشاہ جو اپنی رعایا کی عبادت گاہ کو مسمار کر کے اپنی قوت و جبروت کا اُن کے دلوں پر سکہ بٹھا رہا تھا عین اُس وقت اتنا نرم کیونکر ہو گیا کہ برہمن نے اُس کے منہ پر اُس کے جابرانہ حکم کے خلاف ایسا شعر پڑھ دیا اور اُس نے پنڈت جی کو زندہ و سلامت چھوڑ دیا۔

پنڈت چندربھان ایک ایسے زمانے کے شاعر ہیں جس زمانے کے بعض مسلمان شعرا اُردو شاعری کے اعتبار سے کافی مسالا چھوڑ گئے ہیں۔ برہمن فارسی کے شاعر تھے، لیکن ان کے زمانہ میں چونکہ اُردو زبان بھی عام طور سے شعرا کے منہ لگ چکی تھی اس لئے انھوں نے بھی اُردو میں کچھ اشعار کہے، پوری صحت کے ساتھ برہمن کی صرف ایک غزل ملتی ہے۔ اس غزل کی دستیابی سے یہ غور کرنا لازم ہو جاتا ہے کہ برہمن نے اس سے زیادہ بھی اُردو اشعار کہے ہونگے، جو غالباً حوادث زمانہ کے نذر ہوئے۔ اس دَور کے محققین اس طرف توجہ فرمائیں تو ممکن ہے کہ پنڈت چندربھان کی اُردو شاعری پر جو پردے پڑے ہوئے ہیں چاک ہو جائیں۔

مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں ولی دکنی کو اُردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا تھا لیکن اس زمانہ کی تلاش و تحقیق نے ان کے نظریہ کو باطل کر دیا ہے۔ ولی ۱۰۷۹ھ میں پیدا ہوئے چندربھان نے ۱۰۷۳ھ میں ۹۱ سال کی عمر پا کر وفات پائی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ برہمن ولی کی پیدائش سے چھ سال قبل فوت ہو چکے تھے۔ ولی ۳۴ سال کی عمر میں محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں (۱۱۱۳ھ / ۱۷۰۰ء) دہلی وارد ہوئے لیکن اس وقت شاعرانہ حیثیت سے شمالی ہند میں ان کی کوئی شہرت نہ ہوئی۔ بلکہ اس کے پورے بیس سال بعد ۱۱۳۲ھ / ۱۷۲۱ء میں جب اُن کا دیوان دکن سے دہلی آیا تو لوگ ان کی شاعری سے واقف ہوئے۔ ولی کی عام شہرت شاعرانہ یا دہلی کی آمد کے زمانے کے لحاظ سے اگر پنڈت چندربھان کی شاعری کا بھی ایک زمانہ متیقن کر لیا جائے تو وہ ولی سے ستانوے (۹۷) سال پہلے کے شاعر

متصور قرار پاتے ہیں۔[1] یہ آگے پیچھے کا بظاہر معمولی فرق ہے لیکن اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ برہمن جہاں ولی سے مقدم تھے وہیں اُردو کے پہلے شاعر[2] بھی تھے:-

خدا جانے یہ کس شہر اندر ہمیں کو لا کے ڈالا ہے ۔۔۔ نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے[3]

پیا کے نام کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے ۔۔۔ نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے

پیا کے نام عاشق کوں قتل بائیں عجب دیکھے ہوں ۔۔۔ نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

خوباں کی باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یارو ۔۔۔ نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیاں میں ۔۔۔ نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

افکارِ پریشاں

(از حضرت جگر بریلوی)

جو رات اتنی بھیانک تھی کیا سہانی ہے ۔۔۔ بڑے مزے کی کہانی تری کہانی ہے

مری زباں پہ یہ کس رنگ کی کہانی ہے ۔۔۔ شباب و عشق سے معمور زندگانی ہے

گزر گئی شبِ غم ہے نمودِ صبحِ نشاط ۔۔۔ نفس نفس میں جوانی ہے شادمانی ہے

چمک رہا ہے زمانے میں داغِ عشق مرا ۔۔۔ سیاہیِ شبِ دیجور پانی پانی ہے

یہ کس کے کوچے سے آ کر نسیم نے چھیڑا ۔۔۔ مری رگوں میں نئے خون کی روانی ہے

ٹھکانے لگتے دے مٹی بھی اب ہمیں میری ۔۔۔ تمام عمر ترے در کی خاک چھانی ہے

جگا کے خاک کے پتلوں میں درد بھر دے گا ۔۔۔ ترا پیام ہے اور وہ مری زبانی ہے

اُسی کی عمر گزرتی ہے تیری قربت میں ۔۔۔ جسے ہراس یہ رہتا ہے موت آنی ہے

سناؤنگا تمھیں روداد زیست سوچ تو لو ۔۔۔ پرانی بات ہے بھولی ہوئی کہانی ہے

خطا معاف جو چھیڑا ہے تو سنتا ہوں ۔۔۔ نہ سن سکو گے مگر تم یہ وہ کہانی ہے

بہت کڑی ہے تری راہ اور منزل دور ۔۔۔ فگار پاؤں ہیں پیری ہے ناتوانی ہے

دلوں دلوں ہی میں ہوتے ہیں اُن سے راز و نیاز ۔۔۔ بڑے مزے کی محبت کی زندگانی ہے

اُٹھا رہا ہوں مزے یہ ترے لطفِ پنہاں کے ۔۔۔ عجیب چیز خموشی ہے بے زبانی ہے

حیات آپ کی، میں آپ کا، دل آپ کا ہے ۔۔۔ حضور کس لئے پھر مجھ سے سرگرانی ہے

میں جانتا ہوں کہ دردِ فراق کیا شے ہے ۔۔۔ یہ یادگار تری ہے تری نشانی ہے

جگر کا نام مٹائے سے مٹ نہیں سکتا ۔۔۔ وہ اس جگہ ہے جہاں عمرِ جاودانی ہے

---

[1] مؤلف دکن میں اردو نے سنہ ولادت ۱۰۰۰ھ لکھا ہے [2] تاریخ تنقید ادبیات اردو مؤلفہ حامد حسن قادری صفحہ ۱

[3] تذکرہ مخزن الشعراء مؤلفہ قاضی نورالدین میں یہ شعر گجرات کے ایک شاعر (جن کا تخلص باقی تھا) کے نمونہ کلام میں دیا گیا ہے اور تھوڑے سے فرق کے ساتھ یوں لکھا ہے، دیکھو ص ۲۹ مطبوعہ انجمن ترقی اردو

خدایا کیسے ویرانے میں تو نے ہم کو ڈالا ہے ۔۔۔ نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

مطربِ ناشاد

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم۔ اے)

مطربِ ہستی مجھے کوئی نیا نغمہ سنا
طرز ہو جس کی نئی، انداز ہو جس کا نیا

راگ ہو چھوٹا سا اور دھیمی تری آواز ہو
ساتھ اس آواز کے ہلکا سا بجتا ساز ہو

وہ سنا دے نغمہ جس سے روح میری شاد ہو
جس کو سن کر قیدِ غم سے دل مرا آزاد ہو

جس کو سن کر بھول جاؤں میں غمِ ایام کو
جس کو سن کر چین آ جائے دلِ ناکام کو

جس کو سن کر خود فراموشی سی ہو جائے مجھے
محفلِ ہستی میں خاموشی نظر آئے مجھے

جس کی ہر ہر تان سے پیدا ہو مجھ میں بیخودی
جس کے ہر آہنگ سے طاری ہو مجھ پر بیہوشی

جس کے سننے سے بدل جائے زمانے کی فضا
خود بخود آنے لگے دل کو حقیقت کا مزا

جس سے قلبِ مضطرب کی بے قراری دور ہو
چشمِ پرنم سے خیالِ اشکباری دور ہو

جس کی لے کے زیر و بم سے بیخبر ہو جاؤں میں
جس کو سنتے سنتے اطمینان سے سو جاؤں میں

رک گیا ہے کس لئے مطرب ابھی تو گائے جا
بند ہیں آنکھیں مگر میں ہوں ابھی تک جاگتا

گائے جا اے مطربِ ہستی ابھی تو گائے گا

پیغام

(از راجہ مہدی علی خاں)

اُس سے جا کر کوئی کہے ہمدم
تو نے تھا جس کو بے قرار کیا

اور جسے تو نے عمر بھر کے لئے
وقفِ اندوہِ انتظار کیا

اس نے چھوڑا نہ رشتۂ اُمید
ہر گھڑی تجھ پہ اعتبار کیا

لب پہ لایا نہ دل کی بات کبھی
لاکھ سوزِ دروں نے زار کیا

اس کا ایک ایک اشک تھا موتی
اُس نے جو صرفِ رہ گذار کیا

جس کو اک اک گھڑی تھی عمرِ طویل
عمر بھر اُس نے انتظار کیا

اس کے انجام نے اگر تم کو
کبھی بھولے سے سوگوار کیا

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

(از سید اصغر علی سکندر آبادی)

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے نام کے ساتھ آنجہانی لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے۔ کسے خبر تھی کہ ان کی یہ طویل علالت جان لیوا ثابت ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی طبعی عمر کو پہونچ چکے تھے لیکن وہ قوم جس میں قحط الرجال ہو کس طرح اپنے ایک عظیم المرتبت فرزند کی موت پر (گو وہ فطری ہی کیوں نہ ہو) ماتم نہ کرے۔ ڈاکٹر ٹیگور کی وفات سے بنگال کا ایک زبردست شاعر اور ادیب، ہندوستان کا صادق محب وطن اور جان نثار فرزند اور دنیا کی ایک جلیل القدر ہستی کی جگہ کم ہو گئی۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی وفات کلکتہ میں اپنے خاندانی مکان میں ۷۔ اگست ۱۹۴۱ء کو جمعرات کے دن اسّی سال تین ماہ کی عمر میں ۱۲ بجکر ۱۳ منٹ پر (کلکتہ کا مقامی وقت) واقع ہوئی۔ اسی دن شام کو دریائے گنگا کے کنارے نیم تولہ گھاٹ پر ان کے جسد خاکی کو نذر آتش کر دیا گیا۔

ڈاکٹر ٹیگور کی صحت ۱۹۳۷ء ہی سے خراب تھی۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں شانتی نکیتن میں وہ بہت زیادہ بیمار ہو گئے تھے، جب انھیں کچھ افاقہ ہوا تو مزید علاج کے لئے کلکتہ لائے گئے۔ تین سال بعد ستمبر ۱۹۴۰ء میں جب وہ کالمپونگ میں تھے تو انھیں یکایک درد گردہ کی شکایت ہو گئی اور یہی نامراد عارضہ ان کی موت کا باعث ہوا۔ اُنھیں کلکتہ لایا گیا ڈاکٹروں نے خیال کیا کہ آپریشن کی ضرورت نہیں ہے اور تقریباً ایک ماہ کے مسلسل علاج کے بعد اُن کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ اُسی وقت سے اُن کی تندرستی خراب ہوتی چلی گئی۔ جب حالت زیادہ خراب ہو گئی تو ۲۵۔ جولائی ۱۹۴۱ء کو اُن کو پھر کلکتہ لایا گیا اور ۳۰۔ جولائی کو آپریشن کیا گیا۔

آپریشن کامیاب رہا اور پہلے دو تین دن تک اُن کی حالت قابل اطمینان سمجھی گئی۔ آپریشن والے دن کی شام کو ڈاکٹر ٹیگور بہت خوش و خرم تھے اور اُنھوں نے بنگالی میں ایک نظم جس کا عنوان "موت" تھا بستر علالت پر سے لکھوائی۔ بنگالی ادب میں ڈاکٹر ٹیگور کی یہ آخری نظم ہے۔ اگلے دن جمعہ کو اُنھوں نے اپنی پرشوق تمنا کا اظہار کیا کہ بنگال کو مشہور مصور ڈاکٹر اباندرا ناتھ ٹیگور کی ستر سالہ سالگرہ منانی چاہیئے اور یہ آخری الفاظ ہیں جو اُنھوں نے ادا کئے۔

شاعر اعظم نے ۱۴۔ اپریل ۱۹۴۱ء کو (بیساکھ کی پہلی تاریخ بنگال کا نوروز) اپنی اسّی سالہ سالگرہ کے موقع پر جو شانتی نکیتن میں وشوا بھارتی والوں نے منائی تھی آخری تقریر کی۔ اس تقریر کا عنوان "انسانیت اور تمدن کا نازک مرحلہ"

تھا۔ پریس کے نام اُن کا آخری بیان وہ تھا جو اُنھوں نے مس۔ ای۔ راتھبون ممبر پارلیمنٹ کے جواب میں دیا اور جو ہندوستان کی لڑائی میں شرکت سے متعلق تھا۔ اُن کی آخری تصنیف جس میں کچھ نظمیں اور بچوں کے لئے مختصر افسانے ہیں گزشتہ مئی میں شائع ہوئی۔

گزشتہ ۷۔ اگست ۱۹۴۰ء کو آکسفورڈ یونیورسٹی نے ڈاکٹر ٹیگور کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ اُس دن کسے معلوم تھا کہ عین آج ہی کے دن جبکہ ڈاکٹر ٹیگور کو اس اعزاز پر مبارکبادیاں دی جا رہی ہیں اگلے سال وہ اس دنیا میں موجود نہ ہونگے اور مبارکباد کی جگہ تعزیت کے پیغام آئیں گے۔

ڈاکٹر ٹیگور نے اپنی بیماری سے بہت قبل اپنے اعزا سے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اُن کے آخری رسوم شانتی نکیتن میں ادا کئے جائیں، لیکن اپنی موجودہ بیماری میں اُنھوں نے رائے تبدیل کر دی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ جہاں تک اِن رسوم کا تعلق ہے لوگوں کی خواہش کا احترام کیا جائے۔ لہذا کلکتہ میں دریائے ہگلی کے کنارے نیم ٹولہ گھاٹ پر ان کی چتا کا انتظام کیا گیا جہاں کہ اُن کے آبا و اجداد کو نذرِ آتش کیا گیا تھا۔

انتقال سے دس منٹ قبل ڈاکٹروں نے آکسیجن کا استعمال بند کر دیا تھا کیونکہ ڈاکٹر ٹیگور اس کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ مسز پرتیما ٹیگور جو شاعر اعظم کی بہو ہیں شروع سے آخر تک ان کے بستر علالت کے قریب موجود رہیں۔ مکان سے باہر مضطرب و متفکر لوگوں کا ہجوم تھا جو دھوپ میں کھڑے تھے۔ ٹھیک ۱۱ بجکر ۱۲ منٹ گزرے تھے جب شاعر اعظم کے کمرہ سے ان کی موت کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد ان کا کمرہ کھول دیا گیا اور لوگ ڈاکٹر ٹیگور کے آخری درشن کرنے کے لئے اندر آنے لگے۔

اِن کی موت کا اعلان ریڈیو سے نشر کیا گیا اور ہندوستانی اخبارات کے خاص ایڈیشن شائع ہوئے چونکہ تمام دفتر، کالج اور اسکول بند کر دئے گئے تھے اس لئے مکان کے آگے لوگوں کا زبردست ہجوم ہو گیا تھا۔ لہذا پولیس کو مزید انتظامات کرنے پڑے۔ جو لوگ ڈاکٹر ٹیگور کی موت کے بعد اُنھیں دیکھنے آئے اُن میں بہت سے بودھ اور چینی بھی تھے۔

ان کی نعش نیچے لانے سے قبل وید کے اشلوک پڑھے گئے اور مسٹر رامانند چیٹرجی نے ایک مختصر سا بھجن پڑھا۔ ان کی ارتھی آرام کرسی کی صورت میں خاص طور پر آراستہ کی گئی تھی۔ تین بجے سہ پہر کو نکلی اور راج چیت پور روڈ، دیویکانندر روڈ، چترنجن ایونیو۔ کولوٹولہ اسٹریٹ، کالج اسٹریٹ، کارنوالس اسٹریٹ، گرے اسٹریٹ، بی۔ کے پال ایونیو اور اسٹرینڈ روڈ ہوتی ہوئی ۵ بجکر ۵۴ منٹ پر نیم ٹولہ گھاٹ پر پہونچی۔ جلوس نے دو گھنٹے میں پانچ میل کا سفر طے کیا۔ آخری رسوم آدھی رات کے قریب ختم ہوئے۔

رابندرناتھ ٹیگور، ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو کلکتہ میں اپنے جدی مکان میں جو نمبر ۶ دوارکاناتھ ٹیگور لین پر واقع

پیدا ہوئے۔ وہ مہرشی دیبندر ناتھ ٹیگور اور شریمتی سارد ھا دیوی کی چودھویں اولاد تھے۔ آٹھ نو سال کی عمر میں اُن کو ایک مشرقی درسگاہ میں داخل کر دیا گیا، اس کے چند ماہ بعد وہ کلکتہ نارمل اسکول میں داخل ہوئے جب وہ اس اسکول میں تعلیم پا رہے تھے تو کشتی اور جمناسٹک میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اسی زمانہ میں جبکہ وہ اس اسکول کے طالب علم تھے اُنھوں نے پہلی نظم لکھی۔ اس کے بعد جب وہ تقریباً دس سال کے تھے انھیں بنگال اکیڈیمی میں جو ایک اینگلو انڈین اسکول ہے داخل کر دیا گیا۔ لیکن یہ اسکول آپ کو پسند نہ آیا اس وجہ سے اسے چھوڑ دیا اور ان کے والد نے ان کی تعلیم کا گھر پر انتظام کر دیا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ شانتی نیکتن دیکھنے گئے جو بولپور کے قریب چھ ایکڑ کی اراضی تھی اور جسے اُن کے والد نے آشرم بنانے کے لئے خریدی تھی۔ کچھ دن بعد اُنھوں نے اپنے والد کے ہمراہ شمالی ہندوستان کا سفر کیا۔ اسی سیاحت کے دوران میں آپ نے اپنے والد سے سنسکرت، انگریزی اور علم ہیئت کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۴ء میں واپسی میں کلکتہ آ کر وہ سینٹ زیویر اسکول میں داخل ہو گئے اور گھر پر بھی استادوں سے پڑھتے رہے۔ اسی زمانہ میں آپ نے شیکسپیئر کے میکبتھ کا بنگالی میں ترجمہ کیا۔

۱۸۷۵ء سے جب اُن کی والدہ کا انتقال ہوا وہ بنگالی رسالوں میں مستقل طور پر مضامین لکھنے لگے۔ اس زمانہ میں وہ "بھانو سمہا ٹھاکر" کے فرضی نام سے لکھتے تھے اور انگریزی اخلاق، انگریز اور ان کا ادب، ڈانٹے اور اس کی محبوبہ جیسے مضامین اور دو شیزہ بھکارن جیسی نظموں سے ان کی قابلیت کا اندازہ ہونے لگا۔

جب وہ سترہ سال کے تھے تو کلکتہ سے اپنے بھائی ستیندر ناتھ کے پاس جو آئی۔ سی۔ ایس تھے احمد آباد چلے گئے۔ احمد آباد سے اپنے بھائی کے ہمراہ وہ یورپ گئے۔ انگلستان میں ان کا داخلہ برائٹن اسکول میں کرا دیا گیا جہاں وہ اپنی بھاوج اور اُن کے بچوں کے ہمراہ رہتے تھے۔ بعد میں ان کا داخلہ یونیورسٹی کالج لندن میں ہو گیا جہاں اُنھوں نے پروفیسر مارلے سے انگریزی ادب کی تعلیم حاصل کی۔ وہاں وہ دارالعوام میں گئے، گلیڈسٹون اور برائٹ کی تقریریں سنیں اور اکثر برٹش میوزیم میں جاتے تھے اور بنگالی رسالوں کے لئے مضامین لکھتے رہے۔ اس زمانہ کی آپ کی سب سے مشہور تصانیف "یورپ کے مسافر کے خطوط" اور "بھگنا ہردے" ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں بغیر کوئی ڈگری حاصل کئے لیکن اپنے دماغ میں بہت سے نقوش لیکر جو بعد میں ان کی شاعری پر اثر انداز ہوئے وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ بیس سال کی عمر میں انھوں نے ایک تمثیل لکھی، جس نے اُنھیں بنگالی ادب میں روشناس کرایا۔

لیکن انھوں نے ڈرامہ نگاری ہی پر بس نہیں کی۔ آپ نے چین میں افیم کی تجارت پر جو اہل یورپ کرتے تھے تقریر کی اور کلکتہ میڈیکل کالج میں "موسیقی اور جذبات" پر ایک تقریر کر کے تہلکہ مچا دیا۔ ان کے اہل خاندان ان کا یورپ سے بغیر کوئی ڈگری حاصل کئے واپس آ جانا پسند نہ کرتے تھے اور اس عرصہ میں انھیں یورپ جانے پر آمادہ کر رہے تھے۔ وہ جانے کے لئے رضامند ہو گئے اور کلکتہ سے ستیہ پرشاد گنگولی اور آشوتوش چودھری

کے ہمراہ روانہ ہوگئے لیکن مدراس جاکر اُن کے ارادہ میں تبدیلی واقع ہوئی اور اپنے بزرگوں کی مرضی کے خلاف وہ واپس آگئے۔ اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور متعدد کتابیں لکھیں۔

اِس زمانہ میں جبکہ ان کی عمر اکیس سال کی تھی وہ اپنی تصانیف میں صوفیانہ خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ ایک دن جب وہ اپنے مکان کے بالاخانہ پر کھڑے تھے اُنھوں نے ایک "خواب" دیکھا جس نے ان کے اپنے خیال میں "دنیا کو ایک نئی روشنی میں پیش کیا اور معمولی چیزوں کو اہم بنا دیا"۔ اگلے سال اُنھوں نے کرھار کی سیاحت کی اور متعدد ڈرامے لکھے۔ اس سال کے اختتام پر آپ نے مری نیلیتی دیوی سے شادی کی۔ اسی سال آپ کو اپنی بھاوج (جو تیندر ناتھ کی بیوی) کی وفات سے اپنی زندگی کا سب سے زبردست صدمہ پہونچا۔ اپنی تصنیفات کے علاوہ اُنھوں نے اس عرصہ میں مشہور انگریزی شعرا شیلے۔ ایلز بتھ۔ برٹ براؤننگ اور دیگر شعرا کی نظموں کا ترجمہ کیا اور بنکم چندر چٹرجی سے نئی ہندو تحریک پر تحریری مخالفت کی۔ وہ ڈرامے مضامین مزاحیہ افسانے۔ مختصر افسانے اور نظمیں لکھتے رہے۔

۱۸۸۶ء میں آپ کا پہلا بچہ مادھوری لتا پیدا ہوا۔ اپنی تصنیفی زندگی کے دوران میں آپ کے خیالات سیاست کی طرف مبذول ہونے لگے۔ آپ نے انڈین نیشنل کانگریس کے دوسرے اجلاس میں جو کلکتہ میں منعقد ہوا تھا اور جس کی صدارت دادا بھائی نوروجی نے کی تھی شرکت کی اور افتتاحی نظم پڑھی جو اسی موقعہ کے لئے لکھی گئی تھی۔ یہ نظم اِن الفاظ سے شروع ہوتی ہے "ہم یہاں آج اپنی ماتا کی طلبی پر جمع ہیں"۔ اگلے سال آپ کے والد نے شانتی نکیتن کی جائداد آپ کے نام منتقل کردی۔ اسی سال آپ کے سب سے بڑے لڑکے راتھندر ناتھ ٹیگور کی پیدائش ہوئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد آپ نے اپنی مشہور تمثیل "قربانی" مکمل کی اور اپنی خاندانی جائداد کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اسی سال آپ یورپ کی سیاحت کے لئے اپنے بھائی ستیندر ناتھ کے ہمراہ پھر روانہ ہوگئے۔ اور اٹلی۔ فرانس اور انگلستان کا دورہ کیا۔ واپسی پر آپ شیلی داہ میں جو ان کے خاندان کی جائداد کا صدر مقام تھا مقیم ہوگئے۔ یہاں کے قیام کی وجہ سے آپ کو مزدوروں اور کسانوں سے رابطہ بڑھانے کا موقعہ ملا۔ اگلے سال آپ نے اپنے سیاحت یورپ کی ایک ڈائری اور متعدد مختصر نظموں کو شائع کیا۔ اس عرصہ میں آپ کی شاعری کی شہرت عام ہوگئی۔ اور آپ نے "سادھنا" نامی ایک بنگالی رسالہ جاری کیا۔ کچھ ہی عرصہ میں یہ بنگالی زبان کا ایک مستند رسالہ سمجھا جانے لگا۔ انھیں دنوں آپ نے ایک ڈرامہ چترنگدا لکھا جس کا انگریزی ترجمہ غیر معمولی طور پر مقبول ہوا۔ اسی ڈرامہ کو مصور کرکے رابندر ناتھ ٹیگور نے مصور کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۷ء تک آپ بہت مصروف رہے۔

اگلے سال آپ نے شملہ سے واپسی پر کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں قانون بغاوت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ایک مقالہ پڑھا اس کے بعد بہت سے سیاسی مضامین لکھے اور سب سے آخر میں بال گنگا دھر تلک کی گرفتاری پر حکومت کے رجعت پسندانہ طرز عمل پر احتجاج کیا۔ اس کے بعد بھی آپ سیاسیات میں حصّہ لیتے رہے اسی زمانہ میں آپ نے ڈھاکہ پراونشیل کانفرنس کے اجلاس پر کسانوں کے ساتھ زمینداروں کے رویّہ کی سخت نکتہ چینی کی۔

۱۹۰۰ء میں آپ نے متعدد نظمیں اور مقالات لکھکر ہندوستان کی سیاسی۔ معاشی اور تمدنی حالت سے بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے اپنے خاندان کے ہمراہ شانتی نکیتن میں رہنے کا فیصلہ کیا جیساکہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اپنے زمانۂ تعلیم میں اسکولوں کی فضا سے خوش نہ تھے۔ وہ ان تمام خیالات کو جو استاد تعلیم کے سلسلہ میں رکھتے تھے پسند نہ کرتے تھے اور انھیں اپنا زمانۂ تعلیم بھی یاد تھا لیکن کیا بچوں کو اس طرح کی تعلیم نہیں دی جاسکتی کہ وہ اسے شوق اور دلچسپی سے حاصل کر سکیں؟ کیا ہندوستان کے پرانے آشرم کے تصوّر میں اس کا سامان موجود نہ تھا؟ اگر بچے شوق اور خوشی سے پڑھیں تو کیا وہ جلدی اور زیادہ محنت سے نہ پڑھیں گے؟ کیا اسکولوں کو بغیر محبت کے ہونا چاہیئے؟ یہی خیالات تھے جنھوں نے ٹیگور کو شانتی نکیتن اسکول جاری کرنے پر آمادہ کیا آپ خود وہاں تعلیم دیتے تھے۔ کچھ ہی عرصہ میں آپ کے گرد بہت سے اساتذہ جمع ہو گئے۔ ۱۹۰۲ء میں مالی مشکلات نے آن دبایا اور انھیں پوری میں اپنا مکان فروخت کرنا پڑا اور ان کی بیوی نے اپنے تمام زیور فروخت کر دیئے۔ اس اسکول میں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کو جاری رکھنے کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی لیکن روپیہ کہاں سے آئے؟ انھوں نے اپنی کتابیں فروخت کیں، کتابوں کے حقوق اشاعت فروخت کئے، لیکن ناکامی سے دوچار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ آپ کے اس زمانہ کے جذبات گیتان جلی میں جا بجا نظر آتے ہیں یہی وہ گیتان جلی ہے جس پر آپ کو نوبل پرائز ملا۔ اور جس نے آپ کو مغربی دنیا میں روشناس کرایا۔ اس سال آپ نے لارڈ کرزن کو مشرقی لوگوں کی نکتہ چینی کرنے پر مُنھ توڑ جواب دیا، اِسی سال آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے موقعہ پر آپ نے پھر سیاست میں زبردست حصّہ لیا۔ اس سلسلہ میں آپ نے متعدد نظمیں اور مقالات لکھے اور متعدد جلسے منعقد کئے۔ اسی موقعہ پر آپ نے ایک جلسہ میں قومی فنڈ کی اپیل کی اور اُسی جگہ پچاس ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ آپ نے خاص طور سے طالب علموں کو اُکسایا، آپ نے کوآپریٹو سوسائیٹیاں قائم کیں، دیہاتی کمیٹیاں قائم کیں، قومی خدمت کے لئے انجمنیں

قائم کیں اور قومی مدرسے جاری کئے کیونکہ وہ غیر ملکی حکومت کے احسان مند نہ ہونا چاہتے تھے سیاسی
حیجاج سے جو بنگال میں نئی صورت اختیار کرتا جارہا تھا مخالفت کرتے ہوئے آپ یکایک اس سے علحدہ
ہوگئے جس پر لوگوں نے آپ کی بڑی مخالفت کی لیکن آپ نے اس کا کوئی اثر نہ لیا اور سیاست سے
قطع تعلق کرنے کا ارادہ کرکے شانتی نکیتن چلے گئے۔

سیاست سے اس قطع تعلق کی بنا پر بنگالی ادب کو بڑا فائدہ پہونچا۔ اسی عرصہ میں آپ نے
اپنی بہت سی مشہور تصنیفات مکمل کیں۔ آپ کی پچاس سالہ سالگرہ کے موقعہ پر کلکتہ کے ٹاؤن ہال
نے آپ کو ایسا اعزاز بخشا جیسا کہ اس وقت تک کسی کو نہ بخشا گیا تھا۔ یہ واقعہ آپ کے نوبل پرائز
حاصل کرنے سے قبل کا ہے۔ اسی زمانہ میں شانتی نکیتن قومی ادارہ ہوتا جارہا تھا اور اسی وجہ سے
حکومت کی نظروں میں گرتا جارہا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں حکومت بنگال نے ایک حکم جاری کیا کہ شانتی
نکیتن حکومت کے ملازمین کے بچوں کے پڑھنے کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اس سال کے آخر
میں آپ بیمار ہوگئے جس کی وجہ سے سفر یورپ کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

اگلے سال آپ اپنے لڑکے اور لڑکی کے ہمراہ یورپ گئے۔ لندن میں آپ روتھین اسٹائن
سے ملے۔ روتھین اسٹائن کی وساطت سے آپ کی ملاقات ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس، عذرا پاؤنڈ۔ ایلس مینل
ارنسٹ رہنبر، ہنری ٹیولنس اور دیگر مشہور اشخاص سے ہوئی۔ وہاں آپ کے اخلاق اور قابلیت سے
لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں انگلستان کے قریب قریب تمام
مشہور ادیب شریک ہوئے انھیں دنوں میں آپ کی مشہور تصنیف گیتان جلی شائع ہوئی جو اس وقت دنیا
کے ادبی شاہکاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ انگلستان سے امریکہ چلے گئے جہاں آپ نے
شکاگو یونیورسٹی میں "ہندوستان کا قدیم تمدن" پر لکچر دیئے۔ آپ نے روچسٹر کی بین الاقوامی کانفرنس میں
بھی شرکت کی اور اقوام کی باہمی مخاصمت پر ایک مدلل تقریر کی، اس کے علاوہ آپ نے ہارورڈ یونیورسٹی میں
بھی کئی لکچر دیئے جو بعد میں کتابی صورت میں ساد ھنا کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۱۳ء
میں آپ انگلستان ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آگئے جس کے بعد ہی ماہ نومبر ۱۹۱۳ء میں آپ
کو نوبل پرائز ملا۔

۱۹۱۵ء میں بنگال کے گورنر نے حکومت کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کیا اور گاندھی جی نے کچھ لڑکے
افریقہ سے شانتی نکیتن میں تعلیم کی غرض سے بھیجے۔ اس کے بعد ہی گاندھی جی مع اپنی اہلیہ محترمہ شانتی نکیتن
تشریف لائے۔ اسی سال آپ کو سر کا خطاب ملا اور امریکہ کی ایل یونیورسٹی نے آپ کو مسئلۂ قومیت پر لکچر

دینے کے لئے مدعو کیا۔

آپ کا یہ دورہ یادگار رہیگا۔ واپسی پر آپ نے جاپان میں مسئلہ چین پر تقریریں کیں جن کو سرکاری حلقوں میں پسند نہیں کیا گیا لیکن پبلک کی طرف سے آپ کا شاندار خیر مقدم ہوا۔ اسی طرح آپ نے امریکہ میں شہنشاہیت کے خلاف لکچر دیئے جن پر ہمدردان برطانیہ نے ناخوشی کا اظہار کیا۔ لیکن آپ نے اس کی کوئی پرواہ کی۔ اور عوام امریکہ نے آپ کی خوب آؤبھگت کی۔ علمی حلقوں میں بھی آپ کی قدردانی ہوئی۔

۱۹۱۷ء میں آپ نے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی جو کلکتہ میں مسز اینی بسنٹ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ آپ نے اس جلسہ میں اپنی ایک نظم "ہندوستان کی دعا" پڑھی۔ اسی سال اور آئندہ سال بھی آپ کی متعدد مشہور تصنیفات انگریزی زبان میں شائع ہوئیں۔ شاعر اعظم کی نظر میں یہ سال یادگار تھا کیونکہ اس سال آپ نے وشوابھارتی کا سنگ بنیاد رکھا جو ایک بین الاقوامی جامعہ ہے۔

۱۹۱۹ء میں واقعہ جلیانوالہ سے آپ اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ نے حکومت کے خلاف کئی تقریریں کیں اور مضامین لکھے۔ اور سر کا خطاب بھی واپس کر دیا۔ اس کے بعد جب آپ دوسرے سال سفر یورپ کے سلسلے میں انگلستان گئے تو وہاں کے لوگ آپ سے کسی قدر کشیدہ رہے۔ لیکن فرانس۔ ہالینڈ بلجیم اور دیگر یورپی ممالک میں آپ کا نہایت شاندار خیر مقدم ہوا۔ فرانس میں آپ برگساں اور سلوین لیوی جیسی قابل قدر ہستیوں سے ملے۔ لیوی نے آپ سے ملنے کے بعد شانتی نکیتن میں کام کرنے کا ارادہ کیا۔

۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں آپ نے ہندوستان کا دورہ کیا اور شہنشاہیت کے خلاف جمہوریت کا پیغام لوگوں کو پہونچایا۔ اس عرصہ میں آپ کی متعدد تصنیفات شائع ہوئیں جس کی آمدنی آپ نے وشوابھارتی کو دے دی۔ ۱۹۲۴ء میں آپ چین اور جاپان گئے۔ وہاں سے واپس آکر آپ نے لارڈ لٹن کو اُن کی تقریر پر ایک خط لکھا جس میں اُنھوں نے بنگالی خواتین کے متعلق کچھ کہا تھا۔ اسی سال پیرو کی حکومت نے آپ کو اپنی آزادی کی صد سالہ سالگرہ کے جشن میں شرکت کے لئے مدعو کیا۔ راستہ میں آپ بیمار ہوگئے اور بیونس آیرز اُتر گئے۔ جنوبی امریکہ سے واپسی میں آپ اٹلی گئے۔ اگلے سال آپ پھر اس ملک میں گئے وہاں آپ مسولینی سے ملے۔ روم کے گورنر نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ نے وہاں فسطائیت کی تائید میں تقریر کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ حکومت کی طرف سے آپ سے اس کی درخواست کی گئی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں آپ کو پہلی ہندوستانی فلاسوفیکل کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔

اگلے سال آپ نے شانتی نکیتن کی امداد حاصل کرنے کے لئے ملایا، کناڈا، جاپان اور ہندچینی کا دورہ کیا۔ ۱۹۳۰ء سے آپ نے مصوری شروع کی۔ فرانس میں آپ کی تصویروں کی نمائش ہوئی۔ آپ کی تصویروں میں تازگی اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں آپ کو آکسفورڈ یونیورسٹی نے لکچر دینے کے لئے ہبرٹ میں مدعو کیا جس کا موضوع "انسانی مذہب" تھا۔ اسی اثناء میں آپ کو گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر ملی جس کی آپ نے منچسٹر گارجین میں علانیہ مذمت کی۔ انگلستان سے آپ جرمنی گئے جہاں وہ دنیا کے نامور ریاضی داں آئن اسٹائن سے ملے۔ اس کے بعد آپ روس گئے جہاں ملک کے متعدد لیڈروں نے آپ کا بڑے اعزاز سے استقبال کیا۔ وہاں آپ نے مختلف ادارے دیکھے۔ آپ کی سترویں سالگرہ کی یادگار میں ایک شاندار مجموعۂ مضامین شائع کرکے آپ کو پیش کیا گیا جس میں آئن اسٹائن، ہنری مین، برٹرینڈرسل اور دنیا کے دوسرے فاضل ناموروں کے مقالات تھے۔ روس سے آپ امریکہ ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آگئے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ ایران گئے جہاں شاہ ایران نے آپ کا خیر مقدم کیا۔

۱۹۳۴ء کے بعد سے شاعر اعظم اکثر و بیشتر شانتی نکیتن میں مقیم رہے اور اسی مقام سے تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا۔ اور یہیں سے وقتاً فوقتاً ہندوستان اور دنیا کے واقعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ پچھلے عرصہ میں آپ سخت بیمار ہوگئے۔ اس علالت کا سلسلہ آخر تک قائم رہا۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ آپ نے دو ہزار سے زائد نظمیں لکھیں۔ آپ کی انگریزی میں بعض مشہور تصنیفات یہ ہیں:۔ گیتان جلی (۱۹۱۲ء) باغباں، ماہ نو اور چترا (۱۹۱۳ء) تاریک کمرہ کا راجہ۔ ڈاک خانہ اور سادھنا (۱۹۱۴ء) کبیر کی نظمیں (۱۹۱۵ء) خوشہ چینی۔ بھٹکے ہوئے پرندے اور بھوکے پتھر (۱۹۱۶ء) قربانی اور دیگر تمثیلیں۔ گردش بہار اور محاضرات (۱۹۱۷ء) تحفۂ عاشق۔ ماشی اور دیگر افسانے اور طوطے کی تربیت (۱۹۱۸ء) شکستہ حال (۱۹۲۱ء) گورا۔ سرخ بوٹی (۱۹۲۴ء) جگنو (۱۹۲۵ء) ایک دوست کے نام خطوط (۱۹۲۸ء) اور انسان کا مذہب (۱۹۳۱ء)

نیرنگی دنیا

(از قاضی خورشید الاسلام، ایم۔ اے)

شبنم گریاں ہے تو گل خنداں ہے — سبزہ پامال، صبا نازاں ہے
وائے نیرنگِ جہانِ فانی — چشم بینا ہے، جیسے حیراں ہے

گھٹا

سانٹ[1]

(از جناب شائق وارثی بریلوی)

مستی کی چھاگلیں لئے
سانولے دوش پر گھٹا
بالوں کو منتشر کئے
چھا رہی ہے بصد ادا
پھولوں کی یہ کٹوریاں
چاندی سی یہ چمک دمک
پتیوں پہ یہ بوندیاں
جیسے ستارے مشترک
سیمیں سے آبشار پر
دھندلی سی وہ صباحتیں
زریں سے کوہسار پر
دوڑی ہوئی ملاحتیں
مینھ کی ہلکی سی پھوار
آہ! گھٹا کی یہ بہار

اتحادِ نظر

لیا نہ یہ میرے لئے ہے سوز بختی کا مقام	کیا نہیں اس پر بھی خوش ہو عشقِ گریاں صبح و شام
لیا یہ تارے آسمانوں میں جو ہیں بکھرے ہوئے	بن کے کلیاں گلشنِ گردوں میں ہیں بکھرے ہوئے
جن کو دیکھا کرتی ہیں یہ رات بھر آنکھیں مری	شاید ان کی بھی حسیں نظریں ہیں ان کو دیکھتی

(بیندھو لال شوقی)

[1] مصنف کی زیرِ تصنیف کتاب "نغمے" کا ایک سانٹ

کالی گھٹا

(از پنڈت اندرجیت شرما ماچھرہ ضلع میرٹھ)

کیوں سیہ پوشی تجھے بھاتی ہے اے کالی گھٹا
کس کے غم میں پھر رہی ہے کاکلیں کھولے ہوئے

کس لئے بے چین ہے تو کیا ہے تیرا مدّعا
ہے ہوا کے دوش پر اُڑنے کو پر تولے ہوئے

کم نہیں ہوتی کسی پہلو پریشانی تری
لحظہ لحظہ بڑھتی ہی جاتی ہے حیرانی تری

مست ہے کس حال میں رہتی ہے کیوں محوِ خیال
بے خبر اتنی، نہیں کچھ تن بدن کی بھی خبر

راہ میں آتا ہے جو کرتی ہے اُس کو پائمال
اُڑ کے بھرتی ہے طرارے گھومتی ہے کوہ پر

اتنی سرگرداں ہے کس کے واسطے دیوانہ وار
قلبِ عاشق کی طرح آتا نہیں تجھکو قرار

گھور کر اُٹھتی ہوئی اور چرخ پر چھاتی ہوئی
جھومتی ہے مست ہاتھی کی طرح چنگھاڑ کر

برق کی چنگاریاں پہلو سے برساتی ہوئی
چیختی ہے شور کرتی ہے کلیجہ پھاڑ کر

بس نہیں چلتا تو رونے پر اُتر آتی ہے تو
باتوں ہی باتوں میں پانی پانی ہوجاتی ہے تو

انتخاب دیوان غالبؔ

از مسٹر "سلیم جعفر"

بعض اصحاب کا خیال ہے کہ کائنات کے ہر فرد کی اصلیت پر پردہ پڑا ہوا ہے۔اس کی تہ تک پہونچنا کھیل نہیں۔ جگرخراشی اور سینہ کاوی کے بعد بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے

کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمہ را

اکثر تاریخی واقعات بھی اس کلیہ کی زد سے باہر نہیں ہیں۔ جب تک آنکھوں سے دیکھنے والے اُن پر سے پردہ نہ اُٹھائیں حقیقت رونما نہیں ہوتی اور وہ بحث و مباحثہ کی جولانگاہ بنے رہتے ہیں۔ "انتخاب دیوان غالب" اور "طباعت دیوان غالب" بھی دنیا کے اِسی قسم کے تاریخی واقعات ہیں۔

طباعتِ دیوان غالبؔ کا مسئلہ حل کرنے کے لئے جناب مظفرؔ حسین صاحب تمیمؔ نے ایک ڈراما تصنیف فرمایا، جو آل انڈیا ریڈیو پرلنشر اور ہمایوں بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دیوان کا دوسرا ایڈیشن اس قدر خراب چھپا کہ غالبؔ تاب نہ لاسکے اور بے اختیار دل سے آہ نکل ہی گئی۔[1] میرے پاس دیوان غالب کا ایک نسخہ ہے جو غالباً اس کی تیسری و چوتھی اشاعت ہے۔ خاتمۃ الطبع ہدیۂ ناظرین ہے:۔

"بخدمت ارباب سخن عرض کرتا ہے امید وار رحمت و غفران محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خان طیب اللہ ثراہ کہ اس سے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسداللہ خاں غالبؔ کا دہلی میں چھپا لیکن بہ سبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا۔اس لئے جناب مجمع لطف بیکراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کے ایک نسخہ میرے پاس بھیجا، میں نے بافضال ایزدی مطابق اُس نسخہ کے شہر ذی حجہ ۱۲۷۸ ہجری مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستیِ کمال سے چھاپا۔ امید کہ جب ناظرین اس کے مطالعہ سے حلاوت سخن کی

---

[1] دیوانِ بندہ راکہ آئینا سواد کرد
تنہا در و نہ شعر مجود نوشتہ است

از نظم و نثر ہر چہ بہ طبعش خوش آمدہ
دیوانِ بندہ پُر ز خوشامد نوشتہ است

ہر جا کہ لفظ "ید" مثلاً دید در سخن
دستِ تصرفش ہمہ را "بد" نوشتہ است

اکنوں شریک مہتر دیوان بندہ است
زیرا کہ بیشتر سخن خود نوشتہ است

---

[1] ہمکو افسوس ہے کہ یہ مضمون جنوری سنہ ۱۹۴۲ء میں وصول ہوا تھا۔ اتفاقی وجوہ کے اسقدر دیر بعد شائع ہو رہا ہے۔ ا۔ ز

پائیں مہتمم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔"

خاتمۃ الطبع میں جن محمد حسین خاں صاحب کا ذکر ہے وہ غالب مرحوم کے گلے کا ہار معلوم ہوتے ہیں۔ غلط دیوان اُنھوں نے چھپوایا۔ تیسرا ایڈیشن جس کا ذکر آگے آئیگا اُنھیں کی "دانائی" کا نتیجہ تھا۔ اور میرے پاس والے نسخہ کے محرک بھی آپ ہی تھے۔ حاصل کلام میرے پاس ایک دیوان غالب ہے جو اُس نسخے کی نقل ہے جسے خود غالب نے طباعت سے پہلے صحیح کیا ہے۔

لیکن اب تک میں جو کچھ لکھ آیا ہوں اُس کو میرے نفس مضمون سے اگر کوئی لگاؤ ہے تو یہ کہ اس دیوان کے شروع میں ایک فارسی کا دیباچہ بھی ہے، اور یہ اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لئے قصّہ پاک کئے دیتا ہے کہ دیوان غالب کا انتخاب کس نے کیا۔ پروفیسر محمد حسین صاحب آزاد کا یہ کہنا کہ:۔

"مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بے عدیل تھے، ایک زمانہ میں دہلی کی عدالت ضلع میں سررشتہ دار تھے۔ اُسی عہد میں مرزا خاں عرف مرزا خانی صاحب کوتوال شہر تھے۔ وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے، نظم ونثر فارسی اچھی لکھتے تھے غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر وسخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا، اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا خیر جو ہوا سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا، دونوں صاحبوں نے دیکھکر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو ہم آج عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔"

غلط ہے۔ اگر کچھ صحیح ہے تو مولوی عبدالباری صاحب آسی لکھنوی کا یہ خیال کہ مرزا نے خود اپنے دیوان کا انتخاب کیا۔ آسی صاحب اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

"خود میرے والد مرزا غالب کے دیکھنے والوں میں تھے۔ اُن کے کمال سخن کے پورے راز داں تھے وہ جب آزاد کا یہ آب حیات والا لطیفہ دیکھتے تھے کہ مرزا نے مولوی فضل حق سے انتخاب کرایا تو غصّے کے مارے سُرخ ہو جاتے تھے، اور فرماتے تھے کہ کیا بہتان باندھا ہے۔"

اب اُس دیباچہ کا ایک حصہ ہدیۂ ناظرین ہے جو اس نسخۂ دیوان غالب کے شروع میں ہے جو میرے پاس ہے اور جس کا اُوپر ذکر آ چکا ہے:۔

"یزداں درود بسخن افروز را سپاسم کہ شرارے ازاں آتش تابناک بخاکستر خویش یافتہ بکاوبکا وسینہ شگافتہ ام واز نفس دمہ بر آں برنہادہ۔ بو کہ در اندک مایہ روزگار آں مایہ فراہم

تواند آمد کہ مجمرہ را فروغ شناسائی چراغ و رائحہ عود را بال شناسائی دماغ تواند بخشید. ہمانا نگارندہ این نامہ را آں در سر است کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ بگرد آوردن سرمایۂ دیوان فارسی برخیزد۔ وبا ستفاضۂ کمال این فرپور فن پس زانوئے خولیشتن نشیند. امید کہ سخن سرایان سخنور ستائی پراگندہ ابیاتے راکہ خارج اوراق یابند از آثار تراوش رگ کلک این نامہ سیاہ شناسند وجا بہ گردآوردرا درستایش و نکوہش آں اشعار ممنون وماخوذ نسگالند۔ یارب این بوئے ہستی ناشیندۂ از نیستی بہ پیدائی نارسیدۂ یعنی نقش بضمیر آمدۂ نقاش کہ باسداللہ خاں موسوم بہ میرزا نوشہ معروف بہ غالب تخلص است چنانکہ اکبر آباد مولد و دہلوی مسکن ست فرجام کار نجفی مدفن نیز باد۔"

میرے نزدیک اس تحریر کے بعد جو بلاشبہ غالب کی اور تصنیف "آبحیات" سے پہلے کی ہے، آزاد مرحوم نے جو دعویٰ کیا ہے نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور اب اس کو ایک طے شدہ مسئلہ سمجھنا چاہیئے کہ اپنے دیوان کا انتخاب خود غالب مرحوم نے کیا۔ یہ عبارت اُن کے سوا کسی اور کی نہیں، اس کا ثبوت یہ ہے کہ شروع شروع میں صیغے واحد متکلم استعمال کئے گئے ہیں۔

لیکن منطق کو عقل آرائی کی گنجایش باقی ہے کیونکہ میرے پاس جو نسخہ ہے وہ غالباً تیسرا ایڈیشن ہی ہے۔ "دیوان غالب کی طباعت" سے صاف صاف ظاہر ہے کہ پہلا ایڈیشن ناپید ہوچکا تھا۔ جب دوسرا ایڈیشن مولوی محمد حسین صاحب نے شاہدرہ میں چھپوایا، مگر نظم طباطبائی مرحوم کی شرح دیوان غالب سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایک نسخہ چھپا ہے جس کے ساتھ غالب کا اُردو کا دیباچہ شائع ہوا ہے، وہو ہذا:۔

جو دیوان خود مصنف مرحوم کی تصحیح سے چھپا ہے اس کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"وداد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اُردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و داد آئیں میر قمرالدین کی کارفرمائی اور خاں صاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔"

اور جناب نظامی بدایونی صاحب نے جو دیوان غالب مطبع نظامی بدایوں سے شایع کیا ہے، اُس کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔

"اس سے پہلے چند در چند ایڈیشن دیوان غالب کے چھپ چکے ہیں جن میں تین نسخے ایسے ہیں

جو مرزائے مرحوم کی زندگی میں شائع ہوئے ہیں اور ایک آدھ کی تصحیح بھی مرزا سے منسوب کی گئی ہے۔"

میرے پاس جو نسخہ ہے وہ متضاد شہادتوں کی وجہ سے بہت کچھ باعثِ حیرانی بن گیا ہے خاصکر اس سبب کہ دیباچہ سے صاف صاف ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے والے خود حضرت غالب ہیں خاتمۃ الطبع ظاہر کرتا ہے کہ اس کی تصحیح خود حضرت مصنف نے کی ہے۔ اس معنی میں کہ یہ صحیح کئے ہوئے نسخہ کی نقل ہے، یہ اُن کے حیات میں چھپا ہے۔ کیونکہ بقول پروفیسر آزاد" آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۸۶۹ء ۱۲۸۵ھ میں جہان فانی سے انتقال کیا۔" اور اس کا سالِ طباعت ۱۲۷۰ھ ہے۔

چونکہ اس دیوان غالب کے دیباچہ سے "انتخاب دیوان غالب" کا سا متنازعہ فیہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہوا جاتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی صاحب مختلف نسخوں کو جمع کر کے جو رائے میں نے ظاہر کی ہے اس سے بہتر نتیجہ تحقیقات پیش فرمائیں تو دلدادگانِ کلام غالب پر احسان ہوگا۔

اس مختصر مجموعۂ کلام کے بعد نسخۂ حمیدیہ شائع ہو چکا ہے اور مولوی عبدالباری صاحب آسی بھی کلام غیر مطبوعہ مع شرح چھپوا چکے ہیں۔ گلہائے چمنستان غالب سے مشام جاں معطر کرنے والوں پر یہ لطف و کرم ہے لیکن انھیں ذرا اس دست برداری پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔

"اُمید کہ سخن سرایان سخنور ستائے پراگندہ ابیاتے را کہ خارج اوراق یا بند از آثار تراوش رگ کلک ایں نامۂ سیاہ نشناسند و جامہ گرد آورد را در ستایش و نکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند۔"

اسرارِ کتاب

علامہ اقبال مرحوم

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اُٹھتے ہیں حجاب آخر

احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز و تب و تاب اول، سوز و تب و تاب آخر

میں تجھکو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

کیا دبدبۂ نادر، کیا شوکت تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرقِ مے ناب آخر

خلوت کی گھڑی گزری، جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

نظّارے

(از مسٹر خلیل الرحمٰن مستقیمی)

انھیں میں دیکھتا ہوں روز فطرت کے نظاروں میں
روپہلی چاندنی میں تلملاتے برق پاروں میں

وہی جلوہ فگن ہیں اودے اودے کوہساروں میں
سنہری وادیوں میں گنگناتے آبشاروں میں

اندھیری رات میں جب کوئی رادھا گیت گاتی ہے
تو اک ہلچل سی ہوتی ہے ربابِ دل کے تاروں میں

اُفق کی اوٹ سے جب چھُپ کے کوئی مسکراتا ہے
عجب مستی سی چھا جاتی ہے چمکیلے ستاروں میں

نسیمِ صبح جب اٹھکھیلیاں کرتی ہے غنچوں سے
تو اک جنبش سی ہوتی ہے محبت کے شراروں میں

تصور میں چمک اُٹھتا ہے روئے دلنشیں اُن کا
کبھی جب برق گرتی ہے مہکتے لالہ زاروں میں

کوئی مالن بصد انداز جب آتی ہے گلشن سے
حسیں موجیں بھی شرماتی ہیں جیسے جوئباروں میں

بھری برسات میں جب مور بن کے گیت گاتے ہیں
تو برساتے ہیں اِک صہبائے رنگیں مرغزاروں میں

گھنے جنگل میں کوئی جیسے اِک بنسی بجاتا ہے
صبا گاتی ہوئی آتی ہے گلشن کی بہاروں میں
کسی کی نوجوانی کا تصوّر دل میں کرتا ہوں
یکایک جب گزر ہوتا ہے پھولوں کی قطاروں میں
کہ جیسے یاد کر لیتا ہے کوئی بھول کر مجھکو
مجھے جب ہچکیاں آتی ہیں آموں کی بہاروں میں
"خلیلِ خستہ جاں" کہہ کر کوئی جیسے بُلاتا ہے
کبھی جب غور سے سُنتا ہوں ساون کی پھواروں میں

نوائے راز

(از ابوالفاضل راز چاند پوری)

نظارۂ بہار کئے جا رہا ہوں میں
حُسنِ نظر نثار کئے جا رہا ہوں میں

دل کو اُمیدوار کئے جا رہا ہوں میں
گویا گناہگار کئے جا رہا ہوں میں

سو بار کھا چکا ہوں فریبِ وفا، مگر
دنیا کا اعتبار کئے جا رہا ہوں میں

جھوٹی تسلیوں سے تو تسکین ہو چکی
کیوں دل کو بیقرار کئے جا رہا ہوں میں

انجامِ انتظار سے واقف ہوں میں، مگر
فردا کا انتظار کئے جا رہا ہوں میں

تقدیر کی نوازشِ پیہم کو کیا کہوں
تدبیر بار بار کئے جا رہا ہوں میں

دیوانہ کن تھی کشمکشِ جبر و اختیار
اب جبر اختیار کئے جا رہا ہوں میں

رکھیں گے مجھکو یاد حریفانِ خوش نظر
فطرت کا رازدار کئے جا رہا ہوں میں

اے راز تو کہاں، یہ شرابِ خودی کہاں
ہشیار، ہوشیار کئے جا رہا ہوں میں

بلیک ہول

(از مسٹر ارشاد فاطمی، بی۔ اے آنرز)

عرصہ ہوا رسالہ "زمانہ" میں ایک مضمون جنگ پلاسی کے متعلق حضرت وصل بلگرامی مدظلہٗ کا شائع ہوا تھا حضرت ممدوح نے صرف جنگ اور اس کے بیان ہی پر اپنے مضمون کو تمام کیا تھا میں چاہتا ہوں کہ اس اہم تاریخی واقعہ پر مزید روشنی ڈالوں اور اس ضمن میں "بلیک ہول" کی مشہور من گڑھت کہانی کو چند تاریخی حوالوں سے اور زیادہ واضح کروں۔ میں چونکہ خود مرحوم نواب کے خاندان کا ایک رکن ہوں لہذا بہت سے واقعات ایسے جانتا ہوں جو صفحۂ تاریخ پر ہنوز روشن نہیں ہوئے ہیں۔ گھر کی بات گھر والے ہی بہتر جانتے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں اپنے مقصد کلام پر پہونچوں چاہتا ہوں کہ ایک مختصر تاریخی واقعہ اور بھی درج کردوں جو غیر متعلق نہ ہوگا جس وقت میرن کے ناپاک ہاتھوں سے نواب کے قتل کی خبر عظیم آباد آئی راجہ رام نرائن موزوں نائب ناظم بہار اپنی دریا کنارے والی فرودگاہ میں مسندِ عدالت لگائے بیٹھے تھے۔ اس اندوہ ناک خبر کے پاتے ہی ایک سکتے میں آگئے، قلمدان اُٹھا کر غرقِ آب کر دیا بار بار اُٹھتے تھے اور ٹہلتے تھے اور رو رو کر یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک خط بنام نواب اسمٰعیل قلی خاں میں راجہ صاحب دوسرا شعر بھی لکھتے ہیں:۔

بلبلِ بیدرد کو نسبت ہے کیا پروانے سے
وصل میں مرجائے وہ یہ ہجر میں جیتی رہے

ظاہر ہے کہ نواب سراج الدولہ کا خون ایسا نہ تھا جو رنگ نہ لاتا یا ایسا نہیں جو سُرخیِ شفق نہ بنے اب جبکہ موجودہ کشمکشِ زمانہ نے ہماری آنکھوں سے غبار دھو دھو کر آنسوؤں کی صورت میں نکال دیا ہے ہمارے دل اور دماغ دونوں صورتِ آئینہ صاف اور روشن ہیں۔ لہذا اپنا ماضی اپنے زمانۂ حال میں اور زیادہ صاف نظر آتا ہے۔ اسی طرح جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اپنا دامنِ تخیل

بہت زیادہ کشادہ پاتے ہیں اور نگاہیں ہمیشہ حقیقت کی جانب اٹھتی ہیں۔
ہم تو ہم اب جب غیر بھی ہماری تاریخ پڑھتے ہیں تو وہ تعصب اور کینے کو دل سے نکال کر ہمیشہ حقیقت اور اصل واقعات کی جانب اپنے ضمیر کو رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں جب آل انڈیا ہسٹوریکل سوسائٹی کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا مسٹر لٹل (Mr Little) نے واقعۂ بلیک ہول کا تذکرہ کرتے صاف لفظوں میں کہا:-

"The Black-Hole incident was a gigantic hook."

اب اسی بیان سے اس بے بنیاد گھڑت قصہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی اجلاس میں یہ سبجکٹ کافی گھنٹوں تک زیر بحث رہا۔ اس بحث میں اے۔ کے۔ بنرجی آنجہانی بھی شامل تھے آپ نے اس واقعہ کے متعلق فرمایا کہ یہ محض بے بنیاد حکایت ہے۔ اول تو مسٹر ہال ول جس بڑے کمرے کا تذکرہ کرتے ہیں اس کا طول و عرض صاف صاف بتاتا ہے کہ اتنی سی مختصر جگہ میں ایک سو چھیالیس (۱۴۶) قیدی کسی طرح سما نہیں سکتے۔ دوسرے یہ کہ اس بے بنیاد حکایت کے راوی صرف مسٹر ہال ول ہیں اور انھیں کے نوشتے سے تمام مورخوں نے یہ روایت اخذ کی ہے۔ مگر قبل اس کے کہ ہم کسی مصنف کی تصنیف کے متعلق کچھ رائے قائم کریں سب سے پہلے لازم ہے کہ خود اس کی پرائیویٹ لائف پر تنقیدی نظر ڈالیں۔ مسٹر جوان ہالول ایک لائق شخص ضرور تھے مگر عیاری میں طاق تھے اور اس فن میں اپنے ہمعصروں میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ خود لارڈ کلایو کا بیان ہے:-

"Mr. Holwell is an specious and sensible man and no donbt, but from what I have heard and observed myself, I cannot be persuaded if he will ever make use of his abilities.

ایک جگہ اور ۱۷۶۶ء میں لارڈ کلایو اپنے خفیہ رپورٹ میں یوں لکھتے ہیں:-

Mr.... has talents but I fear once for all a heart, therefore unfit to preside, where integrity as well as capacity are equally essential.

اب مسٹر ہال ول کے متعلق میرے بیان کی زیادہ ضرورت نہیں صرف لارڈ کلایو ہی کی زبان کافی ہے

یہاں پر ایک واقعہ اور قابل غور ہے۔ لارڈ کلایو کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد مسٹر ہال ول نے میر جعفر کی شکایت کمپنی کے ڈائرکٹروں کے ہاں کی اور تحریر کیا کہ یہ نہایت ہی بے رحم شخص ہے اور اس نے کئی انگریزوں کو قتل کر ڈالا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں کئی آدمیوں کے نام بھی لکھ بھیجے جو میر جعفر کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ۱۷۶۶ء میں جب کلایو ہندوستان واپس ہوا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ لوگ جن کے نام ہالول نے مقتولین کی فہرست میں گنائے تھے سب زندہ نکلے۔ تو بس اتنا کافی ہے کہ ایسے شخص کے لئے ایک بڑی سے بڑی کہانی اور ایک چھوٹی سے چھوٹی روایت کا گڑھ دینا محض آسان تھا۔ اسی بنا پر سراج الدولہ کے کیرکٹر کو بدنما دکھانے کے لئے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے بلیک ہول کی ہیئتیا تصنیف کی گئی۔

اور تو اور خود نواب کے معاصر ہندوستانی مورخین اس واقعہ کا کہیں بھی تذکرہ نہیں کرتے ہیں نواب غلام حسین خاں اپنی سیر المتاخرین میں سراج الدولہ کے عیوب پر بہت زیادہ روشنی ڈالتے ہیں مگر اس واقعہ کا تذکرہ کہیں بھی نہیں کرتے۔ خود مظفر نامہ کا مؤلف بھی خاموش ہے۔ اور دیگر آرمینین تذکرے بھی ساکت ہیں۔ اگر سراج الدولہ سے میر جعفر کے گھر والوں کو مخاصمت تھی تو وہ ضرور بالضرور اس اہم ترین واقعہ پر زور دیتے۔ مگر ان کے ہاں کی بھی کوئی چیز اس بات کی شہادت نہیں دیتی بس معلوم ہوا کہ اس روایت کے مصنف ہمارے ممدوح و کرم فرما مسٹر ہال ول ہی تھے۔ ان کی تصنیف ۱۷۶۵ء میں لندن میں چھپی اور پھر اس کے بعد یہ واقعہ عالمگیر ہوگیا

ہمارے بہت سے ہندوستانی اہل قلم یہ الزام نواب کے سر سے اٹھا کر مانک چند کے سر عائد کرتے ہیں۔ مگر وہ کہاں تک حق بجانب ہیں خود انھیں بھی اس کی خبر نہیں۔ مانک چند بذات خود ایک نیک نہاد اور باوفا شخص تھا، کجا وہ اور کجا یہ ظلم۔ وہ رفاہِ عام کا ہمیشہ جویا تھا۔ چنانچہ خود اس کا بنوایا ہوا تالاب جو مخلوق خدا کی راحت کے لئے کھدوایا گیا تھا اب تک پٹنہ میں (سر علی امام کی کوٹھی کے پشت پر) یادگار ہے۔

زمانہ جولائی ۱۹۴۱ء میں مضمون "اردو ہندی ہندوستانی" کے مصنف کا نام غلط درج ہوگیا ہے "حق پسند" کے بجائے "حق پرست" ہونا چاہیئے۔ اسی مضمون میں صفحہ ۴ آخری سطر پر اس عبارت "ہمارے اردو کو اختیار کرنے میں" چھوٹ گیا ہے۔ اصل عبارت یوں ہونی چاہیئے "ہمارے اردو کو اختیار نہ کرنے ہی سے"۔

موت

(حضرت الطاف مشہدی)

ابھی تو کیف کی ندی بہائی ہے میں نے
ابھی تو بانسری منہ سے لگائی ہے میں نے

ابھی تو ایک جگر دوز انتظار کے بعد
نقابِ چہرۂ گلگوں اٹھائی ہے میں نے

ابھی تو سازِ جوانی کو میں نے چھیڑا ہے
ابھی تو شوق کی بستی بسائی ہے میں نے

ابھی تو کالی گھٹاؤں کی دیکھ کر مستی
کسی کی زلف کی سوگند کھائی ہے میں نے

ابھی تو حکم دیا ہے فلک کو سجدے کا
ابھی تو آنکھ زمیں کو دکھائی ہے میں نے

ابھی تو حسن کی ایمن نواز کرنوں سے
جگر میں عشق کی دھونی رمائی ہے میں نے

ابھی تو کھیلنا سیکھا ہوں نرم پھولوں سے
شراب و شعر کی محفل جمائی ہے میں نے

ابھی تو حسن کی مخمور سی شعاعوں پر
جگر کو تھام کے اک چیز گائی ہے میں نے

ابھی تو کاکلِ عنبر فشاں کی لپٹوں سے
تخیلات کی دنیا سجائی ہے میں نے

ابھی تو شعر کی دنیا کو زندگی دی ہے
ابھی تو جدتوں کی مے لنڈھائی ہے میں نے

ابھی تو میری جوانی نے آنکھ کھولی ہے
ابھی تو دولتِ احساس پائی ہے میں نے

ابھی تو نیند کے ماتوں کو میں نے چھیڑا ہے
ابھی تو ایک جھلک ہی دکھائی ہے میں نے

خدا کے واسطے اے موت مجھ کو جینے دے
شرابِ زیست کے پرکیف جام پینے دے

دُکھی کی پُکار

(از پروفیسر حامد حسن قادری، ایم۔ اے)

مَیں نے بعض ادبی تبرکات کی جو گوشۂ گمنامی میں تھے یا یاد سے محو ہو گئے تھے "زمانہ" کے ذریعہ سے اُن کی یاد تازہ اور یادگار قائم کر دی ہے یعنی سنہ ۱۹۳۹ء اور سنہ ۱۹۴۰ء میں حضرت مضطر خیرآبادی حضرت بیخود بدایونی، حضرت علوی ہاپوڑی اور حضرت آسی بدایونی کی نثر و نظم میرے مختصر تعارف کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں، اسی نوع کی ایک قدیم نظم میرے پاس اور بھی تھی، اور اس کو اشاعت کے لئے "زمانہ" کو بھیجنے کا ارادہ تھا، لیکن بھول گیا اور اتنی دیر ہو گئی۔ اس غفلت سے بڑا نقصان یہ ہو گیا کہ اب مَیں نے اس نظم کو ڈھونڈھا تو معلوم ہوا کہ اُس کا آخری ورق غائب ہے، بڑا افسوس ہوا میرے اندازے میں نظم کے کم از کم بیس۲۰ شعر اور ہونگے۔ اب اگرچہ نامتمام ہے، لیکن ممکن ہے اس قدر بھی اور کہیں نہ ملے۔

یہ مضطر خیرآبادی کی ایک نظم ہے جس کا نام اس مضمون کا عنوان ہے، میرے پاس اُن کا کُلیات نہیں ہے، اگر اُن کا تمام کلام چھپ گیا ہے تو اس میں یہ نظم بھی شامل ہونی چاہیئے۔ میرے پاس جو مطبوعہ نسخہ ہے وہ ۴۵ برس پہلے اکتوبر سنہ ۱۸۹۶ء کا چھپا ہوا ہے اور تیسری بار چھپا ہے۔ نظم اب سے کم از کم پچاس برس پہلے کی لکھی ہوئی ہوگی۔ یہ کتاب جیبی تقطیع ۱۶ صفحہ، ۱۳ سطر مسطر پر مطبع مطلع العلوم مراد آباد میں چھپی ہے۔ سرورق پر جلی و خفی قلم سے کتاب و مصنف کا نام اور تعریف اس طرح سے مرتب کی گئی ہے۔

"یہ ایک دردمندانہ مناجات بحضور پروردگار ہے، اس لئے اس کا نام "دُکھی کی پکار" ہے اور یہ مجموعہ دارالضرب درہم داغ جگر مولوی منشی سید محمد افتخار حسین صاحب مضطر خیرآبادی برادر خرد حضرت لبسمل کی طرف سے ہدیۂ یادگار ہے۔"

مضطر خیرآبادی نے یہ مناجات مولانا حالی کی "مناجات بیوہ" کی بحر میں اسی اسلوب و زبان میں لکھی ہے۔ مولانا حالی کے شاعرانہ کمالات میں یہ "کرامت" بھی شامل ہے کہ انھوں نے بعض ایسی دلکش بحریں استعمال کیں جن میں ان سے پہلے کوئی طویل و ممتاز نظم نہ لکھی گئی تھی۔ مسدس حالی اور مناجات بیوہ

کے اوزان اُردو میں بالکل جدید معلوم ہوتے ہیں۔ "مناجات" کی بحر میں صرف میر تقی میر کی ایک مثنوی اِس سے پہلے موجود تھی، جس کا مطلب یہ ہے :۔

ضبط کروں میں کب تک آہ اب چل رے خامہ بسم اللہ اب

مولانا حالی نے "مسدس" و "مناجات" کے موضوع و مضمون کی مناسبت سے اُن کے لئے بحریں انتخاب کرنے میں بڑے ذوقِ سلیم کا ثبوت دیا ہے۔ موضوعِ مسدس کی روانی اور زور کے لئے اس کی بحر متقارب سالم (فعولن فعولن فعولن فعولن) نہایت موزوں ہے۔ اور مضمونِ مناجات کے لئے جس سوز و درد اور نرمی و آہستگی کی ضرورت تھی وہ اس کی بحر متدارک (فعلن فعلن فعلن فعلن) میں موجود ہے یہ بھی ان نظموں کی کامیابی و مقبولیت کا ایک سبب ہے، اور مسدس حالی کے جواب میں جو بلا مبالغہ درجن بھر استنے ہی بڑے مسدس لوگوں نے لکھدیئے، اس کی وجہ بھی بحر کی روانی و آسانی تھی۔

"مناجاتِ بیوہ" کی تقلید میں حضرت مضطر خیرآبادی نے اپنی نظم "دُکھی کی پکار" لکھی ہے اس طرح کی اور کوئی طویل نظم میری نظر سے نہیں گذری۔ "مناجاتِ بیوہ" میں مولانا حالی کا بڑا کمال اسلوبِ بیان و زبان کی موزونیت ہے۔ عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی کے الفاظ محاورے، کہاوتیں ایسی برمحل برتی ہیں کہ جادو کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ مضطر خیرآبادی نے بھی اپنی نظم میں وہی اثر پیدا کرنا چاہا ہے اور کثرت سے ہندی الفاظ لکھے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ حالی نے صرف لفظ و محاورہ پر بس کی ہے اور مضطر نے مصرعے کے مصرعے ہندی میں موزوں کر دیئے ہیں۔ حالی کا یہ اسلوب ہے :۔

یہ برکھا اور پیا پردیسی آئیو برکھا کہیں نہ ایسی
سائیں بن جو چیز ہے گھر میں خاک ہے سب عورت کی نظر میں
پڑی تھی جس بے دید کے پالے ہوئی تھی جس بَیری کے حوالے
نام پہ دھونی اُس کے رماکر آن کو رکھا جان گنوا کر
پیت نہ تھی جب پایا پیتم جب ہوئی پیت گنوایا پیتم

مضطر نے اِس طرز سے بڑھکر یہ انداز بھی جابجا اختیار کیا ہے :۔

او ٹوکن ہارے بتیا کے (ٹوکنے والے) او روکن ہارے نیا کے (روکنے والے)
او بِیون کے بانہہ گہیّا (بیوہ) (ہاتھ پکڑنے والے) او دُکھین کے دُکھ پوچھیّا (دُکھی)

او پوچھتیا ہم جیئین کے — او جگوتیا رات اور دن کے

جو بلیا (ہم بیسو للہ) مطلب کا گر جی — مورے بھاگ، ہتیاری مرجی (میرے نصیب — تیری مرضی)

رین دِنا (غرض) توری آسا ہو — تورا ہاتھ، مورا کاسا ہو (ہاتھ — کاسہ)

جو مانگوں سو تو سے پاؤں — اور کہوں مانگن نا جاؤں

یہ فصیح اور شہری بھاشا نہیں ہے دیہاتی زبان ہے، لیکن دلچسپی اور دلکشی سے خالی نہیں (نہیں)
اس میں بھی ایک خاص لطف و تاثیر ہے۔ مصنف نے ایک نیا انداز بھی پیدا کیا ہے یعنی مصرعوں کے
ٹکڑے مقدم و مؤخر کر کے دوسرا شعر نکال لیا ہے۔ چھوٹی سی نظم میں بڑی کثرت سے ایسا کیا ہے۔ اس
"اُلٹ پھیر" میں بھی ایک جدت پیدا ہو جاتی ہے لیکن کثرت اچھی نہیں معلوم ہوتی، دو چار شعر یہ ہیں:-

او سگری مایا کے مالک — او سگری کایا کے مالک

او مالک سگری کایا کے — او مالک سگری مایا کے

کایا کے مایا کے مالک — مایا کے کایا کے مالک

او مایا کایا کے مالک — او کایا مایا کے مالک

بے مایہ ہوں مایا دیدے — دھوپ کے بدلے سایا دیدے

سایہ دیدے دھوپ کے بدلے — روپ دکھا بہروپ کے بدلے

حضرت مضطر کی یہ نظم صرف شاعری نہیں ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی کسی دکھی کی پکار
ہے۔ جیسا کہ خود مصنف نے نظم سے پہلے مختصر دیباچہ میں لکھا ہے۔ اول دیباچہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے

"میں اپنے پیدا کرنے والے پروردگار کا سپاس ادا کرتا ہوں، جس نے مجھکو پیدا کیا اور پیدا کر کے
اس چھوٹی سی عمر میں کہ جس کا تیسواں سال تمام ہونے کو ہے، دنیا کی ناپائداریوں پر اور انقلابات
عالم کی بدکرداریوں پر مجھکو ایک خاص تجربہ عنایت فرمایا۔ اور اس گزری ہوئی زندگانی اور بیتی ہوئی
جوانی میں مختلف عیشوں اور مختلف مصیبتوں کا مزہ چکھایا۔ جلّ شانہٗ وجلّ جلالہٗ، ہونے
کو میں کسی قابل نہیں ہوں، لیکن بمصداق فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ کسی نہ کسی خاص ضرورت
سے بنا ہوں۔ اور کسی نہ کسی خاص کام کے لئے بنایا گیا ہوں۔ غالبًا بگڑنے کو بنا ہوں اور بننے کو بگڑونگا
یہ بننا بگڑنا ایک ایسا ضروری امر ہے کہ ہونا ہے اور پھر ہونا ہے، اگرچہ بظاہر ؎

نہ شگوفہ ام نہ برگم نہ ثمر نہ سایہ دارم — ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

لیکن آپ جانیں کہ خدا کی خدائی میں شئی من الاشیاء خالی از علت نہیں پیدا کی گئی ہے۔ جب یہ ہے

تو مجھکو اپنی ناکامی بھی ایک بڑے کام کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ میں اپنے اللہ کے بندوں میں ایک نکما اور نہا نکما بندہ ہوں اس لئے اپنے نہونے کے بعد اپنے دینی اور قومی بھائیوں کو کسی طرح یاد نہیں رہ سکتا۔ ناچار ایک مجموعۂ اشعار ناہموار کو جسکا نام "دُکھی کی پکار" ہے۔ اپنے معزز و قدر دان ملک وقوم کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ وہ اِن چند اوراق پریشاں کو میری یادگار نشانی سمجھکر اپنے پاس رکھیں، اور بہتر ہو جو اس کو بھی شریک وظائف نیم شبی و اوراد سحری گردان کر اپنے ساتھ میرے حق میں بھی دعائے خیر کریں۔ اللہ بس باقی ہوس۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم و علیٰ آلہٖ واصحابہ اجمعین۔

مضطر شوریدہ سر

مضطر کی مناجات کی طرح اس دیباچے میں بھی مایوسی کی جھلک ہے۔ گویا وہ اپنی زندگی سے بددل یا نا اُمید ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو عمر دراز عطا فرمائی اور زندگی میں شادکامی عنایت کی۔ اس "پکار" کے لکھنے کے بعد تیئس ۲۳ برس زندہ رہے، بڑے عہدے اور خطاب پائے۔ اپنی یادگار میں صرف یہ مناجات نہیں بلکہ کئی دیوان چھوڑے۔ بڑے زندہ دل آدمی خوش گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اُن کی ایک غزل اس قدر مقبول و مشہور ہوئی کہ ہر کوچہ و بازار میں لوگ اس کو گاتے پھرتے تھے، اس کا مطلع یہ ہے:۔

یہ کیسے بال ہیں بکھرے یہ صورت کیوں بنی غم کی تمھارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

اس کا پہلا مصرع غلط مشہور ہوگیا تھا، تیئس برس سے زیادہ ہو گئے ہونگے مضطر نے رسالہ "مخزن" لاہور میں اپنی غزل چھپوائی اور لکھا کہ اس کے بعض اشعار زبان عوام پر غلط چڑھ گئے ہیں۔ مطلع کا پہلا مصرع اس طرح درست کیا تھا:۔

"یہ کیسے بال بکھرا ہے، یہ کیوں صورت بنی غم کی"

مضطر بڑے فراخ حوصلہ، سخن شناس اور قدر دان تھے، ایک واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ جنوری ۱۹۰۰ء میں نواب حامد علی خاں صاحب بہادر رئیس رامپور نے شاہانہ اہتمام کے ساتھ عظیم الشان مشاعرہ منعقد فرمایا تھا جو دو ۲ روز میں ختم ہوا تھا۔ تمام ہندوستان کے اساتذۂ شعر و سخن جمع ہوئے تھے دوسرے دن اُستادوں کے پڑھنے کی باری آئی۔ منشی حیات بخش رسا سکندر آبادی نے یہ مطلع پڑھا:۔

ہاں ہاں، ضرور صدمے دشمن کی جان پر ہیں جب اپنی جان پر ہیں، سارے جہان پر ہیں

مضطر اس کو سُنکر فرط مسرت اور جوش تحسین سے مست و سرشار تھے۔ خود حضرت مضطر کی بھی ایسی

ہی قدر کی گئی۔ یہ لطیفہ شاید اپنی نوعیت کا ایک ہی ہوگا کہ غالباً ۱۹۱۵ء میں مضطر کی ایک غزل کسی پرچے میں شائع ہوئی۔ میں اُس زمانے میں ریاست بڑودہ کے کالج میں مدرس تھا۔ بڑودہ کے ایک سخن فہم رئیس کو یہ شعر بیحد پسند آیا:۔

وقت مجھ پر دو کٹھن گزرے ہیں ساری عمر میں   آپ کے آنے سے پہلے آپ کے جانے کے بعد

اُن رئیس صاحب نے یہ قدر دانی کی کہ مضطر کو تار کے ذریعہ سے اس کی داد دی۔ پورا شعر رومن حروف میں لکھا گیا اور ایک جملۂ ستایش کے ساتھ مضطر کو روانہ کیا گیا۔ وہ تار میں نے لکھا تھا۔

افتخار الشعرا، اعتبار الملک، افتخار جنگ، خان بہادر سید محمد افتخار حسین رضوی مضطر خیرآبادی ۱۸۶۵ء (۱۲۸۲ھ) میں پیدا ہوئے تھے۔ والد کا نام حافظ سید احمد حسین ہے رُسوا تخلص تھا۔ مضطر کی والدہ مولانا فضل حق خیرآبادی کی صاحبزادی تھیں اور خود فاضلہ وشاعرہ تھیں۔ مضطر نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی اور شروع میں اپنے کلام پر اصلاح بھی اُنھیں سے لی۔ پھر حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ اختیار کیا۔ کئی دیوان ان سے یادگار ہیں۔ ایک پورا دیوان "حمد باری تعالیٰ" میں کہا اور اس کا نام "نذر خدا" رکھا۔ دوسرا نعتیہ دیوان "نذر مصطفےٰ" کے نام سے شائع کیا۔ مضطر کے بڑے بھائی حضرت بسمل خیرآبادی نواب صاحب بہادر ریاست ٹونک کے اُستاد تھے اُن کے بعد مضطر کو یہ شرف حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ ریاست میں ججی کے عہدہ پر فائز رہے۔

اب مضطر کی مناجات "دُکھی کی پُکار" پڑھئے:۔

دُکھی کی پُکار

اَمَّن یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ[1]

او جگ داتا، داتا جگ کے   او پرکھن ہارے رگ رگ کے   اور رگ رگ کے پرکھن ہارے   او سگرے جگ کے داتارے

او بن والی، سب کے والی   سب میں تو، سب تجھ سے خالی   سب تجھ سے خالی تو سب میں   ڈھب سے باہر اور پھر ڈھب میں

او سچے جھوٹے کے مالک   او ٹوٹے پھوٹے کے مالک   او مالک سچے جھوٹے کے   او مالک ٹوٹے پھوٹے کے

سوکھے اور ہرے کے مالک   کھوٹے اور کھرے کے مالک   مالک کھوٹے اور کھرے کے   مالک سوکھے اور ہرے کے

چھوٹے اور بڑے کے وارث   بیٹھے اور کھڑے کے وارث   وارث بیٹھے اور کھڑے کے   وارث چھوٹے اور بڑے کے

او ایسے ویسے کے والی   او جیسے تیسے کے والی   او والی جیسے تیسے کے   او والی ایسے ویسے کے

---

[1] جب کوئی مضطر و ناچار اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو وہ اُس کی سنتا ہے اور اُس کی تکلیف کو دُور کر دیتا ہے۔

ایسے کو تو ویسا کر دے　　جیسا چاہے ویسا کر دے
کیونکر کوئی تجھ سے بھاگے　　تو موجود ہے آگے آگے
او اَن دیکھے دیکھے بھالے　　اُو اَن بولے بولے چالے
او بن بوجھے بوجھ میں آئے　　بے سمجھے سمجھے سمجھائے
او بن جانے جان کے اندر　　پہچانے پہچان کے اندر
برووں کے جل دینے والے　　پھولوں کے پھل دینے والے
کانٹوں سے تو پھول نکالے　　پھولوں میں تو کانٹے ڈالے
او کانھا گوکل والوں کے　　پوچھن ہار بُرے حالوں کے
او بن باپ کے او بن ماں کے　　مالک دل کے مالک جاں کے
تیرا کوئی نہیں تو سب کا　　سب تیرے تو سب کے ڈھب کا
او بیگُن کی ناؤ کھویّا　　او بیڑے کے پار لگیّا
او دُکھ کن ہارے بپتا کے　　او ردکن ہارے بپتا کے
او پوچھویّا ہم جیسن کے　　او جگویّا رات اور دن کے
تو دانا ہے اور ہے بینا　　تیرے ہاتھ ہے مرنا جینا
جل جانے والا پہلو ہوں　　ڈھل جانے والا آنسو ہوں
گھر ہوں لیکن کچھ اُجڑا سا　　کام ہوں لیکن کچھ بگڑا سا
پھول ہوں لیکن رنگ نہیں ہے　　نرگس ہوں کچھ ڈھنگ نہیں ہے
او فریاد کے سُننے والے　　کانٹے دل سے چُننے والے
او عاشق طیبا والے کے　　او شیدا دیکھے بھالے کے
صدقہ اُسکی زیبائی کا　　صدقہ اس کی رعنائی کا
اس تیرب والے کا صدقہ　　پیاری چھب والے کا صدقہ
صدقہ اس کے نام کا صدقہ　　اُس کے دین اسلام کا صدقہ
صدقہ اُسکی لاج کا صدقہ　　اس شاہ معراج کا صدقہ
فاطمۂ زہرا کا صدقہ　　اُس کے نقش پا کا صدقہ
ان کی تشنہ لبی کا صدقہ　　اس آل عربی کا صدقہ

او بے پروا پروا والے　　سب بے پر ہیں بازو والے
چاہے جس جنجال میں رکھے　　مالک ہے جس حال میں رکھے
او بوجھے جانے ان جانے　　دیکھے بھالے بن پہچانے
او سمجھے سمجھائے سب کچھ　　او سیکھے سکھلائے سب کچھ
او مالی گلزار جہاں کے　　او گلچیں صحن بستاں کے
دینے والے پھل پھولوں کو　　دینے والے جل پھولوں کو
سوکھی شاخ میں کونپل پھوڑے　　گیلی ڈال کے پتے توڑے
او والی ہم بے والوں کے　　اور راجہ سگری گوالن کے
بے کھٹکے مرنے جینے سے　　بے پروا کھانے پینے سے
تو سب کے ڈھب کا سب تیرے　　سب تجکو دن رات ہیں گھیرے
او منجدھار میں روکن ہارے　　او بپتا کے ٹوکن ہارے
او بیون کے بانہہ گہیّا　　او دکھین کے دُکھ پوچھیّا
میرا حال ہے تجھ پر روشن　　ہر جنجال ہے تجھ پر روشن
آنسو ہوں ڈھل جانے والا　　پہلو ہوں جل جانے والا
دن ہوں لیکن رات سے بدتر　　موسم ہوں برسات سے بدتر
محل ہوں لیلا سے خالی　　اپنی بات نہ ہونے والی
مال وہ ہوں جو کام نہ آئے　　دل جس کو آرام نہ آئے
او سجدہ کروانے والے　　او اللہ فرمانے والے
کون وہی محبوب اکرم　　صلے اللہ علیہ وسلم
صدقہ اُس کملی والے کا　　صدقہ اُس جنگل والے کا
صدقہ اُس صورت والے کا　　صدقہ اُس قامت والے کا
اُس کے حسن پاک کا صدقہ　　اس کے در کی خاک کا صدقہ
صدقہ اسکی چال کا صدقہ　　صدقہ اُس کی آل کا صدقہ
صدقہ اور حسنین کا صدقہ　　صدقہ اور سبطین کا صدقہ
ان سب کے صدقوں کا صدقہ　　اپنے کل بندوں کا صدقہ

آس مرے دل کی پوری کر　　دور یہ مرحلۂ دوری کر
تیرا ہوں تو اپنا کر لے　　اپنے پاس بُلا کر دھر لے
تو باقی، باقی سب فانی　　کب ٹھہرا ہے بہتا پانی
جو ملیا مطلب کا گرجی　　مورے بھاگ تہاری مرجی
کیسی جورو کس کی جاتا　　سب سے سچا تیرا ناتا
او کرتار خدائی والے　　او ملیا ین بھائی والے
ملنے والے ہر ہر شے میں　　ہر ہر دُھن میں ہر ہر لے میں
کوئی نہیں ساتھی بگڑی کا　　سر سو ہے تورے پٹکا
کالے دفتر اعمالوں کے　　ڈھیر کے ڈھیر بُرے چالوں کے
چھوڑ چکے سب ناتے والے　　بیٹھے ہے نفرت گھر گھالے
او تصویر بنانے والے　　او تقدیر بنانے والے
کچھ غم اپنی ویرانی کا　　کچھ غم چاک گریبانی کا
عیش کا میرے گھر لوٹا ہے　　رنج بہت ہیں دل چھوٹا ہے
جس کو چاہا صدمے جھیلے　　خالی ہو لی پاپڑ بیلے
کچھ قدر سادات نہ جانی　　دھڑی کی اوقات نہ جانی
کوئی کسی کا ہوتا ہے کب　　دنیا ہے اور اپنا مطلب
او باقی رہ جانے والے　　او ساتھی رہ جانے والے
تیرا ملنا سب کا ملنا　　سب سے بہتر رب کا ملنا
تیری یاد میں سب کو بھولوں　　بارہ ماس برابر جھولوں
تورا دھیان ہو توری دھن ہو　　تورے گیان کا میکا گن ہو
بھٹکے بھی تو تیرے مارے　　مر جائے من میرے مارے
ٹاٹ کا ٹکڑا بستر ٹھیرے　　ہاتھ کے تکیے پر سر ٹھیرے
سارے تن پر راکھ ملی ہو　　اور ہی کچھ جیون بدلی ہو
آس پاس بیلی مالی ہو　　چھوٹی سی سیتل پالی ہو
جو مانگوں سو تو سے پاؤں　　او رکھوں مانگن نا جاؤں

اپنے پاس بُلا لے داتا　　چین نہیں فرقت میں آتا
دنیا میں کیا خاک دھرا ہے　　کوئی جیا ہے کوئی مرا ہے
کوئی نہیں دنیا میں میرا　　یا معبود سہارا تیرا
کیسے باپ کہاں کے بھیا　　کیسی بہنی، کس کی میّا
او میری سدھ لینے والے　　او بن مانگے دینے والے
او ہر پھول میں کھلنے والے　　او ہر رنگ میں ملنے والے
ہر ہر تار کے اندر تو ہے　　کل سنسار کے اندر تو ہے
بخشش کی کچھ آس نہیں ہے　　اچھی پونجی پاس نہیں ہے
لچھن کوئی نیک نہیں ہے　　پلّے نیکی ایک نہیں ہے
یار خفا ہے دشمن ٹیڑھا　　ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا
ایک مجھے سو دکھ میں گھیرے　　اس کے اُس کے تھپڑے پھیرے
کچھ غم گھر کی بربادی کا　　کچھ غم اپنی ناشادی کا
قسمت والا بد قسمت ہوں　　بد قسمت کی بگڑی مت ہوں
معشوقوں سے چین نہ پایا　　جز حسرت کچھ ہاتھ نہ آیا
ملنا چھوڑا بیٹھ رہے گھر　　پاس رہے پردیس برابر
کوئی نہیں روتے کا ساتھی　　جو ہے وہ ہونے کا ساتھی
پیاسا ہوں پانی پلوا دے　　تو ملیا سب کو ملوا دے
مل جا اور ملا دے یا رب　　بگڑا کام بنا دے یا رب
اپنوں کو بیگانہ جانوں　　غیروں کو دیوانہ جانوں
کوئی پاس نہ پھٹکے داتا　　من بے ٹھور نہ بھٹکے داتا
ایک جگہ رہنا سہنا ہو　　اچھے بھاگ بھلا لہنا ہو
من ہو اور استھان گرو کا　　دونوں آنکھیں لال بھبو کا
کمبل میں خوشحال رہوں میں　　ہر دم لالوں لال رہوں میں
رین دنا تو دی آسا ہو　　تورا ہاتھ مورا کاسا ہو
او سگری مایا کے مالک　　او سگری کایا کے مالک

او مالک سگری کایا کے　او مالک سگری مایا کے　کایا کے مایا کے مالک　مایا کے کایا کے مالک
او مایا کایا کے مالک　او کایا مایا کے مالک　یا کے مالک وا کے مالک　جا کے مالک تا کے مالک
بے مایا ہوں مایا دیدے　دھوپ کے بدلے سایا دیدے　سایا دیدے دھوپ کے بدلے　روپ دکھا بہروپ کے بدلے
موت اب آئی کوئی دم میں　ہوں دن رات اسی کے غم میں　اک دن میری جان ہے جانی　پھر کس برتے تتا پانی
او مضطر کے سُننے والے　او دُکھڑی کے بننے والے　او مضطر کے پیارے مالک　جگ بھر کے اُجیارے مالک
پیارے مالک دنیا بھر کے　او پیارے مالک مضطر کے　او مضطر کے پوچھن ہارے　او مضطر کے داتا پیارے
او داتا پیارے مضطر کے　او پوچھن ہارے مضطر کے　او دُکھیا مضطر کے وارث　او دُکھیا مضطر کے وارث
او وارث دُکھیا مضطر کے　او وارث دُکھیا مضطر کے　او اپنے بندوں کے آقا　او حاجتمندوں کے آقا
او آقا حاجتمندوں کے　او آقا اپنے بندوں کے　او مضطر کے سچے آقا　تو یکتا سب جھوٹے آقا
او سب کے اَن دینے والے　آپ دھنی دھن دینے والے　او رزاق بھلے چنگوں کے　سائیں اپنے بھک منگوں کے

ناظرین زمانہ میں سے کسی کے پاس یہ نظم ہو تو باقی شعر پورے کر دیں کہ یادگار مکمل ہو جائے۔

دریا اور مَیں

(از حضرت جگر بریلوی، بی۔ اے)

اُف صبح جوانی شام ہوئی منزل کی تمنا اب کب تک　بیزار ہوں میں بیزار بہت بیزار ہی مجھکو رہنے دے
راحت کی اُمیدیں ختم ہوئیں ساحل کی تمنا اب کب تک　موجیں ہی اگر تقدیر میں ہیں موجوں کے تھپیڑے سہنے دے
اے دل دریا کے تلاطم میں اب بہنے دے ہاں بہنے دے

جب کشتی پر کچھ بس ہی نہ ہو کشتی کا ڈوبنا ہی اچھا　موجیں ہی قدرت والی ہیں موجوں کا سہارا لینے دے
جب جی ہر سانس پہ جاتا ہو تو جی کا کھونا ہی اچھا　طوفان ہی گر تقدیر میں ہے طوفان ہی میں سر دینے دے
اے دل دریا کے تلاطم میں اب بہنے دے ہاں بہنے دے

کہنے کو آزاد ہوں میں اور ظاہر میں مختار ہوں میں　گردن میں کوئی طوق نہیں اور پاؤں میں بھی زنجیر نہیں
رگ رگ میں ہے جس کی دام نہاں وہ صید زبوں ناچار ہوں میں　مجبوری ہے مجبوری ہے چلتی کوئی تدبیر نہیں
اے دل دریا کے تلاطم میں اب بہنے دے ہاں بہنے دے

مآلِ تہذیب

(از حضرت اسد ملتانی)

چشمِ عبرت سے بلا انگیزیِ ایّام دیکھ — بزمِ ہستی میں بپا اِک حشرِ بے ہنگام دیکھ
ہو رہا ہے بحر و بر میں ہر طرف ظاہر فساد — امن سوزی کے لیئے فتنوں کو بے آرام دیکھ
خود زمیں سے ہے عذابِ آسمانی کا ظہور — بم بم سے بام و در کو لرزہ بر اندام دیکھ
ترکتازی کے عوض اب برق تازی پر ہے ناز — عصرِ حاضر کی نئی شمشیرِ خوں آشام دیکھ
توپ ہے طیّارہ ہے غوّاصہ[1] ہے دبّابہ[2] ہے — اِن ہلاکت خیز ایجادوں کا فیضِ عام دیکھ
بن گئی ہے شامتِ اعمال اِک طوفانِ قہر — غرقِ خونِ آدمیت کشتیٔ اقوام دیکھ
کارفرما ہے جو قانونِ مکافاتِ عمل — صید کو آزاد، صیّادوں کو زیرِ دام دیکھ
برق گرتی تھی جو کل کاشانۂ درویش پر — اُس کی زد میں آج امیروں کے بھی قصر و بام دیکھ
دیدنی ہے بادۂ باطل کی تیزی کا اثر — میکدے میں خود بخود ٹکرا رہے ہیں جام دیکھ
جن کی جرأت کر نہیں سکتا ضمیر افراد کا — مِلّتوں میں اُن جرائم کا فروغِ عام دیکھ
ظلم و عصیاں میں بھی استعمال کرتے ہیں اُسے — ہو گیا ہے کس قدر ارزاں خدا کا نام دیکھ
یہ بھی ہے ناپائدار اور وہ بھی ہے بے اعتبار — دوستی اور دشمنی میں شیوۂ اقوام دیکھ
پھر زمانے میں ہوائے نفس کی بنیاد پر — اِک نئی دنیا بنانے کا خیالِ خام دیکھ
تجرباتِ زندگی کے شعلہ ہائے تُند سے — دُودِ پیچاں کی طرح اُڑتے ہوئے اوہام دیکھ
کس طرح مجبور ہو کر جھک رہی ہیں گردنیں — آستانِ کبریا پر سجدۂ اصنام دیکھ
باوجودِ حکمت و قوتِ قیامِ امن میں — عقلِ انسانی رہی ہے کس قدر ناکام دیکھ

جس نے لادینی پہ رکھی تھی اساسِ زندگی
اپنی آنکھوں سے اب اِس تہذیب کا انجام دیکھ

---

[1] آبدوز کشتی ۱۲ [2] ٹینک یا فولادی گاڑی ۱۲

کلامِ مجذوب

(از خواجہ عزیز الحسن غوری بی۔ اے)

(۱)

جذبِ دل بھی آرزوئے دل عجب مشکل میں ہے — ہائے ہائے یہ دل سے نکلی پھر بھی دل کی دل میں ہے
سب کا منظورِ نظر ہے جاگزیں ہر دل میں ہے — عشق بھی مجذوب کا اب حسن کی منزل میں ہے
آج تو ہر وار پر اک تازہ دم بسمل میں ہے — دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
پار لگ کر بھی ہنوز اے ناخدا ڈر دل میں ہے — دیر سے ساحل پہ ہوں اور اب بھی تنگیِ ساحل میں ہے
کیا کروں یارب کدھر جاؤں کشاکش دل میں ہے — اک کشش گرداب میں ہے اک کشش ساحل میں ہے
ہو بہو منظر نظر میں ہے تصور دل میں ہے — گو نہیں ہے پھر بھی مجذوب آپ کی محفل میں ہے

(۲)

اک مسلسل کیفِ ذوق و شوقِ منزل دل میں ہے — خیر یہ مقصد تو حاصل سعیِ لاحاصل میں ہے
یوں تو ہے اکثر دلوں میں آمد و رفت آپ کی — دیکھنا لیکن جو ہے وہ یہ کہ گھر کس دل میں ہے
ایک سے ہے ایک بڑھکر گو تمنا دل فریب — کیا تمنا اب ہو جانِ ہر تمنا دل میں ہے
قطرتاً جاذب ہے برقِ حسن برقِ عشق کا — یہ جو میری آنکھ میں تل ہے سویدا دل میں ہے
غیر اور مجذوب کی بابت میں کر دوں فیصلہ — فرق بس اتنا ہی ہے جو زبان و دل میں ہے
کوئی مطرب رات دن پردے میں ہے مضراب زن — راز میری نغمگی کا اضطرابِ دل میں ہے
رقص میں تیغِ ادا ہے وجد میں تیرِ قضا — آج کس بسمل کی آمد کوچۂ قاتل میں ہے
وہ نہیں آتے نہ آئیں تابکے اب انتظار — آج کر ڈالیں گے ہم بھی جو ہمارے دل میں ہے

بس ارے بس روک اپنے جذب کو مجذوب روک
عشق بھی ہے کشمکش میں حسن بھی مشکل میں ہے

تنقید کتب

روحِ غالب[1]

جتنی شرحیں کلام غالب اور جتنی سوانحعمریاں مرزا موصوف کی لکھی جاچکی ہیں اتنی کسی اور اُردو شاعر اور ادیب کی نہیں لکھی گئیں، اور ابھی ان کا سلسلہ جاری ہے۔ سب سے پہلے خواجہ الطاف حسین حالی نے "یادگارِ غالب" لکھکر مرزا غالب کی خوبصورت تصویر پبلک کے سامنے پیش کی اور حق شاگردی ادا کردیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنا مشہور مقدمہ لکھکر مرزا غالب کو نہ معلوم کہاں سے کہاں پہونچادیا۔ پھر تو دیوان غالب کے مختلف اڈیشنوں، دیوان کی شرحوں اور سوانحعمریوں کا تانتا لگ گیا۔ مولانا حالی کی یادگار غالب اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمہ کے علاوہ اس وقت تک غالب کی شرحیں اور سوانحعمریاں ایک درجن سے زیادہ منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ حال میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے "روحِ غالب" کے نام سے مرزا کے سوانح حیات لکھے ہیں اور تحقیق واقعات کی داد دی ہے۔ "روحِ غالب" میں ڈاکٹر صاحب نے ان کتابوں اور ان شرحوں کی بھی تفصیل دی ہے جو مرزا غالب اور اُن کے دیوان پر اب تک لکھی جاچکی ہیں۔ اس کے بعد غالب کے مستند واقعاتِ زندگی مختصراً درج کئے ہیں، اور اسی کے ساتھ مرزا کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایک علحدہ باب میں غالب کے ادبی کارنامے بیان کئے ہیں جس میں اُردو فارسی اور نظم و نثر دونوں قسم کی تصانیف آگئی ہیں۔ اس کے بعد غالب کے شاگردوں کا مختصر حال ہے۔ آخری باب میں جو سب سے اہم ہے غالب کے خطوط درج ہیں جو بجائے خود ایک شاندار لٹریچر ہے۔

زورؔ صاحب کے قلم میں زور ہے، اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے مختصر مگر تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ شروع میں مرزا غالب کی پُرانی تصویر اور خود ڈاکٹر زورؔ کا فوٹو بھی شامل ہیں۔

منتخبِ داغ[2]

جناب احسن مارہروی مرحوم نے اپنے اُستاد حضرت داغؔ کے کلام کا ایک گراں قدر انتخاب مرتب کیا تھا جس میں اُن کے تمام دیوانوں کا نچوڑ ردیف وار لے لیا گیا ہے۔ اس انتخاب کی خصوصیت یہ ہے کہ ایسے تمام شعر نظرانداز کردئیے ہیں جن میں فارسی عطف یا اضافت سے کام لیا گیا ہے، یعنی ٹھیٹ روزمرہ کے شعر چُن لئے گئے ہیں۔ اس

---

[1] لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ ضخامت پونے دوسو صفحات قیمت ڈھائی روپیہ ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیات اُردو۔ رفعت منزل خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

[2] ضخامت بڑی تقطیع کے ۷۷ صفحات قیمت مجلد پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ مطبع انوار احمدی الہ آباد

انتخاب کو مطبع انوار احمدی کے اولوالعزم مالک سید جلال الدین احمد جعفری نے عمدہ لکھائی چھپائی کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ شروع میں جناب احسن کے فرزند رشید سعید صاحب نے اپنے والدگرامی کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔

کلام داغ کا کیا کہنا، وہ فصیح اردو کے بادشاہ تھے اور اُن کا یہ دعویٰ بالکل صحیح تھا:۔

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ　　سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

یہ کتاب مطالعہ کرنے اور لائبریریوں میں رکھنے کے قابل ہے۔ شروع میں مرزا داغ اور احسن مرحوم کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ ہم اس کی طباعت اور اشاعت پر مولوی جلال الدین احمد صاحب مالک مطبع انوار احمدی کو مبارکباد دیتے ہیں۔

ادب اور زندگی[۱]

اس کتاب میں مشہور نقاد سخن مجنوں گورکھپوری کے سات قابل قدر تنقیدی مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں جن میں ادبی اُصولوں پر بحثوں کے علاوہ ہندوستانی ناٹک، نظیر اکبرآبادی اور مولانا حالی کی عملی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجنوں صاحب اُردو کے ترقی پسند ادیبوں میں ہیں اور آپکی کئی کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ اس مجموعہ کے مضامین بھی بہت قابل قدر اور غور طلب ہیں۔ لائق مصنف کی بعض رایوں کے متعلق اختلاف کی گنجایش ہو سکتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کافی غور و فکر کے بعد اظہار خیال کرتے ہیں۔ یہ مضامین چھوٹی تقطیع کے ۱۳۶ صفحات پر شائع ہوئے ہیں۔

جوہر عبدالحق نمبر[۲]

جامعہ ملیہ دہلی کے طلبا کی طرف سے مولانا محمد علی مرحوم کی یادگار میں "جوہر" نامی ایک رسالہ شائع ہوتا ہے اس رسالہ کا ایک خاص نمبر ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو کی ادبی خدمات کی قدردانی میں "عبدالحق نمبر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی صاحب اُردو کے سچے بہی خواہ اور محسن ہیں۔ اس خاص نمبر کے ۳ حصے مضامین میں مولانا موصوف کے واقعات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رسالہ کے دوسرے مضامین بھی مثلاً سودا کی شاعری، شیخ ناسخ اور اصلاح زبان، چکبست وغیرہ وغیرہ قابل دید ہیں۔

نئی کتاب

جامعہ ملیہ دہلی آئے دن بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں نئی نئی کتابیں شائع کر کے اُردو کی گراں قدر

---

[۱] قیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ایوان اشاعت گورکھپور۔

[۲] لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ جلد انگریزی، بڑی تقطیع کے ۲۰۲ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی

رمات انجام دے رہی ہے۔ ان کتابوں میں بہت آسان زبان میں مفید باتیں درج رہتی ہیں۔ اردو
حروف شناسی کے متعلق بھی جامعہ کی طرف سے کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں "نئی کتاب" "مدرس
کا قاعدہ نما" "آسان قاعدہ" اور "بچوں کا قاعدہ" قابل ذکر ہیں۔ جن میں حروف کی آواز تصویروں کے
ذریعہ سے سمجھانے کا طریقہ استعمال کیا گیا ہے جس سے بچے خود بخود حرف شناس ہوکر سبق نکالنے اور
پڑھنے لگتے ہیں۔

"مدرس کا قاعدہ نما" میں صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب وزیر تعلیم بھوپال نے ٹیچروں کو بہت
عمدگی سے بتایا ہے کہ وہ بچوں کو تعلیم دینے میں کون سے ڈھنگ اختیار کریں۔ کتابوں کی قیمت بھی بہت
مناسب رکھی گئی ہیں۔ مدرس کا قاعدہ نما کی قیمت ۲ر، بچوں کا قاعدہ ۴ر، نئی کتاب ۲ر، آسان قاعدہ ۴ر
سب کتابیں مکتبہ جامعہ دہلی، لاہور، لکھنؤ سے ملتی ہیں۔

دانہ و دام

یہ کتاب پنجاب کے مشہور اور کامیاب افسانہ نگار مسٹر راجندر سنگھ بیدی کے چودہ منتخب اور دلچسپ
افسانوں کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے۔ بیدی صاحب ان معدودے چند حضرات میں سے ہیں جنھوں نے نفسیات
انسانی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ آپ کا اسلوب بیان دلکش اور زبان بہت صاف اور سلیس ہوتی ہے۔
افسانوں کے پلاٹ میں عموماً "ریلزم Realism" یعنی حقیقت کی پرستاری کا اظہار ہوتا ہے۔ عبارت میں کہیں
کہیں حکیمانہ و فلسفیانہ جملے خوبصورت نگینوں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں، اور کہیں کہیں ایسی خوبصورت منظر کشی کرتے
ہیں کہ زبان سے بیساختہ واہ واہ نکل جاتی ہے۔ مثلاً اس کتاب کے دسویں افسانہ میں جس کا عنوان ہے
"دس منٹ بارش میں" ایک سڑک کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"ابو بکر روڈ شام کے اندھیرے میں گم ہو رہی ہے، یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی کشادہ سا راستہ ایک
کوئلے کی کان میں جا رہا ہے۔"

جہاں تک فن کا تعلق ہے، ان افسانوں پر ایک سرسری نظر ہی ڈال کر ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ بیدی
صاحب منشی پریم چند مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیاب ہوتے ہیں۔ کتاب کے
شروع میں مسٹر ہنسراج ایڈیٹر لاہور کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔

لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ چھوٹی تقطیع کے ۲۰۳ صفحات ضخامت قیمت سوا روپیہ۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ اردو ۱۵۷ سرکلر روڈ۔ لاہور۔

رفتارِ زمانہ

روس و جرمنی | ہٹلر کو روس پر حملہ کئے تقریباً ۳ ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس عرصہ میں دو ہزار میل لمبے محاذ پر جو کچھ کشت و خون ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ طرفین کی افواج دنیا کی بہترین مسلح افواج ہیں۔ روس کا کثیر حصہ جرمنوں کے قبضہ میں آچکا ہے اور طرفین کے نقصان جان و مال کا اندازہ کرتے ہوئے ہم لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔ روسیوں نے جو زمین چھوڑی اُسے پہلے نذرِ آتش کر دیا اور اسی پالیسی پر عملدرآمد جاری رکھا۔ جنگ روس کے دوسرے ماہ تک لڑائی مختلف محاذوں پر شروع ہو گئی یعنی شمال میں لینن گراڈ میں، وسط میں اسمولنسک کے شمال مشرق اور جنوب مشرق میں، یوکرین میں دریائے نیپر (River Dneiper) کے کنارے شمال میں کیف میں اور جنوب میں اڈیسہ میں۔ ماہ گذشتہ کے آخر سے اب تک نازی اور روسی فوجیں ایک دوسرے پر قیامت ڈھا رہی ہیں۔ اڈیسہ کی بندرگاہ کو جرمنی، رومانیہ اور ہنگری کی فوجوں نے گھیر لیا ہے لیکن ابھی تک بہادری سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ لینن گراڈ پر بمباری کا سلسلہ جاری ہے اور جرمنوں کا دعویٰ ہے کہ شہر پر قبضہ کر لینا چند روز کا معاملہ ہے۔ وسطی حصہ میں روسی فوجوں نے نو جرمن ڈویژن تباہ کر کے یلینا پر جو اسمولنسک سے پچاس میل جنوب مشرق پر واقع ہے پھر قبضہ حاصل کر لیا ہے اور مزید پیش قدمی جاری ہے۔ روسیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسمولنسک کے پھاٹک تک پہونچ گئے ہیں۔ یوکرین میں روسی فوجیں جانبازی سے مقابلہ کر رہی ہیں مگر تازہ خبریں مظہر ہیں کہ روسی پست ہو رہے ہیں۔ کیف پر جرمنوں نے پچاس ڈویژن فوج ڈال کر قبضہ حاصل کر لیا گو کہ جرمنوں کے دس ڈویژن تباہ ہو گئے جرمن فوجیں اب خارکف کی طرف جو ایک انڈسٹریل مرکز ہے بڑھ رہی ہیں دریائے نیپر کو بھی جرمنوں نے کئی جگہ پار کر لیا ہے اور بڑھتے بڑھتے نازی فوجیں ایک سمت عاکنائے پیریکوپ تک پہونچ چکی ہیں اور دوسری طرف وادی دریائے ڈان میں بڑھ رہی ہیں۔ اس کے بعد ہٹلر کاکیشیا کی طرف رُخ کریگا۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بحر اسود پر اقتدار حاصل کر لینا ضروری ہے۔ کریمیا اور بلغاریہ کے بندرگاہوں پر قابو حاصل کر لینے کی کارروائی اسی سلسلہ میں نیا اقدام ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جرمنی دردانیال اور باسفورس پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کریگا بیان کیا جاتا ہے کہ جرمنی نے ٹرکی کو الٹی میٹم دیدیا تھا کہ وہ آبناؤں کا کنٹرول جرمنی کو دیدے لیکن ٹرکی نے انکار کر دیا ہے اب جرمنی بلغاریہ کو ترغیب دے رہا ہے کہ وہ ترکی تھریس پر حملہ کر دے اور وعدہ کیا ہے کہ کل تھریس بمع استنبول بلغاریہ کو دیدیا جائیگا۔ تازہ ترین خبر مظہر ہے کہ ہٹلر اس وقت اپنی فوجیں بلغاریہ میں جمع کر رہا ہے، ٹرکی پر حملہ کرنے کے لئے یا روس پر، ہو سکتا ہے کہ دونوں پر، اس نے سمجھ لیا ہے کہ سردیوں تک جنگ ختم نہیں ہو سکتی اس لئے

اس کی کوشش ہے کہ دسمبر سے پہلے پہلے روس پر ایسی ضرب کاری لگائے کہ اگلے سال جنگ کے لئے روس کے پاس کافی سامان جنگ نہ ہو۔ جرمنی اس وقت تک روس کی فوجی طاقت پر بھی بھاری ضرب لگا چکا ہے۔ کیف کے بعد صنعتی یوکرین کا مرکز خارکوف ہے اور سب سے بڑھکر کوہ قاف کا تیل کا علاقہ ہے، شمال میں ماسکو اور لینن گراڈ ہیں۔ ان صنعتی شہروں کے ہاتھ سے نکل جانے سے روس کو بھاری نقصان ہوگا۔ ہٹلر بہرحال چاہے اسے کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے سردیوں سے پہلے پہلے روس کے اقتصادی اور سیاسی مرکزوں پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے۔ لینن گراڈ لے لینے کے بعد نازیوں کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ ماسکو پر چڑھائی کر دیں۔

ایران ہٹلر مدت مدید سے مشرق وسطی کے خواب دیکھ رہا ہے کچھ تو وہاں کے تیل کے چشموں کے باعث اور کچھ اس کی اہم پوزیشن کی وجہ سے، جو نہر سویز اور کاکیشیا پر عقب سے عمل کے لئے موزوں ہے اور ہندوستان کی طرف بڑھنے کا بھی وہ بہترین میدان ہے۔ مشرق وسطی میں ہٹلر کا اقدام شام کے ہوائی اڈوں پر قبضہ جما لینے سے شروع ہوا۔ اس کے بعد عراق میں رشید علی سے سازباز کر کے ہٹلر نے بغاوت شروع کرا دی مگر برطانوی فوجوں نے آناً فاناً کارروائی کر کے جرمن منصوبے خاک میں ملا دیئے فوراً بعد ہی شام پر بھی برطانوی فوجوں نے فرانسیسی جنرل ڈی گال کی رفاقت میں حملہ کر دیا اور اس طرح شام پر بھی برطانیہ کا اقتدار قائم ہو گیا اور بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل سے نازی خطرہ ناپید ہو گیا۔ ہٹلر کے پانچویں کالم کا ایک اور مضبوط اڈا ایران تھا جہاں کا صنعتی نظام جرمن ماہروں کے ہاتھ میں تھا ۱۹۴۱ء کے موسم سرما میں بے شمار پانچویں کالمی جرمن سیاح بن کر ایران میں داخل ہو گئے۔ جرمنی کے روس پر حملہ کے بعد جرمنوں کا اتنی تعداد میں ایران میں ہونا اور صنعتی نظام پر قابو پائے رہنا خطرناک معلوم ہونے لگا، چنانچہ برطانیہ نے ایران سے اس معاملہ میں شکایت کی، مگر ایران کا جواب ٹال مٹول کا سا تھا اور اس ضمن میں اس کی کارروائی سست اور رکی تھمی سی رہی، چنانچہ برطانیہ نے برفاقت روس ایران پر ۲۵۔ اگست کو حملہ کر دیا۔ روسی فوجیں جنوب کی طرف کاکیشیا سے بڑھیں اور برطانوی فوجوں نے ہندوستان سے جنرل سر آرچی بولڈ کے کمان میں خلیج فارس کے ساحل پر اتر کر تیل والے رقبے کی طرف رخ کیا۔ ایران کی فوج اتنی قلیل تھی کہ معمولی مقابلہ کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ برطانوی اور روسی فوجیں اہم مقامات پر قبضہ حاصل کرتی چلی گئیں اور پھر صلح کی شرائط منظور کر لیں جو درج ذیل ہیں:-

(۱) جرمن۔ اطالوی، اور ہنگری اور رومانیہ کے لیگیشن (Legation) بند کر دیئے جائیں اور جرمنوں کو برطانوی اور روسی فوجوں کے حوالے کر دیا جائے۔

(۲) چند مخصوص رقبوں سے ایرانی فوجوں کا ہٹا لینا۔

ایرانی عوام جو سولہ ۱۶ برس سے زائد عرصہ سے شاہ ایران کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے اس بیکار خونریزی سے جو خواہ مخواہ شاہ ایران کے جرمنی کی حمایت کی پالیسی سے ہوئی برانگیختہ ہو گئے۔ بالآخر برطانیہ نے شاہ ایران کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے لڑکے ولیعہد کے حق میں سلطنت سے دست بردار ہو جائیں چنانچہ وہ دست بردار ہو چکے ہیں اور اب ایران کا بادشاہ

ان کا لڑکا ولیعہد ہے۔

اطلانتک کے لئے جنگ جب سے امریکہ نے برطانیہ کو Lease & Lend Act کے رو سے سامان جنگ مہیا کرنے کا ذمہ لے لیا ہے اور سامان جنگ برطانیہ تک پہونچا دینے کی بھی ضمانت کردی ہے اس وقت سے بحر اطلانتک بھی ہٹلر کے لئے سیاسی سازشوں کا مرکز بن گیا ہے۔ اب اگر ہٹلر یہ برداشت کرے کہ امریکہ کے جہاز سامان جنگ برطانیہ لے جائیں تو گویا وہ اپنی موت کے حکمنامہ پر رضامندی کے دستخط ثبت کرتا ہے۔ اور اگر ان جہازوں پر حملہ کرتا ہے تو امریکہ کو جنگ کی دعوت دیتا ہے۔ بہرحال اُس نے مؤخر الذکر رویہ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو پہلی کارروائی اس نے کی وہ امریکہ کے تباہ کن جہاز Greer پر حملہ تھا جو اُس نے آئس لینڈ کے پایۂ تخت Reqk Javik سے دو سو بیس میل جنوب میں کیا۔ طارپیڈو چوک گیا لیکن اس واقعہ کے بعد جرمنی نے امریکہ کے جہاز Steel sea Farer کو بحرۂ قلزم میں غرق کردیا اور Sessa اور Pink Star کو جب وہ آئس لینڈ جا رہے تھے ڈبو دیا۔ امریکہ نے بھی اپنے جہازوں کو ہدایت کردی ہے کہ وہ امریکہ اور آئس لینڈ کے درمیان نازی آبدوز کشتیوں کو جو انھیں ملیں تباہ کردیں امریکہ کے اس رویہ سے برطانیہ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی ہے۔ اس موسم سرما کے آغاز سے لیکر جون ۱۹۴۲ء تک امریکہ کی طرف سے انگلستان کو دو کروڑ بیس لاکھ ٹن دودھ، آٹھ ہزار ٹن گوشت اور پچاس کروڑ انڈے بھیجے جائیں گے۔ تمام ممالک نے اتحادی کونسل کے دوسرے اجلاس میں اطلانتک چارٹر کی تائید کردی۔ چیکوسلواکیہ کے نمائندہ نے یہ کہا ہے کہ چیکوسلواکیہ اور پولینڈ کی یہ خواہش ہے کہ کوئی ایسا بند و بست کرنا چاہیئے کہ جرمنی کی طرف سے تیسری جنگ کا آغاز نہ ہو سکے۔ اور ایسے ذرائع استعمال کرنا چاہیئے کہ جرمنی کی آئندہ تباہ کاریوں کا سدباب ہو جائے۔

مشرق بعید جب سے جاپان نے جنوبی انڈو چائنا پر قبضہ جما لیا ہے اس وقت سے جاپانی پریس یہ کہہ رہا ہے کہ برطانیہ کے منصوبے تھائی لینڈ پر ہیں۔ مگر کوئی کامیابی اس سلسلہ میں نہ ہوسکی، کیونکہ ان معاملات میں اس کا خفیہ رفیق ایسا ماہر نہیں تھا تھائی لینڈ نے فوراً اس اتہام کی تردید کردی جو برطانیہ پر لگایا جاتا تھا۔ برطانیہ اور امریکہ نے بھی واضح طور پر کہہ دیا کہ وہ جاپان کی نقل و حرکت جنوب کی طرف گوارا نہ کریں گے بشرطیکہ ایسا عمل ان کی رضامندی حاصل کرکے کیا جائے۔ چنانچہ برطانیہ نے پوری احتیاط برتی اور سنگاپور کے بحری اڈّے کو خوب مضبوط کرلیا۔ جاپان نے پھر مُنھ کی کھائی کیونکہ امریکہ نے اس کے اعتراض پر کہ وہ روس کو سامان جنگ ولاڈی واسٹک کے راستے سے نہ بھیجے دندان شکن جواب دیا کہ وہ بحری آزادی کے اُصول کے خلاف کوئی اعتراض نہیں سُن سکتا۔ جاپان کے سفیر نے ایڈمیرل نومورا نے پریسیڈنٹ روزویلٹ کے نام پیغام دیا اس کا مضمون کیا تھا شائع نہیں ہوا مگر یہ پتہ چلا کہ جاپان نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ پرامن طریق پر گفت و شنید ہو جائے اور بحر الکاہل کے معاملہ کو سلجھا لیا جائے۔ جاپان کی شرط صرف یہ تھی کہ وہ چین کے معاملہ میں کوئی مداخلت پسند نہیں کرسکتا۔ شروع میں تو جاپانی پریس بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا تھا کہ اگر گفت و شنید کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو جاپان

فوری عمل پر مجبور ہو جائے گا۔ اور برطانیہ، امریکہ، چین اور ڈچ ایسٹ انڈیز سے جھگڑا ہو جائے گا۔ مگر ان ہٹلرانہ دھمکیوں کا امریکہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب تک جو خبریں واشنگٹن سے آ رہی ہیں وہ اس بات کی پُرزور تردید کر رہی ہیں کہ مشرق بعید میں میونخ والی داستان نہ دُہرائی جائے گی جس سے چین کو ذبح ہو جانے دیا جائے۔ امریکہ اس بات پر اڑا رہے گا کہ وہ چین اور روس کو سامان جنگ مہیا کرتا رہے اور بحری آزادی کو قائم رکھے۔ کامیابی کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ جاپان اپنے دل کی صفائی کے ثبوت میں پہلے اپنے تعلقات جرمنی سے منقطع کرلے۔ مشرق بعید میں حالت بہت نازک ہے، معلوم نہیں کب جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھیں۔

ہندوستان

کچھ عرصہ سے ہندوستان کی سیاسیات میں جمود سا پیدا ہو گیا ہے، خصوصاً جب سے کانگریس پُرامن ستیہ گرہ پر عملدرآمد کی پالیسی پر قائم ہو گئی ہے۔ اس حالتِ جمود میں تھوڑی لہر اس وقت پیدا ہوئی جب وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں توسیع اور نیشنل ڈیفنس کونسل کے قائم کئے جانے کی بابت اعلان کیا گیا۔ توسیع کونسل گیارہ ممبروں پر مشتمل ہے جس میں آٹھ ہندوستانی ہیں۔ فائیننس، کمیونیکیشن اور ہوم تینوں پورٹ فولیو آئی سی ایس افسران کے پاس بدستور سابق ہیں۔ بقیہ پورٹ فولیو ہندوستانی ممبران میں تقسیم کئے گئے ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) اطلاعات:۔ سر اکبر حیدری، (۲) قانون:۔ سر سلطان احمد، (۳) سمندر پار ہندوستانی: مسٹر ایم۔ ایس اینے (۴) سول ڈیفنس:۔ ڈاکٹر ای۔ راگھویندر راؤ، (۵) سپلائی:۔ سر ہومی مودی، (۶) تعلیم: مسٹر نلنی رنجن سرکار (۷) لیبر:۔ سر فیروز خاں نون، (۸) کامرس:۔ سر راما سوامی مدلیر۔

ڈیفنس کونسل میں بائیس ممبر برٹش انڈیا سے اور سات نمایندے ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے ہونگے یہ سات نمایندے راجاؤں مہاراجاؤں میں سے ہوں گے۔ اس نئی اسکیم کے ساتھ مسلم لیگ کے چند ممبروں نے تعاون کیا ہے۔ سر سلطان احمد نے بحیثیت ممبر قانون پنجاب، بنگال اور آسام کے وزرائے اعظم، نواب چھتاری اور بیگم شاہنواز نے بحیثیت ممبران ڈیفنس کونسل۔ اس کارروائی نے مسٹر جناح کو برانگیختہ کر دیا اور اُنھوں نے وائسرائے کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا کہ اُنھوں نے بلا توسط مسلم لیگ کی کمیٹی کارکن کے مسلم لیگ کے ممبران کو کیوں ان کونسلوں میں شریک کر لیا۔ مسلم لیگ کی کمیٹی کارکن کا جلسہ ہوا جس میں مندرجہ بالا اصحاب پر عتاب ظاہر کیا گیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے ایک بیان شائع کیا جس میں یہ واضح کیا گیا کہ سر سکندر حیات خاں، مسٹر فضل الحق وغیرہ بحیثیت وزیر اعظم شریک کئے گئے ہیں۔ تینوں وزرائے اعظم نے اس کارروائی سے یہ محسوس کیا کہ اب اُن کی پوزیشن محفوظ ہو گئی مگر مسٹر جناح نے وائسرائے کا ایک خط پیش کر کے اس اعلان کی تردید کر دی۔ اس خط کا انھوں نے یہی مطلب نکالا

کہ تینوں وزراء اعظم کو مسلمانوں کے نمایندوں کی حیثیت سے شریک کیا گیا ہے۔ مسٹر جناح کی اس دلیل سے سر سکندر حیات خاں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور انھوں نے اپنے کو مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ کے رحم و کرم کے حوالے کر دیا۔ تینوں اصحاب کو تین دن کا موقع دیا گیا تاکہ وہ بعد غور ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ وزیر اعظم پنجاب اور وزیر اعظم آسام نے تو استعفےٰ دیدیا۔ نواب چھتاری مسلم لیگ کی کمیٹی عاملہ اور ڈیفنس کونسل دونوں سے مستعفی ہو گئے۔ مگر مسٹر فضل الحق نے پورے دس دن کے غور و تامل کے بعد ڈیفنس کونسل سے نیز مسلم لیگ سے استعفےٰ دیدیا۔ اور اعلان کر دیا کہ انھیں مسلم لیگ سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ جس نے صوبجاتی لیڈروں کے ساتھ ذرا بھی اخلاق نہ برتا۔ بنگال میں مسلم لیگ میں پھوٹ پڑ گئی ہے، کچھ لوگ مسٹر فضل الحق کے حق میں ہیں کچھ مسٹر جناح کے۔ طرفین میں خوب تُو تُو مَیں مَیں ہو رہی ہے۔ سر سلطان احمد اور بیگم شاہنواز نے ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہو جانے سے انکار کر دیا۔ سر سلطان احمد نے تو یہ کہا کہ وہ کونسل نے موسع حصہ میں شریک نہیں ہوئے بلکہ اس کے سابق وغیر موسع حصہ میں ہیں۔ بیگم شاہنواز نے یہ دلیل پیش کی کہ وہ مسلم لیگ کی نمایندگی نہیں کر رہی ہیں بلکہ کل نسوانی ہندوستان کی نمایندہ ہیں۔ دونوں کو پانچ سال کے لئے مسلم لیگ سے نکال دیا گیا ہے۔

مسٹر چرچل کے اس بیان سے جو انھوں نے دار العوام میں اطلانتک چارٹر کے متعلق ہندوستان کے سلسلہ میں دیدیا ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ ممدوح نے کہا کہ اس کا تعلق صرف یوروپین مملکتوں سے ہے جو کہ اس وقت نازیوں کے زیر حکومت ہیں۔ ہندوستان کے متعلق یہ کہا کہ ہندوستان نیز وہ ممالک جو برطانیہ کے زیر اطاعت ہیں ان پر ان فرمانوں کا اطلاق ہوگا جو وقتاً فوقتاً ان ممالک کیلئے عاید ہوتے رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ جب نظام عالم دم توڑ رہا ہے اس وقت بھی تنگ نظری بدستور قائم ہے۔ مدہوش

ذاتیات | پچھلے پرچہ میں ایڈیٹر صاحب کی علالت کا مختصراً ذکر ہو چکا ہے۔ افسوس ہے کہ اس میں راقم کی ناواقفیت سے چند جزوی غلطیاں ہو گئی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کو آنکھ کی جو شکایت ہو گئی تھی اس میں درد وغیرہ مطلق نہیں ہوتا تھا اسی وجہ سے دو ماہ تک اس کی اصلیت سے بے خبری رہی۔ میڈیکل کالج لکھنؤ میں تشخیص مرض ہونے کے بعد کلکتہ اور بمبئی کے نامور ماہران چشم سے مشورہ کیا گیا، دونوں جگہ آپریشن کی رائے دی گئی (کلکتہ میں امید افزا جواب نہ ہونے کے متعلق پچھلے نوٹ کی اطلاع بھی راقم کی غلط فہمی پر مبنی تھی) بہر حال بمبئی میں آپریشن کرانا طے ہوا اور جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ۱۲۔ اگست کو آپریشن ہوا اور ۲۰۔ اگست کو پٹی کھولی گئی۔ پانچ ہفتے مزید قیام کے بعد اب ایڈیٹر صاحب بمبئی سے واپس آ گئے ہیں مگر ابھی دو ڈیڑھ مہینے تک کامل آرام اور سخت احتیاط کی ہدایت ہے۔ اس اثنا میں ہم لوگ جس صورت سے ممکن ہوگا رسالہ کے کام کو چلائیں گے امید ہے کہ اس کے بعد خود ایڈیٹر صاحب اپنا پورا کام کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ (بیہوشن)

THE ZAMANA, OCTOBER 1941 REGD No. A 147

زمانہ

مرتبۂ:۔ دیا نراین نگم بی۔اے

جلد ۷۷	اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء	نمبر ۴

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ ...

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید بے مثل کتابیں

میدان عمل منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے اس میں ملک کی موجودہ بیدار و دلچسپ روح کی جیتی جاگتی تصویریں، فطری عشق و محبت کے سادہ و دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملینگے۔

بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے صفحات پانسو کتابت اعلیٰ کاغذ نفیس روشن طباعت خوبصورت اور مضبوط جلد دیدہ زیب ڈسٹ کور قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنہ ۲/۸

زاد راہ منشی پریم چند مرحوم کی ان کہانیوں کا مجموعہ جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھیں قیمت ایک روپیہ چار آنہ ۱/۴

دنیائے تبسم مشہور مزاحیہ نویس جناب شوکت تھانوی کے بہترین ظرافت پسند افسانوں کا مجموعہ قیمت ایک روپیہ چار آنہ ۱/۴

ملنے کا پتہ

زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور

چوپال

یہ کتاب مشہور نوجوان شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے چودہ دیہاتی افسانوں کا مجموعہ ہے حقیقی ہندوستان دیہات میں ہے اور دیہاتیوں کی زندگی کی طرف اب تک ہمارے ادیب اور شاعر پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے ہیں اس کتاب نے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے دیہات کے سادہ مناظر اور سادہ باشندوں کی جو تصویریں ندیم نے ان افسانوں میں پیش کی ہیں وہ اردو ادب میں ایک دلخوش کن بیداری کا پیش خیمہ ہیں۔ صحیح مشاہدہ صحیح احساس اور سلاست زبان ان کہانیوں کی جان ہیں سادہ لوح اور دیہاتی لڑکوں اور لڑکیوں کی محبت و دشمنی اور دشمنی ان افسانوں کا خاص موضوع ہے اور انھیں پڑھکر انسان یوں محسوس کرتا ہے جیسے ایک ایسی دنیا میں تیرتا چلا جارہا ہے جہاں پر تکلف تہذیب کی ہماہمی اور شیطنوں بھرے شہروں کا غلغلہ نہیں بلکہ آسمانی سکوت اور نرم و دھیمی خاموشی ہے اور اس سکوت میں غریبوں کی کراہیں اور بیواؤں کی آہیں ہونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہیں ملک کے مشاہیر اور متعدد اخبارات و رسائل نے اس کتاب پر حوصلہ افزا تبصرے کئے ہیں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱/۸

ملنے کا پتہ

دار الاشاعت پنجاب لاہور

"ٹیگور"

(از جناب شاہد صدیقی)

وہ بوڑھا فلسفی جس میں جوانی کی اُمنگیں تھیں
اَدب کا ولولہ تھا، زندگانی کی ترنگیں تھیں

وہ شاعر جس کے میٹھے بول تھے پیغامِ آزادی
نہ چھوٹی عمر بھر ہاتھوں سے جس کے جامِ آزادی

وہ میکش جو سدا میخانۂ فطرت کی پیتا تھا
گلوں کے ساتھ ہنستا تھا گلوں کے ساتھ جیتا تھا

وہ ساقی جس کی نظروں سے مئے عرفاں برستی تھی
وہ جس کے سامنے کوئی بلندی تھی نہ پستی تھی

وہ رہرو جس نے دنیائے ادب کی رہنمائی کی
جہانِ شعر پر جس کے تخیّل نے خدائی کی

وہ رہبر جس نے دُھندلے راستوں کو روشنی بخشی
نظر کو دل بنایا، دل کو روحِ زندگی بخشی

وہ اِک ملّاح، جو طوفان میں بھی مُسکراتا تھا
مسلسل آندھیوں کے ساز پر نغمے سُناتا تھا

وہ دیوانہ، سکھائے جس نے آدابِ خردمندی
اُٹھا ڈالا حجابِ روئے عگینی و خورسندی

وہ فرزانہ، جسے دیوانگی سے آشنا کہئے
سیاست کے اندھیروں میں خرد کا رہنما کہئے

وہ فطرت کا پُجاری جس نے تاروں کی زباں سمجھی
صباح و شام کے رنگیں نظاروں کی زباں سمجھی

وہ مالی جس نے اپنے باغ کا طرزِ کہن بدلا
شگوفوں کی ادا بدلی، ہواؤں کا چلن بدلا

وہ غوّاصِ معانی، جس نے سمجھایا کہ دل کیا ہے
سرورِ جاوداں کیا شے ہے، سوزِ مستقل کیا ہے

وہ دورِ حال و ماضی کی حقیقت جاننے والا
اس آئینے میں مستقبل کا رُخ پہچاننے والا

وہ اِک سچا پرستارِ وطن، سرشارِ آزادی
غلامی کی ہواؤں میں علمبردارِ آزادی

وہ نبّاضِ حقیقت، قوم کا دل دیکھنے والا
سوادِ راہ میں آثارِ منزل دیکھنے والا

وہ افسانہ طرازِ روح وہ فطرت کا شیدائی
وہ تبدیلی کا جویا وہ تغیّر کا تمنّائی

ابھی اس کی رسیلی راگنی کا دور جاری ہے
وطن کی محفلوں میں سرخوشی کا دور جاری ہے

ابھی مہکے ہوئے ہیں پھول اس کی فکرِ رنگیں کے
چمن والوں کی بیتابی میں ہیں سامان تسکیں کے

ابھی اس کے تخیل کی لطافت کارفرما ہے
کہ باطل کی جگہ روحِ صداقت کارفرما ہے

ابھی اس کی شرابِ نو چھلکتی ہے پیالوں میں
اسی کی یاد اسی کا تذکرہ ہے پینے والوں میں

دلوں پر ثبت ہیں اس کے نقوشِ زندگی اب بھی
زمانہ اس سے لے سکتا ہے درسِ آگہی اب بھی

یقینِ مرگ کوئی اس کی نسبت کر نہیں سکتا
وہ ہم سے دُور ہو سکتا ہے لیکن مر نہیں سکتا

ماہِ نیم ماہ

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔اے)

فلک پہ شمع ہے روشن کہ ہے یہ ماہِ تمام
شرابِ حسن کا ہے یا کوئی بلوریں جام
عقیق وارِ یمِ نیل کی روانی میں
نگیں کوئی ہے یہ ضوپاش بند پانی میں
یہ جان ڈال کے خمیازۂ جوانی میں
حسین کوئی ہے ملبوسِ آسمانی میں
تجلیوں کا ملمّع کیا ہوا جھومر
جھلک رہا ہے کسی خوبرو کے ماتھے پر
پئے وصال یہ عالم ہے ماہ پاروں کا
بچھا دیا ہے سرِ عرش جال تاروں کا
نہاں ہیں لاکھ ستارے فلک کی چادر میں
شرارِ عشق ہوں مستور جیسے پتھّر میں
کوئی چراغ بکف کارواں ہے گرمِ سفر
اسی کی سمت ستاروں کی اُٹھ رہی ہے نظر
چلا جو چاند اُدھر چاندنی ادھر آئی
ملائی آنکھ تو شبنم کی آنکھ بھر آئی
حدِ کمالِ ثریا زوال پرور ہے
لرز لرز کے زمیں پر جمال گستر ہے
چمن کے رنگ کا ملتا ہے کچھ پتا اِس سے
گزر رہی ہے نسیمِ سحر یہ کیا اِس سے
بہت سنبھال کے رکھتی ہے گو قدم لیکن
رُکا ہوا ہے لبوں پہ ہزار دم لیکن
نقوشِ حسن کو پھر بھی مٹائے جاتی ہے
بساطِ عشق کی شمعیں بجھائے جاتی ہے
مگر یہ رنگ بھی کچھ رنگِ استوار نہیں
تغیرات کو اک حال میں قرار نہیں

نمودِ حسن اِک اعجازِ آب و دانہ ہے
ہوائے شوق پہ مبنی یہ کارخانہ ہے

شعر اور ترقی پسند ادیب

(از سید اختر علی تلہری)

اس طرف کچھ عرصہ سے "ترقی پسند ادب، نئے ادب" کا تذکرہ نوجوان ادیبوں کی زبان قلم پر مختلف پیرایوں میں آرہا ہے۔ اس کی "کایا پلٹ شعبدہ گری" کی داستانیں بڑی بلند آہنگی کے ساتھ بیان کی جارہی ہیں۔ لیکن جب ترقی پسند ادب کے اُن مختلف مفہومات پر غور کیا جاتا ہے جو یہ نئے ادیب پیش کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان خیالات میں خطرناک قسم کا ابہام موجود ہے۔ حقیقتوں کے ادراک کے لئے جس بینائی نظر اور دقت نگاہ کی ضرورت ہے اُس سے وہ قریب قریب محروم ہیں۔ مارکس وفرائڈ کے مزعومات پر جذباتی حیثیت سے مذہبی قسم کا ایمان لا چکنے کے بعد شعروشاعری کے بارہ میں وہ جس قدر چاہیں غیرادیبانہ باتیں کہیں، لیکن اس حقیقت کو بدل نہیں سکتے کہ "مارکسی اشتراکیت" کے سانچہ میں شعر کو ڈھالنے کی سیاسی کوششیں اور اُس کے حُسن وقبح کی جانچ پڑتال کے لئے نقد وانتقاد کے نئے نئے اُصول وقوانین اپنے مخصوص نظریوں کے ماتحت بنانا صرف "پروپیگنڈائی وقعت" ہی رکھ سکتا ہے۔ "شعریت" کے نقد سے اُسے کوئی نفس الامری تعلق نہیں ہے۔

ترقی پسند ادب کی ترجمانی کا ادّعا کرنے والوں کی طرف سے غزلیہ شاعری پر یہ الزام برابر عائد کیا جاتا ہے کہ اس ذخیرہ میں ہجرووصال کی بار بار کی دُہرائی ہوئی داستانوں اور گل وبلبل کی وہی پُرانی گھِسی پِسی حکایتوں کے سوا اور کیا ہے؟ ناز حسن ونیاز عشق کے افسانوں، درد وغم کے ترانوں میں اب کوئی ندرت نہیں، تازگی نہیں، جان نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اب تک نیا ادب جو شعری ذخیرہ پیدا کرسکا ہے اُس کی کائنات مزدور سرمایہ دار انقلاب، کسان، بغاوت وغیرہ چند سطحی لفظوں" کو ایک جگہ اکٹھا کردینے اور لہجہ میں ایک خاص قسم کی کرختگی اور خشونت پیدا کرلینے کے سوا اور کیا ہے؟ اگر ان نئے ادیبوں کا اپنے شاہکاروں میں فلسفہ کی چاشنی دینے کو بھی جی چاہا تو واعظ وزاہد کے بجائے خدا سے ٹھٹھول کرلیا گیا۔ مذہب کو "استہزا وطنز" کا نشانہ بنادیا گیا یہ تو "نئے تخلیقی ادب" کی کائنات ہے لیکن جب کبھی اس سے ہٹ کر "ادبی نقد" کے جادہ پر گام فرسائی کی گئی تو "مارکسی اشتراکیت" کا تخیل سامنے رکھکر یہ کہدیا گیا کہ اس نظم میں آزادی کا

تخیل غلط ہے۔ اس میں جاگیردارانہ نظام کی بُو ہے۔ اس شعر میں اصلاح پسندی کا اثر ہے۔ انقلابی تصور سے اِسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ شعر ہی کا زمانۂ زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس میں "فراریت" ہے۔ اِس میں "تضادی کیفیت" ہے۔

مارکس و اینگلز و فرائڈ سے دریوزہ گری کے طفیل چند اصطلاحات کے جو سوکھے ٹکڑے مل گئے ہیں اُنھیں برابر موقع بے موقع چباتے رہنا بھی کوئی خوشگن مشغلہ نہیں ہے۔ "ظرف تنگنائے غزل" اگر بقدر شوق نہیں اور بیان کی وسعت کے لئے نظم کے فراخ میدانوں میں قدم رکھا جا رہا ہے تو یہ تو نہ ہو کہ اُس میں بھی "مارکسی اشتراکیت" کا محدود حصار بنا کر میدان کی فراخیوں کو اپنے لئے تنگ کر لیا جائے۔ جس نئے ادب اور جس نئی تنقید کے نمونے ہمارے سامنے آ رہے ہیں اُن کی حالت کسی طرح پُرانی مطعون شاعری اور پُرانے عنوانِ نقد سے بہتر نہیں ہے۔ اُن سے بھی وسعتیں مفقود ہیں۔ ندرت و تازگی کا اُن میں بھی کچھ اثر نہیں ہے۔ اُن کے شعر و ادب کی "آستین" بھی پُرانے شعر و ادب ہی کی طرح "شکر آلود" ہے۔ پھر ایسی صورت میں اُس سے مگس رانی کی توقع کیونکر ہو سکتی ہے۔

یقیناً ادب و شعر جامد چیزیں نہیں ہیں۔ عالم کے تغیرات کا ان پر اثر پڑتا رہتا ہے۔ خیالات کی رَو بھی رُخ بدلتی رہتی ہے، اور بیان کے اسالیب میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ماحول، سماج، تمدن وغیرہ کی اُلٹ پلٹ سے شعر کی مزاجی کیفیت متغیر ہوتی رہتی ہے مگر اس تمام تغیر و تبدل کا تعلق جزئیات کی دنیا سے ہوتا ہے۔ عالم کلیات سے نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ نگاہیں جو ہر آن بدلنے والی جزئیات ہی میں گرفتار ہو کر رہ جاتی ہیں "مستقل کلی حقیقتوں" کا ادراک نہ کر سکیں لیکن جو نگاہیں جزئیات کی سطح سے بلند ہو سکتی ہیں وہ اس کا انکار نہیں کر سکتیں کہ اس ہر آن بدلنے والی کائنات میں تصورات و جذبات سے تعلق رکھنے والی کچھ ایسی حقیقتیں ہیں جنھیں مستقل کہا جا سکتا ہے مستقل حقیقتوں کا مطلب "ازلی و ابدی حقیقتوں" سے نہیں ہے۔ اس مقام پر مستقل حقائق سے مقصود وہ احساسات و جذبات و تصورات ہیں جن پر انسانی تجربہ استقرائی اُصول ملحوظ رکھتے ہوئے یکسانی کی مہر لگا چکا ہے۔ یہ مسئلہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے شاید مزید تفصیل چاہتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ آغازِ آفرینش سے اب تک ہم جن حاسوں کے مالک رہے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے مخصوص ماحول و مخصوص جغرافیائی حالات میں جذبات و تصورات کی جو کیفیتیں طاری ہوتی رہتی ہیں اُن کی بہت سی شکلوں میں تجربہ یکسانی کا ثبوت فراہم کر سکتا ہے۔ جیسے

چنبیلی کی خوشبو سے ایشیا کے جغرافیائی ماحول میں قوت شامہ برابر فرحت حاصل کرتی ہے عنادل خوشنوا کے زمزمے سامعہ کے لئے نشاط ہی کا سامان بنتے ہیں۔

چونکہ اب تک اس ماحول میں موجودہ حاسّوں کی موجودگی میں کچھ مخصوص حالات کے رونما ہونے پر مخصوص کیفیتیں برابر ظاہر ہوتی رہی ہیں اس لئے آیندہ کے لئے بھی یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ جب تک ہمارے موجودہ "نفسی و جسمی نظام" میں تغیر نہیں ہوتا مخصوص حالات کی موجودگی میں مخصوص کیفیتوں کا وجود بھی لازم ہے۔ غیر تغیر پذیر مستقل حقیقتوں سے اسی قسم کے انسانی تجربے مراد ہوتے ہیں۔ ان انسانی تجربوں کا دائرۂ احساسات جذبات اور تصورات سب پر مشتمل ہے۔ مادی علل و معلولات کے جس سلسلہ پر ہمارے ترقی پسند ادیب ایمان لائے ہوئے ہیں اور جس کی اساس پر "تاریخ کے مادی تصور" کے نظریہ کی اساس قائم ہے اُس کی بھی بعینہٖ یہی حیثیت ہے، "مسئلۂ تعلیل" سے جس قدر مادی دنیا متاثر ہے اُسی قدر عقلی دنیا بھی۔

نئے ادب کے ترجمان آخر اس قضیہ "ایک کی آزادی دوسرے کے لئے غلامی ہے" میں استقلال کے عناصر پاتے ہیں، ایسی حالت میں اگر اس نئے مذاق کے ماتحت بھی کچھ حقائق و مفاہیم کو مستقل مان لیا جائے تو کسی "منطقی گناہ" کا ارتکاب نہیں ہو جائے گا۔

حقیقت میں اسی قبیل کے غیر تغیر پذیر مفاہیم کو "حقائق مستقلہ اور کلیات مطلقہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ اپنے ذات و نفس کے لحاظ سے ایک حالت پر رہتے ہیں، البتہ ان کے مصادیق جنھیں جزئیات بھی کہا جاتا ہے بدلتے رہتے ہیں۔ جن اذہان کو "حکیمانہ تجرید" کا ملکہ نہیں ہے وہ ان جزئیات کی تغیراتی دنیا ہی کو اس کائنات کا سب کچھ سمجھ لیتے ہیں

ایک حقیقی شاعر کا کمال یہی ہے کہ وہ مختلف ذخیروں سے انھیں مستقل حقیقتوں کو چھانٹ کر شعری سانچوں میں ڈھال دے اور اثر و تاثیر کے حیرت انگیز آفاق گیر طلسم پیدا کر دے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شعر اپنے فن کارانہ مقتضیات کے لحاظ سے ان حقیقتوں کے بیان کے لئے جو لہجہ اختیار کرے گا وہ فلسفہ کے لہجہ سے مختلف ہوگا۔

ذیل میں ایک باکمال غزل گو کے چند شعر لکھے جاتے ہیں جن میں اسی قسم کی مستقل نفسی و جذباتی و عقلی حقیقتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ لہجہ میں شاعرانہ صناعی کی وہ لطیف خصوصیتیں موجود ہیں جو شعر کی حد میں فلسفہ سے الگ کر دیتی ہیں۔

دنیا سے پوچھ دیکھ، کوئی ذرہ دہر کا تزئین کائنات سے غافل نہیں رہا

کہتی ہے اہلِ ذوق سے بیتابیِ خیال — جس میں نہ اضطراب کی خو ہو بشر نہیں

جبتک اُجڑے ایک دنیا ایک دنیا بس گئی — جوشِ نیرنگِ تمنا سے یہ عالم دل کا ہے

ناداں کو انتظارِ قیامت ہے ورنہ یاں — پیدا عمل عمل سے ہے آوازِ صور کی

اک یوں چمن میں مہکے اک یوں قفس میں تڑپے — تو ہی خدائے گل ہے کیوں اے خدائے بلبل

پہلے پہل کسی نے جو پوچھا ہے دل کا حال — تصویر بن گیا ہوں میں بگڑے گواہ کی

لرزِ خیال کی دنیا کے انقلابوں سے — اُنھیں کا روپ ہیں نیرنگیاں زمانہ کی

بلا کا گھر تھا کبھی اب تو میری نظروں میں — قفس میں شان نکلتی ہے آشیانہ کی

بجلی کو خود نہیں ہے نہ گرنے پہ اختیار — الزام اُس نگاہ پہ کوئی لگائے کیوں

پھول ملتے ہیں ابھی کھیل تو انگاروں سے — نار سے خلد کا رستہ نظر آتا ہے مجھے

(از بیخود موہانی مرحوم)

اشعار بالا کسی اشتراکی شاعر کے نہیں ہیں، یہ ایک ایسے غزل گو کے نتائجِ افکار ہیں جس کی شاعری کا کالبد تمام تر پرانے ادبی مذاق ہی کی مٹی سے تعمیر ہوا ہے۔ لیکن چونکہ وہ شاعری کے بادۂ سرجوش کا حقیقی معنوں میں جرعہ کش ہے اس لئے اُس کے اشعار انسانی تجربوں اور مختلف النوع مستقل حقیقتوں کے آئینہ دار ہیں۔ اور اسی لئے ان اشعار میں بقا و استقلال کی صلاحیت ہے۔ یہ خصوصیتیں جہاں کہیں ملیں گی عام انسانی برادری کو مخاطب کرنے کی اُن میں اہلیت پائی جائیگی اور اُن کی اپیل کا دائرہ پھیلتا چلا جائیگا۔

یہ سچ ہے کہ جو انسانی تجربے اِن اشعار میں بیان کئے گئے ہیں اُن میں نری کھری فلسفیانہ حقیقت نگاریوں سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ اُن مجازی اشارات سے کام لیا گیا ہے جو شاعری کی ہمیشہ سے جان رہے ہیں اور رہیں گے۔ اس مقام پر بعض ترقی پسند ادیبوں کی ایک اہم غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ اُنھیں علم بیان کے بتائے ہوئے اُن "اسالیب ادا" میں جو معانی کو مختلف لباس پہناتے ہیں جاگیردارانہ نظام کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ اس وقت تفصیل سے اس مسئلہ کے متعلق بحث منظور نہیں ہے البتہ اجمالاً اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ تشبیہ استعارہ کنایہ مجاز مرسل کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ سے لٹریچر کی آرائش کا سبب رہے ہیں۔

وہ قومیں جو اپنے حالات کے لحاظ سے جاگیردارانہ نظام سے وابستہ نہیں رہی ہیں بلکہ "قبائلی آزادی" کے ماتحت زندگی بسر کرتی رہی ہیں اور اُنھیں ایک جمہوری قائد Democratic Dictator یعنی شیخ قبیلہ کی نگرانی میں مساویانہ آزادی کے ساتھ زندگی کی نعمتوں سے مستفید ہونے کا برابر موقع رہا ہے

اِن مجازی اشارات سے علیحدہ نہیں رہ سکی ہیں۔ اُن کی شعری دنیا کی زینت میں بھی یہی چیزیں کام آتی رہی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ حکومت کے جو نظریئے قائم ہو چکے ہیں اُن سے اِن قوموں کو براہ راست کوئی واسطہ نہیں تھا، وہ شہنشاہانہ جاگیردارانہ سرمایہ دارانہ یا پھر جمہوری واشتراکی نظامات سے (ان الفاظ کے موجودہ اصطلاحی مفاہیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے) متاثر نہیں تھیں، اور نہ ہو سکتی تھیں کیونکہ "ریاست" کا عملی تخیل ارتقا کی یہ منزلیں طے نہیں کر سکا تھا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اقوام وملل قطعی طور سے ایک ایسے اصطلاحاً غیر معین ریاستی نظام کے ماتحت زندگی بسر کر رہی تھیں جو نہ سرمایہ دارانہ تھا اور نہ جاگیردارانہ۔ میری مراد عرب قوم سے ہے، زمانۂ جاہلیت میں اُس کی یہی حالت تھی، اس قوم کا ہر فرد خاص قسم کی مساوات اور آزادی کا علمبردار تھا۔ کسی بادشاہ کی غلامی سے اُسے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اپنے طور طریقوں میں وہ بڑی حد تک آزاد تھی۔ خیالات کے اظہار میں اُس کی آزادی تو حیرت انگیز تھی، عریاں ترین حقیقتوں کے ظاہر کرنے میں اُسے کبھی ذرا سا پس وپیش نہیں ہوتا تھا۔ پس پردہ کی باتیں بھی وہ اشعار میں بے تکلفی کے ساتھ نظم کر دیتی تھی۔ ایسی حالت میں اُسے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے ان علامات واشارات کی آڑ لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اصل یہ ہے کہ وہ اِن مجازی اسالیب بیان کو مفاہیم کے ادا کرنے اور اُن کے عام ذہنوں میں جما دینے کا کامیاب ذریعہ سمجھتی تھی، اسی لئے موقع موقع سے وہ اس سے کام لیتے تھے۔ اِن مجازی اشارات (symbols) کے متعلق اب تک کا جو کچھ تجربہ ہے اُسے دیکھتے ہوئے یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ آئندہ بھی ادب وشعر کے ضمن میں یہ مجازی اشارے سبزۂ بیگانہ کے بجائے پھول ہی رہیں گے۔ اِن مجازی اشارات کی پیدائش کو کسی نظام حکومت سے وابستگی نہیں ہے۔ اُن کی پیدائش قریب قریب اُسی طریقہ سے ہوئی ہے جیسے ہر زبان میں حروفِ جارّہ وحروف عاطفہ وافعال واسما کی پیدائش ہوئی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ یہ مجازی اشارے اپنی جزیاتی حیثیت میں گھس پس کر پرانے ہو جاتے ہیں اور اُن میں ندرت نہیں رہتی۔ اُس وقت میں ایک کامیاب ادیب، ایک باکمال شاعر کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ نئے نئے اشارے جن میں ندرت ہو تازگی ہو استعمال کرے لیکن یہ تغیرات شخصی ہوتے ہیں نوعی نہیں ہوتے۔ یہ شخصی تغیرات ماحول یا سماج، تہذیب اور جغرافیائی حالات کے تغیر سے ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن انھیں نوعی تغیرات کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو مانا جا سکتا ہے کہ مخصوص قسم کی تشبیہیں مخصوص قسم کے استعارے مخصوص جماعتی حالات میں پیدا ہوں لیکن مطلقاً تشبیہ واستعارہ وغیرہ کو

وہ زبان اُردو ہی میں سہی جاگیردارانہ یا شہنشاہانہ نظام کا ممنون بتانا ان اسالیب بیان کی حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

سطور بالا میں اسے واضح کیا جا چکا ہے کہ شعر ذاتی حیثیت سے کسی سیاسی نظریہ کے حصار میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں اتنا اضافہ اور ضروری ہے کہ شعر کو کسی مخصوص سیاسی نظریہ کی غلامی کی حیثیت سے اچھا یا بُرا سمجھنا رجعت پسندی ہی کی ایک شکل ہے

اب سے کچھ عرصہ پہلے سرسید نے مسلمانوں میں "اسلامی قومیت" کا افرنجی تخیلات سے دبکر جو نیا شعور پیدا کیا تھا اُس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا تھا کہ اس شعور میں امتیازی خصوصیتیں باقی نہیں رہ گئی تھیں اور وہ اُن چیزوں کو بھی اپنی زد میں لے لینا چاہتا تھا جو اُس کے حلقۂ اثر میں جائز طور سے نہیں آتی تھیں۔ "مسدس حالی" کی پڑھے لکھے مسلمانوں میں عام پسندیدگی اُسی شعور کی بے شعوری کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ مسدس حالی میں چونکہ مسلمانوں کے گذشتہ شاندار عروج کی داستانیں مزہ لے لے کر بیان کی گئی تھیں اور اس کا مقابلہ اُن کے موجودہ دَور کی زبوں حالی سے کیا گیا تھا گویا اس عنوان سے اُنھیں پھر اپنے شاندار ماضی کی طرف غور کرنے کی دعوت دی گئی تھی، اور یہ چیز مسلمانوں کے اُس قومی مزاج کے بالکل موافق تھی جو سرسید نے پیدا کر دیا تھا۔ اس لئے اس کا بلا لحاظ کئے ہوئے کہ نفس شاعری کی حیثیت سے وہ کس درجہ کی چیز ہے۔ فن کارانہ صناعی نے مولانا حالی کی اس "منظوم قومی داستان" میں شعریت کا رنگ کہاں تک بھرا ہے اُسے عام طور سے پسند کیا گیا۔

"شعری شعور" کی یہ بے شعوری مخصوص حالات میں ذرا بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔ کسی چیز میں شغف جب اعتدال سے متجاوز ہو جاتا ہے تو یہ بدمذاقیاں پیدا ہی ہو جاتی ہیں۔ کیا یہ برابر نہیں دیکھا جاتا کہ وہ لوگ جن میں مذہبیت "یبوست خیز تقشف" کی حد تک پہونچ چکی ہے اور جو تسبیح کے دانوں ہی پر دنیا کا سارا حساب کتاب چکانا چاہتے ہیں صرف اُسی شاعری کو پسند کرتے ہیں جس میں اس قسم کے اشعار ہوں :-

نماز ایک جس شخص نے ترک کی		تو اُس نے اپنا کیا بے چھری
اگر دو نمازوں کا تارک ہوا		تو گویا کہ خوں اِک نبی کا کیا
ہوئی تین وقتوں کی جس سے قضا		تو کعبہ کو اُس شخص نے ڈھا دیا

اِس قسم کی شاعری کو پسند کرنے والوں کے اُن جذبات کا احترام کرنے کے باوجود جو

شعر کے متعلق اس بے شعوری کا باعث بنتے ہیں، ان اشعار کو فن شعر کا کوئی خاص کارنامہ قرار نہیں دیا جا سکتا یہی حالت وکیفیت اُن اشتراکیوں کی پسندیدگی کی ہے جو شاعری کو مارکسی فلسفہ کا غلام بنا دینا چاہتے ہیں :" مارکسی نظام اشتراکیت" سے غیر معمولی شغف نے اُن میں یہ شعری بے شعوری" پیدا کر دی ہے اور وہ" ہر مرض کی دوا ہے مارکسزم" کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ اشتراکی ادیب شاید اس تشبیہی مناسبت کو اپنے لئے پسند نہ کریں لیکن منطقی اسلوب نظر سے ہمیں اِن دونوں جماعتوں میں مشابہت تام دکھائی دیتی ہے۔ وہی پُر پیچ دلائل جو شاعری کو مارکسی فلسفہ کا حلقہ بگوش بنانے کے لئے تراشتے جاتے ہیں شاعری کو مخصوص مذہبی نظریوں اور مختلف قومی تخیلات کا پابند بنا دینے کے وجوب کے لئے بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ مارکسی فلسفہ کے حلقہ بگوشوں کے نزدیک زندگی کی حقیقتیں کچھ اور ہیں۔ اُن کا مشاہدہ انھیں دوسرے نتائج تک لے جاتا ہے اور ان نتائج سے جو ہٹتا ہے وہ" فراریت" کا مرتکب ہوتا ہے۔ لیکن مذہب والے بھی تو اسی اساس پر اپنے شعور شاعری کے حق بجانب ہونے کی عمارت بلند کر سکتے ہیں۔ اُن کی نظر انھیں زندگی کی دوسری حقیقتوں تک پہونچاتی ہے جو مارکسی حقیقتوں سے مختلف ہیں۔ اُن کے خیال میں مادیت کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا زندگی کی اصل حقیقتوں سے" فرار و ہرب" کی حیثیت رکھتا ہے، اور انسانیت کو آگے بڑھنے اور پنپنے سے روکتا ہے "۔

اب اس کا فیصلہ کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون ؟ اگر آسانی سے ہو بھی سکے تو دوسرے میدانوں ہی میں ہو سکے گا۔ اس کے لئے فلسفہ علم کلام، اقتصادیات اور دوسرے علوم کی طرف مراجعہ کی ضرورت ہوگی۔ شعر کی لطافتیں اور نزاکتیں اِن سنگلاخ میدانوں میں جولانیوں کی حریف نہیں بن سکتیں اور نہ یہاں یہ لڑائیاں لڑی جا سکتی ہیں۔ شاید نئے ادیبوں کی طرف سے ارباب مذاہب پر حقیقتوں سے چشم پوشی کی تہمت لگائی جائے اور ان کا مارکسی اشتراکیوں کے تمدنی واخلاقی اقدار" سے انحراف اُن کے نفاق کی نشانی بتایا جائے۔ لیکن یہ حربہ پلٹ کر بھی استعمال ہو سکتا ہے اور شاید زیادہ کامیابی سے۔

ظاہر ہے کہ" مارکسی اشتراکیت" کے ماتحت جو نئی اخلاقی قدریں بننا چاہیئے اُس کے لحاظ سے نفاق وخلوص خیانت ودیانت، دغابازی وایمانداری کے تصورات عملی دنیا میں کسی خاص اہمیت یا عدم اہمیت کے مالک نہیں ہو سکتے۔ اِن تصورات میں سے جس وقت جس

کا دامن پکڑ لینا خود غرضی کے جذبات کی تسکین و تشفی کے لئے موزوں ہو مارکسی زاویۂ نگاہ سے اُس وقت وہی قابلِ احترام ہے. جبکہ مذہب کا قدم درمیان سے اُٹھا دیا گیا جو "اخلاقی قدروں" کے وجود پر زور دیتا تھا اور اُن کے سامنے انسانی پیشانیاں جھکانے کے لئے طرح طرح کے ترغیبات و تخویفات سے کام لیتا تھا تو پھر اب انسان کے پاس اِن اخلاقی قدروں پر عامل ہونے کے لئے کون سا واقعی سہارا رہ گیا۔ اُسے تو جس میں مادّی حفاظت ملحوظ رکھتے ہوئے مادّی فائدہ نظر آئے گا وہی کام کرے گا۔ "مارکسی اشتراکیت" آئندہ کے متعلق اشتمالیت (Communism) کی جس جنت کے خواب دیکھ رہی ہے اگر اُس کی تعمیر میں منطقی عناصر سے کام لیا جائے تو یہ قطعی ہے کہ مذہب و اخلاق کے آخری نشانوں کے غائب ہو جانے کے بعد صرف بہیمیت ہی کا دور دورہ ہوگا۔ خود غرضی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ عروج پر ہوگی اور اُس کے نتیجہ میں فواحش اعمال ثم افعال کا انسانوں ہی کے عمل و فعل کی دنیا پر تسلط ہوگا۔ اجتماعیت کا شعور (جبکہ اُس کی تعمیر میں حکیمانہ معتدل مذہب کے مصالحہ سے کام نہیں لیا گیا ہے) لازمی طور سے آگے بڑھکر بہیمانہ رنگ میں رنگ جائیگا۔ آج جو اشتراکی ادیب اخلاقیت و انسانیت کا اپنے مقالات میں تذکرہ کرتے ہیں تو وہ (گستاخی معاف) یا تو ان مقامات پر مصلحتاً نفاق سے کام لے رہے ہیں یا پھر اُن کے دماغ کے غیر شعوری حصّوں میں مذہبیت پورے طور سے موجود ہے، جو روکے اور دبائے جانے کے باوجود ان "ایثار آمیز" تصورات کی شکل میں کبھی کبھی نمودار ہو جاتی ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ زندگی نہایت ہی وسیع الذیل چیز ہے اُس کی حیثیت ایک قلزم زخار کی ہے جس میں مختلف مظاہروں کی لہریں برابر اُٹھتی رہتی ہیں، اُن کے ادراک کے لئے ایسی نگاہِ مشاہدہ کی ضرورت ہے جو برابر مستعدی کے ساتھ حکیمانہ طور سے گرم تماشا رہے۔ زندگی کے دریائے بیتابی میں "کسان و مزدور" کی تھکی ہوئی عرق آلودہ مساعی صرف چند موجوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں کو زندگی کی کائنات سمجھ لینا انسانی تجربہ کی کورچشمی ہے۔ ایسی حالت میں شاعری سی وسیع شئے کو زندگی کے ایک ہی پہلو سے مخصوص کر دینا دانشمندی نہیں ہے۔

شعریت کیا ہے اور کیا نہیں ہے؛ اسے وہ نئے ادیب بھی سمجھتے ہیں جن میں ابھی اس کی صلاحیت ہے کہ بیوقوفی کی حرکت کو غیر ادیبانہ تصور کر سکیں؛ اُن کے قلم سے خواہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر یہ فقرے نکلتے رہتے ہیں کہ "اس شعر میں شعریت ہے اس میں نہیں ہے"

بلا اس کا لحاظ کئے ہوئے کہ وہ اُن کے مزعومہ سماج کے کہاں تک ترجمان ہیں؟ پروفیسر احمد علی ترقی پسند ادیبوں میں ممتاز جگہ رکھتے ہیں۔ آپ نے جنوری و فروری ۱۹۴۱ء کے تازہ نیا ادب میں ایک مقالہ لکھتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے " چنانچہ شاہد لطیف بھی جو ادب کے سیاسی پروپیگنڈسٹ ہو گئے ہیں احمد علی پر رسالہ اُردو کے ایک جدید پرچہ میں اعتراض جڑتے وقت احمد علی کو غلط سمجھے۔ وہ چاہتے تھے کہ احمد علی حقیقت کو خیر باد کہہ کر یہ چلّانے لگے۔

" اے مزدورو اور اے کسانو، تم بھوکے ہو تم ننگے ہو، تم ظلم سہہ رہے ہو، اُٹھو، اور انقلاب کرو وغیرہ وغیرہ، مگر میں اس قسم کی تصنیف کو ادب میں شمار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں اور نہ اس قسم کی تنقید کو ادبی تنقید سمجھتا ہوں "

پروفیسر احمد علی کا یہ پُرمغز ارشاد بہت کچھ ادبی و شعری حقیقت و ماہیت کا ترجمان ہے۔ لائق پروفیسر صاحب خواہ نئے ادب کے موغطت پسندانہ خشونتوں سے اپنے کو وابستہ رکھنے کی وجہ سے اقرار نہ کریں لیکن وہ شعریت کی اُس مابہ الامتیاز خصوصیت کے ادا شناس معلوم ہوتے ہیں جسے شاعرانہ زبان میں " خمار چشم ساقی " سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور جس کا حسنِ دلنواز اسالیبِ بیان کی ندرتوں کے ہلکے پردوں سے چھن چھن کر حساس دلوں میں کیف و نغمہ کی دنیا پیدا کرتا رہتا ہے۔ شاعری کی یہ مابہ الامتیاز خصوصیت حسنِ الفاظ و حسنِ تراکیب کے خلق کئے ہوئے نغمہ و ترنم کے تاروں پر دوڑتی ہوئی دل و دماغ کی دُنیا اُسی طرح زیر و زبر کر دیتی ہے جس طرح حسن و شباب کی مستیوں میں سرشار محبوب خوش ادا کی سرمہ آلود آنکھوں کے لال لال ڈورے حساس دلوں میں زلزلہ کا تلاطم برپا کر دیتے ہیں۔ مست آنکھوں کی ان قیامت خیز کیفیتوں کو دیکھ کر چشم زدن میں دل کی جو حالت ہوتی ہے اور جسے آغاز آفرینش سے آج تک مختلف پیرایوں میں، مختلف دوروں میں مختلف زبانیں برابر ادا کرتی چلی آئی ہیں۔ وہی کیفیت شعر و شاعری کے نغموں کی ہے کہ جہاں یہ کانوں کے پردوں سے ٹکرائے معاً ذوق رکھنے والے دلوں میں عجیب و غریب کیفیت پیدا ہوئی جسے مختلف عنوانوں سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کی جاتی ہے۔ جو نئے نقاد اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اشتراکیت و اشتمالیت کے قائم کردہ قوانین پر اس شاعرانہ کیفیت کا تحلیل و تجربہ کر کے اُس کی " جذبی و نفسی کیفیت " کو مادّی شکل دے دیں وہ گلاب کی پنکھڑیوں کے رنگ و بُو کا اندازہ دشنہ و خنجر کی نوکوں سے کرنا چاہتے ہیں اور اِس طرح اپنے " جمالیاتی شعور " کی تہی دامانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سماج کے مختلف پہلوؤں کا تحلیل و تجزیہ فلسفۂ اجتماعیات وغیرہ ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ شاعری

کے ساز کو نرے کھرے "اشتراکی مضراب" سے نہیں چھیڑا جا سکتا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اجتماعیت کے اس خرمن سے بھی کچھ دانے جو شاعری کی کشت زار کے لئے موزوں ہوسکتے ہیں اور جو اس کی زمین پر برگ و بار لاسکتے ہیں چُن لے اور اُن میں بھی اپنی مسیحا نفسی سے تازہ جان ڈال دے شاید اشتراکی ادیب شاعری کی اس ما بہ الامتیاز خصوصیت کو اپنے "روٹی دال کے فلسفہ" سے ہم آہنگ نہ پاکر اسے جذباتی عیاشی قرار دیں۔ اور اُس میں "پروپیگنڈائی افادیت" پیدا کرنے کے لئے "مارکسی اشتراکیت" ہی کے محور پر ایسے گھوما رکھنا چاہیں، مگر یہ صرف اُن کی حد سے بڑھی ہوئی "مادی خیرہ چشمی" ہوگی۔ جذباتی یا عقلی عیاشیوں سے بچا ہوا کون ہے؟ تاہم اگر شاعری اس مفہوم کے لحاظ سے "افادیت" سے خالی نظر آرہی ہے تو زیادہ ایمانداری کی بات یہ ہوگی کہ فارسی کے اس مقولہ "ماناں میخواہیم شعر نمی خواہیم" پر عمل کیا جائے بہت سے حالات میں اس مقولہ پر عمل یقیناً ضروری ہوجاتا ہے کیونکہ زندگی کی اکثر منزلوں میں نان طلبی شعر خوانی پر مقدم ہو جاتی ہے۔

قدیم طرز تخیل پر فرد قرار داد جرم عائد کرتے وقت اسے بھی مختلف لفظوں میں بار بار دُہرایا جاتا ہے۔ کہ "خیال بغیر مادہ کے پیدا نہیں ہوسکتا"۔ اور اس لئے شاعری خلامیں پھل پھول نہیں سکتی، گویا اس عنوان سے ہمیں سمجھایا جاتا ہے کہ اُردو شاعری کی حقیقی بنیاد کچھ نہیں ہے۔ وہ اُس تخیل پر قائم ہے جو خلا میں پھلتی پھولتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب خیال بغیر مادہ کے پیدا ہی نہیں ہوسکتا تو پھر پُرانی شاعری کے تخیل کی گلکاریوں پر اعتراض کی صورت کیا ہے؟ جب خیال کے وجود کے لئے سابق میں مادہ کا وجود ضروری تسلیم کرلیا گیا تو لازمی طور سے ایشیائی شاعری کے طلسماتی تخیل کا رنگ و بو بھی مادہ ہی کا رہین منت ہوگا۔ ایسی حالت میں اسے یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ پُرانی شاعری بھی خلا میں نہیں پھلی پھولی ہے، بلکہ ٹھوس زمینوں ہی میں اس کے پودے نے جڑیں پکڑی ہیں اور اس کے ریشے ہیں سے غذا حاصل کرتے رہے ہیں اب یہ دوسری بات ہے کہ مادہ پر قدم جماکر خیال" فن کارانہ نقطۂ نظر" سے کبھی صحیح رُخ پر پرواز کرتا رہا ہے اور کبھی غلط رُخ پر۔ اس کی ضرورت البتہ ہے کہ غلط پروازی کی روک تھام کی جائے اور صحیح رخ پر پرواز کی عادت ڈالی جائے۔ اگر معترضین کا مطلب غلط پروازی کی روک تھام سے ہے تو بات اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ جو کچھ اختلاف ہوسکتا ہے وہ اس امر کی تعیین میں کہ پرواز تخیل کے لئے غلط سمتیں کون ہیں اور صحیح سمتیں کون؟ لیکن اسی کے ساتھ اتنا ضرور کہا جائیگا کہ اس مطلب

کے ادا کرنے کے لئے جو عنوان و اسلوب اختیار کیا جاتا ہے وہ نہایت ہی غیر منطقیانہ اور مغالطہ خیز ہے۔

اِس مقام پر ضمنی طور سے اس کا واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہ کلیہ کہ خیال بغیر مادّہ کے پیدا نہیں ہوتا غالباً تھوڑی سی ترمیم کا محتاج ہے۔ فلسفہ کی نگاہ میں یہ تو صحیح ہے کہ ہمارے کُل تمام علوم مادّہ ہی سے شروع ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب لینا کہ ہمارا تمام علم مادّہ سے پیدا ہوتا ہے قابلِ نظر ہے۔ مختلف واسطوں سے علم کی پیدائش کو مادّہ کی طرف منجر کرنا بیکار ہے کیونکہ اِس صورت میں مابعدالطبیعیاتی دلائل سے کام لینا ہوگا اور وہ اس نظریہ کے سراسر مخالف ہیں۔

اس سلسلہ میں کینٹ کے خیالات غور سے پڑھنے کے قابل ہیں:- اگرچہ اُس نے مادّہ کے بجائے تجربہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تاہم اس کا انطباق زیر بحث صورت پر بھی ہو سکتا ہے۔ کینٹ لکھتا ہے:-

"اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہمارے تمام علوم تجربہ ہی سے شروع ہوتے ہیں، علم کے آلات انھیں اشیاء کے ذریعہ سے عمل پر اُبھارے جا سکتے ہیں جو ہمارے حواس کو متاثر بناتے ہوئے ہم میں خیالات کی تخلیق کرتے ہیں کچھ تو اپنے طور سے اور کچھ اس طور سے کہ ہمارے ادراک کو اس پر آمادہ کر دیتے ہیں کہ وہ ان خیالات کا آپس میں مقابلہ کریں یا پھر ایک دوسرے کو آپس میں ملائیں یا ایک کو دوسرے سے علیٰحدہ کریں۔ یہ سب عمل اس لئے ہوتا ہے کہ ہمارے احساس پذیر تاثرات کا جو خام مصالحہ ہے اُس کو اشیاء کے اُس علم میں منتقل کر دے جسے تجربہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اگرچہ ہمارا سارا علم تجربہ سے شروع ہوتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکالا جا سکتا کہ ہمارا علم تجربہ سے پیدا ہوتا ہے۔

آیا کوئی ایسا علم ہے جو تجربہ سے بالکل بے نیاز ہو اور صرف تجربہ ہی سے نہیں بلکہ حواس کے تمام تاثرات سے بھی۔ یہ سوال سرسری طور پر نہیں ٹالا جا سکتا بلکہ اس کا جواب بہت ہی بڑا احتیاط تحقیق کے بعد دیا جا سکتا ہے۔

اِس قسم کے علم کو (Aprioni) مستغنی عن التجربہ علم کہا جاتا ہے اور "تجربی علم" سے بالکل الگ چیز ہے۔ Apriori (مستغنی عن التجربہ علم سے ہماری مراد اُس علم سے نہیں ہے جو اس تجربہ یا اُس تجربہ سے بے نیاز ہو بلکہ اُس علم سے مراد ہے جو تجربہ سے مطلقاً مستغنی ہو"

آگے بڑھکر کینٹ نے اس مستغنی عن التجربہ علم Apriori کی شناخت کی قطعی علامتیں بیان کی ہیں۔ وہ کہتا ہے

تجربہ ہمیں یہ تو بتا سکتا ہے کہ یہ چیز ایسی ہے یا ویسی ہے لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ دوسری طرح کی نہیں ہو سکتی۔ تجربہ اپنے فیصلوں کو حقیقی اور سچی عالمگیری شان نہیں عطا کرتا بلکہ استقرار کے ذریعہ سے ایک مفروضہ اور اضافی قسم کی عالمگیریت بخشتا ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تجربہ یہ کہتا ہے کہ جہاں تک مشاہدہ ہو سکا ہے اس قاعدہ میں کوئی استثنائی صورت نظر نہیں پڑی ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی فیصلہ آفاق گیری شان رکھتا ہے اور اس میں کسی استثنا کا امکان تجویز کیا جا سکتا تو یہ علم مستغنی عن التجربہ علم (Apriori) ہے۔"

اس کے بعد کینٹ نے یہ بتایا ہے کہ انسانی علم میں ایسے فیصلے ہیں جو حقیقت میں عالمگیری و آفاق گیری شان رکھتے ہیں اور اس لئے انھیں مستغنی عن التجربہ علم کہا جائیگا۔ ریاضیاتی مسائل اور دوسری چیزیں اس کی مثال میں پیش کی گئی ہیں۔

کینٹ کا اقتباس پیش کرنے سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اُس کی زبردست فلسفیانہ حیثیت سے ذہنوں کو متاثر کیا جائے۔ اس قسم کی "فکری تقلید" کی حکمت و فلسفہ میں گنجائش نہیں ہے اس کے پیش کرنے سے صرف یہ آتنا مدعا ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت یہ پہلو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ اور کینٹ نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اُسے نگاہ کے سامنے رکھا جائے۔ صرف یہ کہکر کہ کینٹ کا پورا تر دو فلسفی ہے اور اس لئے غیر قابلِ اعتنا کسی تنگ نظری سے کام نہ لیا جائے۔

درسِ عمل

(نتیجۂ فکر منشی سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی)

جھیل آزار مگر در پئے آزار نہ بن | دیکھ چلتی ہوئی پھرتی ہوئی تلوار نہ بن
کاروبار اپنا بنا خلق میں بے کار نہ بن | اس کا مطلب یہ ہے گرتی ہوئی دیوار نہ بن
ہے مناسب کہ تماشا کو تماشا ہی سمجھ | رہ کے دنیا میں بھی دنیا کا خریدار نہ بن
کہہ گئیں گلشنِ عالم کی ہوائیں مجھ سے | پھول بننا ہو تو بن پھولوں میں تو خار نہ بن
نفع کم اور زمانے میں خسارہ ہے بہت | مان کہنا سببِ گرمیٔ بازار نہ بن
ہم نے مانا وہ خطا پوش بہت ہے بسمل | پھر بھی ہے خیر اسی میں کہ گنہ گار نہ بن

جذباتِ اثرؔ

(از مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی، ایم۔بی۔ای وزیر ریاست کشمیر)

تیرے دہن کی بات چمن میں جو چل گئی
کلیاں چٹک رہی تھیں، صبا منہ مسل گئی

وہ نازِ دلبری ہے نہ سرگرمیِ نیاز
دنیائے حسن و عشق کی رُت ہی بدل گئی

کانوں پہ ہاتھ رکھتے قیامت کھڑی ہے دُور
شوخی ادا کے سانچے میں اس طرح ڈھل گئی

میں کہہ چلا تھا اُن سے محبت کا ماجرا
وہ تو کہو کہ بات ادھوری ہی ٹل گئی!

اُس آہ کو بھی کہتے ہیں بے درد بے اثر
اکثر جو بختِ خفتہ کی کروٹ بدل گئی

سہمی ہوئی تھی صبح کی پہلی کرن کی طرح
اُن کی طرف نگاہ جو پہلے پہل گئی

کچھ شرم، کچھ عتاب ہے کچھ سوچ ہے نہیں
کیا بات بیخودی میں زباں سے نکل گئی

ناوک ہزار بار قبول اُس نگاہ سے
جو دل میں کھبتے کھبتے یکایک مچل گئی

کہنے چلی ہے سوختہ جانوں کی داستاں
اے شمع کچھ خبر ہے زباں تیری جل گئی

کچھ اور بڑھ گئی ہیں پریشاں نگاہیاں
دم بھر جو تیرے غم سے طبیعت بہل گئی

دل ڈوبتا ہے آہ بھی کرنا محال ہے
کافر یہ کہہ رہا ہے طبیعت سنبھل گئی

مانوس میری یاد سے تیرا خیال ہے
یا شاخِ یاسمن کی شگوفوں سے پھل گئی

قطعہ

گویا کرن تھی چاند کی وہ شرمگیں نظر
آنکھوں سے جو اُترتے ہی دل میں پگھل گئی

دل سے بھر آئی آنکھوں میں اشکوں کے ساتھ ساتھ
اور پردے پردے میں دبے پاؤں نکل گئی

بیتابیاں جہاں تھیں سکون و قرار ہے
منظر بدل گیا، مری دنیا بدل گئی

تاریکیوں میں کھوئی ہوئی میری روح تھی
تم مسکرائے، نور کے سانچے میں ڈھل گئی

ہر سانس ایک تازہ سحر کا پیام ہے
مژدہ کہ معصیت کی شبِ تار ٹل گئی

کس منہ سے اتحاد کا دعویٰ کرے کوئی
اتنی دلوں میں کھوٹ ہے، بولی بدل گئی

پوچھو تو اُن سے جن کو جواہر میں ہے نظر
اِس طرح میں بھی طبعِ اثرؔ لعل اُگل گئی

صلائے عام

(نتیجۂ فکر حضرت شایق ہندو)

بادہ نوشو آؤ سیرِ عالمِ بالا کریں
اک ذرا چل کر مہ و خورشید کا سودا کریں

پھر سے زندہ کر دکھائیں اصطلاحِ جامِ جم
پھر سے رندی میں وہی حاصل ید طولیٰ کریں

پھر فروغ سینۂ مینا سے ہو چشمک ذرا
پھر تماشائے نمودِ وادیِ سینا کریں

پھر ہے کچھ اس طرح ہو حق کہ دنیا جی اٹھے
پھر جہاں میں عام اعجازِ دمِ عیسیٰ کریں

پھر شرار و شعلۂ ساغر سے کھیلیں اک ذرا
پھر زمانہ میں نیا پیدا یدِ بیضا کریں

پھر بساطِ میکشی پر ہوں دو زانو قبلہ رو
پھر ادائے فرضِ شغلِ ساغر و مینا کریں

پھر امامت میں ہو چشمِ مستِ جاناں کی نماز
پھر خمِ محرابِ طاعت ابروئے سلمیٰ کریں

پھر قیامِ صد ادب ہو اور رکوعِ صد نیاز
پھر جھک جائے جبیں جس سے وہ اک سجدا کریں

خلطِ مبحث سے تمیزِ کفر و ایماں ہے محال
آؤ معیارِ عبودیت نیا انشا کریں

قندِ پارسی

(غزل از مسٹر جلال الدین طالب)

ستم ارچہ رفت پیہم بسرِ من بغایت از تو
نرسید گاہ لیکن بلبم شکایت از تو

چو رخِ ترا ببینم برود مرا ز خاطر
بدلم اگرچہ باشد گلہ بے نہایت از تو

بزمانہ ہر کسی را بطبیعت است ذوقے
تو فسانہ دوست داری دلِ من حکایت از تو

بنما بسوئے خود رہ کہ مرادِ دل بیابم
تو بملکِ دل بکن جا سزد ایں ولایت از تو

بکشم ترا چو خواہم شبِ وصل تنگ در بر
چہ کنم بہ آں نزاکت کہ کند حمایت از تو

بہزار سالہ طاعت نتواں بتو رسیدن
ز کرم و لطفِ خاص ار نشود ہدایت از تو

بکدام رو تو طالب بروی بہ پیشِ داور
ہمہ عمر شد نہ کارے بجز از جنایت از تو

فانی کا فلسفۂ حیات و مرگ

(از حضرت محشر بدایونی)

حضرت فانی بدایونی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ موجودہ دور میں جبکہ حسرت جگر ور صفی جیسے اُستادانِ فنِ شعر و ادب کے نام ہندوستان کی لامحدود فضاؤں میں گونج رہے ہیں انی کا پایۂ شاعری بھی کسی سے نیچا نہ رہا۔ شاعر موصوف نے شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ کو نباہا۔ اور ں اُن کی کامیابی کا بڑا راز ہے۔ کون سا افسوں ہے جو اس شاعر باکمال نے نہیں پھونکا، کونسا جادو ہے اس ساحر نے نہیں جگایا۔ حضرت فانی کے نام سے نہ صرف اہل بدایوں و اہل دکن متعارف تھے بلکہ ان کے نات سوز و گداز سے ہندوستان کے چپہ چپہ کی فضائیں گونج رہی تھیں۔ آج جبکہ موت کی میٹھی نیند نے ن کو سکون ابدی بخش دیا ہے اُن کی صورت نگاہوں سے روپوش ہو چکی ہے، باوجود اس کے اُن کا نام ہمارے ول پہ ہمیشہ ہمیشہ نقش رہیگا۔ ہم ان کے کلام کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے بقول ساغر:

کلیم کو خدشۂ فنا کیا، اگر ہے اس کا کلام باقی
کہ شعریت بن کے زندگی کی رہے گا شاعر کا نام باقی

اب اسی مضمون کو خود ان کی زبان سے سنیئے:۔

ہمیں ابھی ترے اشعار یاد ہیں فانی — ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

فانی کا ہر شعر ایک چبھتا ہوا نشتر ہے جو دل کے پار ہو کر روح کو بیدار کرتا ہے۔ رگ رگ میں انقلاب پا کر دیتا ہے اور سوئی ہوئی اُمنگوں کو بیدار کر دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فانی کے یہاں جگر کی سی سرمستیاں نہیں پائی جاتیں محض موت کا رونا ہے، سرور و سرمستی کا کام انسان کو سلا دینا ہے نہ کہ غفلت کی نیند سے بیدار کرنا، اور نشترِ غم کا کام سوئے ہوئے جذبات کو چونکا دینا ہے۔ جب انسان کے جذبات کا طوفان اُمنڈنے لگتا ہے تو نفس میں مردانگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہڈیوں میں تلاطم، رگ میں اضطراب اور یہی اصل زندگی ہے۔ فانی کے مقابلہ میں کسی شاعر سرمست کو لانا دو متضاد چیزوں کا وزن کرنا ہے جو کچھ معنی نہیں رکھتا۔ فانی کو جس رنگ میں ملکہ حاصل ہوا وہ کسی دوسرے میں نہیں پایا جاتا۔

فانی نے خود کو ایک تصویرِ عبرت بنا کر عالم کو خوابِ زندگی کی تعبیر سے آگاہ کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

زندگی کی کشمکش پیہم سے گھبرا جانا بزدلی اور پست ہمتی کی دلیل ہے لیکن جس کی زندگی ہی موت ہو۔ وہ ایسی مرگ ساماں زندگی کو کیونکر قبول کر سکتا ہے۔ جس کو زندگیٔ ابدی کی تلاش ہے وہ زندگی فانی کے دام فریب میں کیسے گرفتار رہ سکتا ہے۔ فانی بھی بحر ہستی کو پار کر کے ساحل بقا کی راہ غم کے طوفان آشنا کشتی میں ڈھونڈھ رہے تھے

دارِ فانی میں یہ کیا ڈھونڈھ رہا ہے فانی زندگی بھی کہیں ملتی ہے فنا سے پہلے

یہاں اقبال کے بھی دو شعر ملاحظہ ہوں۔ زندگی کے اس فلسفہ میں وہ بھی فانی کے ہمزبان ہیں:۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے خواب کے پردے میں بیداری کا اِک پیغام ہے

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

اگر منظور ہے تجھکو خزاں نا آشنا ہونا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے (اقبال)

فانی کے چند شعر اور یاد آتے ہیں جو قریبًا ایک ہی مضمون کے حامل ہیں:۔

ہے موت ہی اک زندگیِ دل کا سہارا جینے کی جو ایسی ہی تمنا ہے تو مر جا

تعبیر اجل نے دی اِس خوابِ پریشاں کی ہم مر کے تجھے سمجھے لے ہستیِ انسانی

جدائی اہل وطن سے جو اذیت فانی کو پہونچی اس نے بھی اُن کی شاعری پر کافی اثر ڈالا مستقل طور سے وطن کا چھوٹ جانا بھی ایک محب وطن کے لئے قیامت سے کم نہیں۔ جا بجا ان کے اشعار میں وطن کی جدائی کا شکوہ ہے۔ ان کی زندگی کا غم میں مبتلا ہو جانے کا ایک یہ بھی سبب تھا جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے:۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھُلا کہ ہم ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دُور

ہمارے شاعر موصوف کی دُور بیں نگاہیں زندگی کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھیں، اُن کے نزدیک زندگی بجائے خود موت ہے اور زندگی کا ہر لمحہ غم کی جیتی جاگتی تصویر۔ ہر سانس ایک جنازہ ہے اور ہر لمحہ انسان کی موت ہے۔ یہاں چند اشعار جو ایک ہی مضمون کو لئے ہوئے ہیں قلمبند کرتا ہوں:۔

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

نامرادی حد سے گزری حال فانی کچھ نہ پوچھ ہر نفس ہے اک جنازہ آہِ بے تاثیر کا

اشعار مندرجہ بالا میں دوسرے شعر میں نفس کو "آہ بے تاثیر" کے جنازے سے تعبیر کیا ہے۔ اسی قسم کا ایک شعر اور ہے:۔

ہر نفس آہ اور انفاس پہ جینے کا مدار　　زندگی آہ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک جگہ فرماتے ہیں :-

ہر لمحہ حیات ہے بیگانۂ حیات　　فانی حیات ہی سے عبارت عدم نہ ہو

زندگی کی حقیقت پر اگر کچھ روشنی کوئی ڈال سکا ہے تو صرف اسی قدر کہ یہ ایک خواب ہے جس کی تعبیر موت ہے۔ اس نظریہ کے تحت جناب فانی کی رائے بھی ملاحظہ ہو :-

تجلیات وہم ہیں مشاہدات آب و گل　　کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

چکبست کا یہ شعر بھی فانی کے شعر کی تائید کرتا ہے ؂

یہ حیات عالم خواب ہے نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے
وہی کفر و دیں میں خراب ہے جسے علم راز جہاں نہیں

اِس میں کوئی شک نہیں کہ فانی نے زندگی کی حقیقت کو آئینہ کر دکھایا - ایک جگہ وہ زندگی کے معمہ کی عقدہ کشائی اس طرح کرتے ہیں :-

اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

یوں تو زندگی کو خواب سے بہت شاعروں نے تعبیر کیا ہے" لیکن دیوانے کے خواب" سے جو بات پیدا ہوئی وہ فانی ہی کا حصہ تھا۔ کچھ سخن فہم حضرات ہی اس چیز سے لطف اٹھا سکتے ہیں

غم بے حد نے فانی کو اس درجہ بیگانہ بنا دیا کہ ان کو غم و راحت کی تمیز بھی نہیں رہی جیسا کہ وہ فرماتے ہیں

مشکلوں سے جو مقابل ہوئی ہمت میری　　قدر باقی نہ رہی عیش و تن آسانی کی

فانی ازل کے دن سے ایک حساس طبیعت اور شاعرانہ دل و دماغ لیکر آئے تھے۔ اُردو شاعروں میں اُن کو جو بڑائی حاصل ہوئی وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مگر پھر بھی زمانے نے اُن کی اتنی قدر نہ کی جتنی کہ چاہیئے تھی اس چیز کو کچھ خود فانی ہی نے محسوس کیا اور بیساختہ اُن کو کہنا پڑا۔

افسانۂ دل یوں کوئی سنتا نہیں فانی　　اب موت کسی دن مجھے افسانہ بنا دے

ایک جگہ فرماتے ہیں :-

زمانہ بر سر آزار تھا مگر فانی　　تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

فانی کی زندگی اس درجہ غم و آلام میں گزری کہ آخر اُن کو یہی کہنا پڑا :-

عمر سب نزع کے عالم ہی میں گزری فانی　　زندگی کا نہ ہوا موت پہ احساں کوئی

صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ شعر بھی کس قدر عبرتناک اور درد انگیز ہے ،۔۔۔

موت وہ دن بھی دکھائے مجھے حسن فانی زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہوجائے

ہمارے سبقت شاعر نے ہستی انسانی کے مشکل مسئلے کو کس آسانی سے حل کیا ہے سہ،

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم میری ہستی ہے غیب کی آواز

یہاں غالب نے بھی ٹھوکر کھائی ہے، وہ اپنی ہستی کو محض "پردہ ساز کی آوازِ شکست" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں اور بس! لیکن فانی نے ہستی کو "غیب کی آواز" کہہ کر وہ بات پیدا کی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ صرف غیب کی آواز ہی کی تشریح اگر کی جائے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں۔ لیکن پھر بھی تشریح کے سیکڑوں پہلو باقی رہ جائیں، غالب کا شعر یہ ہے:۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

زندگی محض ایام گذاری کا نام نہیں بلکہ انسان کے تجربات ہی زندگی کے راز کے سمجھنے میں کسی حد تک مدد دیتے ہیں۔ ایک حقیقی شاعر وہی ہے جو اپنے زمانہ کا آئینہ دار ہو۔ فانی نے بھی اپنی غزلیات میں وہ وہ دقیقہ سنجیاں اور نکتہ آفرینیاں کی ہیں جن سے اُن کی زندگی کا مکمل جائزہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ اُن کی شاعری "شخصی عنصر" کی دولت سے مالا مال ہے۔ غزلیات کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی تڑپے ہوئے دل کی صدائیں ہیں، جو امتداد زمانہ کے باعث نالۂ وشیون کا عادی ہوچکا ہے حسن والفت کی دنیا میں بھی اُن کو غم کے مراحل طے کرنا پڑتے ہیں اور انتظار کی گھڑیاں بے چینی سے گزارتے ہیں۔ اب انتظار ہی اُن کی زندگی کا واحد مشغلہ ہے جیساکہ فرماتے ہیں:۔

فانی یقین وعدۂ فردا کو کیا کہوں اب زندگی ہے نام فقط انتظار کا

آخر کار فانی اس انتظارِ مسلسل سے تنگ آکر موت کا انتظار کرنے لگتے ہیں، مگر اس پر بھی:۔

"موت آتی ہے پر نہیں آتی"

غالب نے تو صرف اتنا ہی کہا تھا سہ

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

مگر فانی پر تکلیفوں کی بوچھار ابھی جاری ہے۔ اُن کی زندگی ابھی مصائب کی تگ و دو میں مصروف ہے فرماتے ہیں:۔

اپنی تو ساری عمر ہی فانی گزار دی اِک مرگِ ناگہاں کے غمِ انتظار میں

دنیا کے اس ہولناک اور تلاطم خیز سمندر میں جہاں مصائب کی پُرزور موجیں اور عسرت کی تُند آندھیاں انسان کو تنکے کی طرح بہالے جاتی ہیں، فانی کی کشتیِ حیات بھی ناخدا کی مدد سے بے نیاز خدا کے سہارے پر ع

"ابھرتی بیٹھتی دبتی دباتی اور چکراتی" چلی جا رہی ہے، ناخدا بار بار ڈبونے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ مگر فانی خدا پر کامل بھروسہ رکھتے ہوئے کڑک کر جواب دیتے ہیں:-

اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم، خدا بھی ہے
اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ

بالآخر زندگی کا خواب پورا ہو چکتا ہے اور وہ دن بھی آجاتا ہے جس کی پیشین گوئی انھوں نے بہت پہلے کی تھی:-

ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں
ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانی

اور اب بقول غالب:-

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

آخر میں ہماری زبان یہ کہے بغیر نہیں مانتی:-

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب!
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیئے تھا

مرنے والے! تیری کن کن خصوصیات کا ذکر کروں۔ اتنا کچھ لکھنے کے باوجود بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ کچھ نہیں لکھا۔ تو اب ہم میں نہیں مگر تیری یاد تیرے اشعار کی بدولت ہمارے دلوں میں ہے اور ہمیشہ باقی رہیگی

صفحۂ ہستی سے تیرا نام مٹ سکتا نہیں

تیری زندگی غم کی زندگی تھی اور اب ع مدعائے زندگانی مرکے حاصل ہو گیا" ناممکن ہے کہ ہم تیری شاعرانہ خوبیوں پر نمایاں روشنی ڈال سکیں، اتنا کہنا کافی ہے کہ:-

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

حسرت امروز

موڑ پر دادی ہی کی میں نے کیا تھا ہو خیار
لیکن اُس دم حیف! کیا مجھ ہی پر تو تھے نہ تھے؟

آج جب ہو ہو کے عریاں نقش ہر ظاہر ہوا
حسرتیں خود ہاتھ ملتی ہیں کہ کیوں مانے نہ تھے؟

گریۂ پیہم

مجھ سے کل اس گریہ وزاری پہ ہمدم نے کہا
بات کیا یاس ہر اک قبر کے روتے ہو تم

کیا سمجھتے ہو کہ ہیں مالک کی یہ قبریں سبھی
اور نہیں تو جیب کیوں اشکوں سے بھر دھوتے ہو تم

اس پہ میں بولا کہ تم واقف نہیں اس راز سے
اور یا پھر جن کے ناواقف سے سمجھاتے ہو تم!

غم کی اک ادنیٰ کھٹک زخموں پہ پچھلے ضرب ہے
کرب سے بچیں ہوں کہتے ہو کیوں روتے ہو تم

میری خاطر تو یہ کل قبریں ہیں مالک کا مزار
چھوڑ دو مجھ کو یہ کیوں صبر غلط دیتے ہو تم

(ماخوذ از عربی)

(بندھو لال فیروز)

بھادوں

(از حضرت نشور واحدی، کانپوری)

کوئل کی سُریلی تانوں پر تھم تھم کے پپیہا گاتا ہے حل ہو کے ہوا کی موجوں میں بھادوں کا مہینا آتا ہے

ٹھنڈی پُروا، کالا بادل، برسا تو برستا جاتا ہے بوندوں کی مسلسل چوٹوں سے پتہ پتہ تھرّاتا ہے

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے، ایسے میں کوئی یاد آتا ہے

گھنگھور گھٹا بجلی پانی، دل سینے میں لہراتا ہے

صحرا میں ہوا بل کھاتی ہے، بادل کو صبا سُنکاتی ہے پانی سے زمیں نرماتی ہے، سبزوں سے فضا لہراتی ہے

رم جھم رم جھم تھم تھم تھم تھم بوندوں کی صدا جب آتی ہے ہر بوند سے دل کے تاروں پر اک چوٹ سی پڑتی جاتی ہے

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے، ایسے میں کوئی یاد آتا ہے

گھنگھور گھٹا، بجلی، پانی، دل سینے میں لہراتا ہے

رنگیں گلشن، رنگیں صحرا، رنگیں دنیا، رنگیں باتیں ناچیں، کھیلیں، دوڑیں، بھاگیں، راتوں جاگیں نیند دنوں ماتیں

کیا قہر ہیں ظالم برساتیں، کیا قہر ہیں ظالم برساتیں بھیگی دنیا، بھیگی سانسیں، بھیگے ارماں، بھیگی راتیں

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے، ایسے میں کوئی یاد آتا ہے

گھنگھور گھٹا، بجلی، پانی، دل سینے میں لہراتا ہے

بدلی کے دنوں میخانوں میں صہبا کی روانی کیا کہنا راتوں کے شراب و شاہد سے پلکوں کی گرانی کیا کہنا

ہر وقت سُہانا کیا کہنا، ہر رات سُہانی کیا کہنا برسات کے بھیگے لمحوں میں شاداب جوانی کیا کہنا

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے، ایسے میں کوئی یاد آتا ہے

گھنگھور گھٹا، بجلی، پانی، دل سینے میں لہراتا ہے

بھادوں جو چڑھا پھر باغوں اور جھونکوں کی باتیں ہوتی ہیں گلشن کی رنگیں سیروں میں کچھ رنگیں گھاتیں ہوتی ہیں

جب عہد جوانی کی ٹھنڈی برساتیں ہوتی ہیں متوالی عمریں ہوتی ہیں، متوالی راتیں ہوتی ہیں

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے، ایسے میں کوئی یاد آتا ہے

گھنگھور گھٹا، بجلی، پانی، دل سینے میں لہراتا ہے

گرشاسپ نامہ

(از اقبال انصاری، ایم۔ اے ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی)

یہ اسدی طوسی کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر ایتھے اور پروفیسر براؤن کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اسدی دو گذرے ہیں جن میں ایک دوسرے سے باپ بیٹے کا تعلق تھا اور تخلص اسدی دونوں میں عام تھا۔ اسدی (کلاں) کا نام ابو نصر احمد بن منصور طوسی ہے جو صاحب مناظرہ ہے۔ دوسرا اسدی (خرد) اس کا فرزند ہے جس کا نام علی بن احمد الاسدی الطوسی ہے اور گرشاسپ نامہ و "نعت الفرس" کا مصنف یہی ہے۔ آقائے نفیسی اسدی (کلاں) کے وجود سے منکر ہیں (مجلہ شرق بابت صفر ۱۳۴۹ھ) اور یہی خیال پروفیسر محمود شیرانی کا بھی ہے (رسالہ اردو، اپریل ۱۹۲۳ء) لیکن وہ یورپین تحقیقات کی وجہ سے اس کے وجود کو مان لیتے ہیں۔

دونوں باپ بیٹے کا ایک ہی تخلص ہونے کی وجہ سے صاحبان تذکرہ کو مغالطہ ہوا اور دونوں کے حالات میں گڑبڑ کر دی گئی ہے۔ اسدی (خرد) کو جو فردوسی کے بعد پچاس سال تک زندہ رہا بعض نے فردوسی کا اُستاد مانا ہے اور وہ آخری چار ہزار بیت اُسی کی جانب منسوب کرتے ہیں دولت شاہ لکھتے ہیں "اورا بہ کرات تکلیف نظم شاہنامہ کردہ اند واستعفا خواستہ بہ پیری وضعیفی را بہانہ ساختہ"۔ صاحب مجالس المومنین کہتے ہیں "فردوسی را نظم شاہنامہ اشارت میکردہ" آذر فردوسی کی شاگردی کو مسلم مانتے ہوئے لکھتے ہیں "چوں زمانِ وفات فردوسی نزدیک رسید اسدی را احضار کردہ گفت اے اُستاد قدرے از نظم شاہنامہ باقی ماندہ ومی ترسم چوں ازیں عالم بروم کسے تواند بنظم آں بپردازد۔ اسدی (خرد) گفت اے فرزند غمیں مباش کہ اگر عمرش باقی باشد باتمامش رسانم۔ فردوسی گفت ایں امر مشکل از تو بظہور پیوندد۔ اسدی در دو روز چہار ہزار بیت گفتہ بنظر فردوسی گذرانید۔ وصلہ وتحسین یافت"

مگر آذر کی یہ روایت کئی وجہ سے قابل قبول نہیں ہے، پہلی تو یہ کہ دو دن میں چار ہزار شعر کہنا محل نظر ہے۔ دوسرے یہ کہ گرشاسپ نامہ کی تفصیل خود ان باتوں کی تکذیب کرتی ہے۔ تیسرے یہ کہ فردوسی کی وفات بقول شبلی ۴۱۱ھ میں ہوئی اور صاحب گرشاسپ نامہ یعنی اسدی (خرد) ۴۶۵ھ

میں مرا۔ چوتھے یہ کہ شاہنامہ سنہ ۴۰۰ھ میں مکمل ہوا جیسا کہ خود فردوسی کہتا ہے:-

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار
که گفتم من این نامۂ شہریار

ان صورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر فردوسی کی عمر اسّی برس بھی مان لیں تو سنہ ۴۰۰ھ میں اسدی محض طفل ہی رہا ہوگا اور شاہنامہ جیسی کتاب کی خدمت اُس کے سپرد کرنا اور بھی خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اب اس اسدی (خرد) کے باپ اسدی (کلاں) کو لیجئے تو اُس پر بھی آذر کے بیان کردہ قول کی مطابقت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اسدی (کلاں) کی وفات سلطان مسعود حسین غزنوی کے عہد میں ہوئی۔ اگر یہ بھی فرض کر لیں کہ سلطان مسعود کی حکومت کے ابتدائی سال یعنی سنہ ۴۲۲ھ میں وہ اسّی برس کے سن میں مرا تو سنہ ولادت سنہ ۳۴۲ھ نکلتا ہے اور بقول پروفیسر نلدکہ فردوسی کی ولادت سنہ ۳۲۳ھ یا ۳۲۴ھ میں ہوئی اور اس صورت میں فردوسی اسدی (کلاں) سے بھی تقریباً ۲۰ سال بڑا ہوا۔ پس ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں اسدیوں میں سے کسی سے بھی اُس نے اکتساب کمال سخنوری کیا ہو۔ اس کے علاوہ اسدی (کلاں) کوئی غیر معمولی شاعر بھی نہیں اور نہ کوئی اسکی عظیم الشان تصنیف موجود ہے صرف چار مناظرات ہیں جن کا مجموعہ ۱۶۵ اشعار سے زیادہ نہیں ہے۔

بہرحال گرشاسپ نامہ اسدی (خرد) کی تصنیف ہے جس کے متعلق نور اللہ شوستری لکھتے ہیں "در رسالۂ فرہنگ گوید نامم علی ابن احمد الاسدی طوسی است و نسب من با شاعر ہم رسد"۔ رشید یاسمی کے پاس لغت کا جو نسخہ (مطبوعہ) ہے اُس سے یہ نام نہیں معلوم ہوتا۔ اور مؤلف کی کنیت و نام حسب ذیل عبارت سے صحیح ہو جاتی ہے:-

دیباچۂ لغت "بدانکہ فخر مردم بر جانوران دیگر بسخن گفتن است و سخن را تمامی بمعنی است و آں دو گونہ آمدے یکے گونہ نظم است و دیگرے نثر و اندر کتاب منطق آنچہ از بابت سخن گفتن باشد ہمہ گفتہ اند و غرض اندریں لغات پارسی است کہ دیدم شاعران را کہ فاضل بودند لیکن لغات پارسی کم میدانستند و قطران شاعر کتابے کرد و آں لغتہا بیشتر معروف بودند۔ پس فرزندم حکیم خلیل او حد اردشیر بن دیلم سپار النجمی الشاعر ادام اللہ عزہ از من کہ ابو منصور بن علی بن احمد الطوسی ہستم لغت نامۂ خواست چنانکہ بر ہر لغتے گواہی بود از قول شاعر فاضل"۔ لیکن ویانا لائبریری میں اسدی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب "الابنیہ عن الحقائق الادویہ" مصنفہ حکیم ابو منصور موفق بن علی ہروی موجود ہے اور اس میں اُس نے اپنا نام یوں لکھا ہے "علی بن احمد الاسدی الطوسی الشاعر" یہ نسخہ سنہ ۴۴۷ھ میں نقل ہوا۔

اسدی کے نام کو زندہ رکھنے والی چیز نہ اُس کا لغت مسمّٰی بہ "لغت الفرس" ہے اور نہ کتاب الابنیہ عن الحقائق الادویہ کی تنسیخ ہے بلکہ گرشاسپ نامہ ہی اس کو زندہ کئے ہوئے ہے۔ اُسکی

تصنیف کے متعلق خود شاعر نظم میں بیان کرتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ۴۵۶ھ میں نخجوان میں ابو دلف کر کری کے یہاں گیا۔ ایک روز بادشاہ کے وزیر محمد بن اسمٰعیل اور وزیر کے بھائی موسوم بہ ابراہیم نے اسدی کو اپنی صحبت میں بلایا۔ دوران گفتگو میں آثار شعراء اور کتب تواریخ کا بھی ذکر آیا، چنانچہ سب نے تعریف کی کہ شاہنامہ بہت ہی اچھی کتاب ہے۔ اس تعریف کا یہ مطلب تھا کہ اپنے ہموطن کی طرح وہ بھی کوئی قدیم واقعہ نظم کرے اور بہتر یہی ہے کہ چونکہ فردوسی نے گرشاسپ شاہ کے متعلق بہت کم لکھا ہے لہذا اسی کی داستان لکھی جائے اور ایسی ہو کہ رستم کو بھی گرد کردے، بادشاہ نے بھی وزیر کی تائید کی۔ پس اسدی نے گرشاسپ نامہ نظم کیا اور انتساب وزیر ہی کے نام پر کرنا چاہا لیکن بادشاہ نے اس کا انتساب اپنے نام سے کرایا۔

گرشاسپ نامہ کے واقعات نہایت سادہ ہیں۔ اس میں گرشاسپ نامہ کی چین و ہندوستان و روم کی جنگوں کے واقعات ہیں۔ یہ بھی شاہنامہ کی طرح بحر متقارب ہی میں لکھا گیا ہے، اور بعضوں نے اسے شاہنامہ سے بہتر سمجھا ہے لیکن تمام پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے ہم اسے صحیح نہیں مان سکتے۔ فردوسی و اسدی میں بہت فرق ہے، یہ فرق دونوں شاعروں کی طبیعت و زمانہ کا سمجھنا چاہیے اور اگرچہ بعض مقامات پر مضامین دونوں کے یہاں عام ہیں لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور بقول پروفیسر محمود شیرانی "فردوسی خدائے سخن ہے مبتدی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

اگر ہم ذرا بھی غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ سامانیوں سے سلجوقیوں تک کا زمانہ ایسا تھا کہ جس میں دو ہی قسم کا ادب رواج پاسکتا تھا یعنی شجاعانہ اور مدحیہ۔ چنانچہ اس زمانہ کے شعراء کے قصیدوں سے ظاہر ہے کہ مدح میں وہ مناسب حدود سے باہر نکل گئے ہیں۔ دوسرا رزمیہ ادب ہے جس کی بنیاد رودکی، ابو شکور اور دقیقی جیسے معماران سخن نے ڈالی۔ فردوسی نے اسے بہت رفیع الشان بنایا۔ اسدی نے اس کی پیروی کرتے ہوئے ہلکے رنگوں میں بیل بوٹے اور نقش و نگار بنائے اور نظامی نے حسن و خوبی کو درجۂ کمال پر پہونچا دیا۔ نظامی اگرچہ فردوسی کی گرد قدم کو بھی نہیں پہونچتے جیسا کہ علامہ شبلی کے بیان سے ظاہر ہے لیکن پھر بھی یہ کہنا پڑیگا کہ سکندر نامہ بڑی حد تک گرشاسپ نامہ سے آگے بڑھ گیا ہے۔ مثلاً اس میں وہ تمہیدیں کہاں جو نظامی کے یہاں ہیں جیسے نظامی سے

علم برکش اے آفتاب بلند ۔۔۔ خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
بیار اے ہوا قطرۂ ناب را ۔۔۔ بگیر اے صدف دُر کن آں آب را
بر آے دُر از قعر دریائے خویش ۔۔۔ بتاج سر شاہ کن جائے خویش

نظامی کے یہاں استعارات میں جو ندرت ہے، تشبیہات میں جو لطافت ہے وہ گرشاسپ نامہ میں معدوم ہے، مثلاً دارا جب زخم کھا کر گرا، اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

بہارِ فریدوں و گلزار جم ببادِ خزاں گشتہ تاراج غم
نسب نامۂ دولت کیقباد ورق بر ورق ہر سوئے بُرد باد

نظامی کے یہاں ترکیبوں کی چستی، قافیوں کی بلندی اور الفاظ کے شکوہ کا وہ عالم ہے کہ بعض مقامات پر فردوسی بھی ان سے پیچھے دکھائی دیتا ہے، مثلاً دارا سکندر سے خراج وصول کرنے کے لئے قاصد بھیجتا ہے، سکندر یہ سنکر غصہ سے سرخ ہو جاتا ہے اور جواب دیتا ہے ؎

مگر شہ نداند کہ در روزِ جنگ چہ سرہا بریدم در اقصائے زنگ
بیک تاختن تا کجا تاختم بہ گردن کشاں را سر انداختم

بامرتے وقت دارا نے سکندر سے جو کہا ہے وہ بھی شاہانہ عظمت کا پہلو لئے ہے ؎

زمیں را منم تاج تارک نشیں ملرزاں مرا تا نلرزد زمیں

ان تمام خوبیوں میں گرشاسپ نامہ، سکندر نامہ کے برابر بھی نہیں، اور اوصاف میں فردوسی و دقیقی کی شاعری سے اس کا مقابلہ بیکار ہے، لیکن خود اسدی شاعرانہ تعلّی میں اپنی تصنیف کو بہترین مانتا ہے ؎

ز گویندگانِ کشتاں نیست جفت نجوشی چناں داستاں کس نگفت

گرشاسپ نامہ ۵۸ھ کی تصنیف ہے جبکہ منوچہری کا رنگ شاعری پر غالب ہو چکا تھا، چنانچہ اسدی اور قطران دونوں کی شاعری میں منوچہری کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ دونوں کے یہاں صنائع و بدائع کا التزام اور تشبیہات و استعارات و خیالات کے اظہار میں غیر معمولی تکلف پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اسدی نے مناظر کشتی اور جذبات کشتی میں بھی کہیں کہیں اعجاز سے کام لیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی توجہ اس مثنوی میں وعظ و نصیحت کی طرف زیادہ رہی ہے اور پند و نصائح ہی اس کا اصل موضوع ہے۔ قصہ اور شاعرانہ توصیفات فروعی چیزیں ہیں لہذا گرشاسپ نامہ کی عظمت قصہ و مثنوی کی حیثیت سے کم ہے۔ ہاں اخلاقی کتاب ہونے کے سبب یہ بہت ہی عظیم و گراں قدر تصنیف ہے۔ چند پند و نصائح گرشاسپ نامہ سے منتخب کر کے لکھے جاتے ہیں

نام

انوشہ کسے کو نکو نام مرد چو ایدر تنش ماند نیکی ببرد

که مانند نکوکاری ایدر بجائے　　بود با تو نیکی بہ دیگر سرائے
نکونامی از گیتی آں را سزاست　　کہ کردار او خوب و گفتار راست

کوشش

بخانہ نشستن بود کار زن　　برون کار مردانِ شمشیر زن
نشاید بہی یافت بے رنج و بیم　　کہ بے رنج نارد کس از سنگ سیم
بدریائے ژرف آنکہ جوید صدف　　بباید ش جاں بر نہادن بکف
بزرگی یکے گوہرِ پُر بہا ست　　ورا جائے در کامِ نر اژدہاست

زن

زناں راز ہر خوبی و دسترس　　فزوں ترہنر پارسائی است و بس
ہر آنکس نترسد ز دستانِ زن　　از و در جہاں رائے دانش مزن
ز دستانِ زن ہر کہ نا ترسکار　　رواں با خرد نیستش سازگار
کہ موید چنیں داستاں زد ز زن　　کہ با زن درِ راز ہرگز مزن

انسان و طبیعت

اگرچند پنہاں کند مرد راز　　پدید آوردش روزگار دراز
ہر آنکہ کہ آمد زمانہ فراز　　نگردد بمردی و اندیشہ باز
زمین است آما جگاہِ زماں　　نشانہ تنِ ما و چرخش کماں
اگر پند پوئی و جوئی بسے　　زگیتی بے اندُہ نیابی کسے

غزل حضرت دل شاہجہانپوری

روحِ نشاط، بادۂ اطہر کہیں جسے　　کوثر کی موج گردشِ ساغر کہیں جسے
فردوسِ شوق، کوچۂ دلبر کہیں جسے　　رعنائیِ خیال کا منظر کہیں جسے
اہلِ گناہ حسن کا منظر کہیں جسے　　تیرا ہی عکسِ رخ ہے گلِ تر کہیں جسے
تا ساحلِ مراد پہونچتے ہیں تشنہ کام　　موجِ فنا ہے جنبشِ خنجر کہیں جسے
اے جوشِ گریہ دامنِ رسوا سے بے نیاز　　ایسا بھی کوئی اشک ہے گوہر کہیں جسے
کیفِ محیط اس کا ہر انداز بے حجاب　　ایمانِ عشق چشمِ فسوں گر کہیں جسے
یہ کیف کشتگانِ محبت سے پوچھئے　　اک مژدۂ حیات ہے خنجر کہیں جسے

نور جہاں کا مزار دیکھکر

(از جناب سید اعجاز حسین ایم۔اے۔ لکچرار الہ آباد یونیورسٹی)

یہ اداسی یہ بھیانک شام کیسا ہے سماں
اے دلِ ناعاقبت اندیش تو لایا کہاں

ہو کا عالم اور ویرانہ ہے کس کا مقبرہ
اُف یہ تاریکی کہ کوسوں روشنی ہے لاپتہ

بیکسی جاروب کش ہے کس مپرسی نوحہ خواں
گردشِ چرخِ کہن اعجاز اس کی پاسباں

سبزۂ بیگانہ ہے غمخوار اور کوئی نہیں
ساتھیوں میں ہیں درو دیوار اور کوئی نہیں

شمع و گل کا ذکر کیا اب سنگِ تربت بھی ہے دُور
اُف یہ منظر دیکھکر ہے شیشۂ دل چُور چُور

اللہ اللہ مرقدِ نورِ جہاں بے نور ہے
کیا یہی نیرنگیٔ عالم ترا دستور ہے؟

تجھ کو تو ہوگی خبر، یہ کون ہے نورِ جہاں
جس کو کہتا تھا جہانگیر ابن اکبر جانِ جاں

صاحبِ حُسن و ادا جانِ جہاں نورِ جہاں
صنعتِ قدرت کا نقشہ نازشِ ہندوستاں

جس نے در پردہ حکومت ہند پر کی مُدتوں
آہ اُس کی قبر پر اے ہند شمع و گل نہ ہوں

اس بساطِ ہند پر جس کی سیاست نقش ہے
قلبِ شاہی پر ابھی جس کی فراست نقش ہے

چاند بی بی رضیہ و جھانسی کی رانی تھیں، مگر
سلطنت کی ہند پر اس نے بہ اندازِ دگر

جس کے دم سے تھی جہانگیری کو تابانی یہاں
جس کی حُسنِ رائے سے ہوتی تھی سلطانی یہاں

حُسن کا پرتو ہوں جس کے یہ نشاطِ "شالامار"
ایک نقشِ بیکسی، بیہات ہو اُس کا مزار

تیرے دامن پر یہ اک دھبہ ہے اے ہندوستاں
عظمتوں کی صنفِ نازک کا نہیں تو قدر داں

کوہ و صحرا کو سجا کر جس نے جنت کر دیا
اُس کو ظالم آسماں دیتا ہے ٹوٹا مقبرا

سلطنت جس کے قدم پر سر جھکاتی تھی کبھی
آج اس کی انجمن اس طرح ہو اُجڑی ہوئی

اللہ اللہ انقلابِ دہر یہ رنگینیاں
یہ ادائے دلبری گا ہے چنیں گا ہے چناں

کہہ رہی ہیں قبر کی خاموشیاں یہ دیر سے
'بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے'

اُف رگِ جاں کے لئے نشتر ہے یہ آواز بھی
سخت دل تھا رو دیا لیکن یہاں اعجاز بھی

شدتِ جذبات سے پیشانی اس کی جھک گئی
گریۂ خاموش ہے کیا دل کی حرکت رُک گئی

چومتا ہے قبر کو دیوانگی کا جوش ہے
یہ پرستش یہ عقیدت آہ کیا بے ہوش ہے

مَیں اور تو

(از راجہ مہدی علی خاں)

دریچہ جب اُفق کا کوئی آکر کھول جاتا ہے ـــ نکل کر آسماں پر ماہِ سیمیں جگمگاتا ہے
لرز جاتی ہے گھبراتی ہے تھرّاتی ہے تاریکی ـــ سمٹ جاتی ہے چھٹ جاتی ہے چھپ جاتی ہے تاریکی
ترستی ہے کہ روشن چاند کو میں چوم لوں جاکر ـــ پلٹ جاتی ہے لیکن دیکھتے ہی اس کو گھبراکر
نہیں ممکن کبھی وہ اس سے ہم آغوش ہو جائے ـــ وہ تاریکی ہے کیسے نور کے طوفاں کے پاس آئے
ابد تک بھی وہ روشن چاند کے پاس آ نہیں سکتی ـــ اور اس کے سیمگوں عارض کا بوسہ پا نہیں سکتی

رہیں گے عمر بھر یونہی جدا اک دوسرے سے ہم
کہ مل سکتے نہیں نور اور تاریکی کبھی باہم

مطربہ!

(حضرت الطاف مشہدی)

اے حسینہ مطربہ، وجہِ قرارِ زندگی ـــ تیرے ہر انداز سے پیدا ہے سحرِ سامری
بن کے دیپک جب جہانِ عشق پر چھاتی ہے تو ـــ روح میں بیتابیوں کی آگ بھڑکاتی ہے تو
تیرے نغمے جب بکھرتے ہیں ہوا کے دوش پر ـــ بجلیاں بن بن کے گرتے ہیں متاعِ ہوش پر
لیکے انگڑائی کبھی جب سامنے آتی ہے تو ـــ دل میں میٹھی راگنی بن کر اُتر جاتی ہے تو
تجھ سے بڑھکر ہے کہیں تیری فسونکاری کی شان ـــ چاند کے اوصاف میں جیسے ضیاباری کی شان

رشک کرتا ہوں میں اس نغموں بھری تقدیر پر
ہے خجل زہرا بھی تجھ سے آسمانِ پیر پر

کیفِ غم

(از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی)

کس قدر مرہونِ منت ہوں ترا اے کیفِ غم
مِل رہی ہے تجھ سے کیا کیا لذتِ رنج و الم

ہو رہا ہے اک عجیب احساس کا دل میں ظہور
یعنی ہو جس طرح صہبا کا خمار آگیں سُرور

جو خیالِ اُمید میں ہوتا ہے یا جو یاس میں
جذب ہو جاتا ہے وہ جا کر اسی احساس میں

جیسے دریا خوب دکھلاتا ہوا جوش و خروش
بحر سے ملتے ہی ہو جاتا ہے پھر یکسر خموش

جیسے نغمہ اُٹھ کے اپنی ہی بلند آواز میں
دِل ہلا دیتا ہے اور ہوتا ہے گم پھر ساز میں

بس یہی حالت ہے میرے بھی نئے جذبات کی
اس بدلتے رہنے والے دہر کی ہر بات کی

جو مری رگ رگ میں پیدا کر کے ہلچل ایک بار
جلد ہی پاتی ہے محویت کے عالم میں قرار

کیسی محویت؟ وہ محویت کہ جس کے جوش میں
بیخودی کی سی ہے کیفیت دِلِ مدہوش میں

کیسی محویت؟ جو خود اپنے ہی دَم سے ہے بنی
جو سراپا شدتِ احساسِ غم سے ہے بنی

وہ غمِ بیحد کہ جس سے حال ہوتا ہے زبوں
جو پھر اپنی ہی گرانباری سے پاتا ہے سکوں

وہ سکوں جس میں مُخل پھر کوئی ہو سکتا نہیں
ہاں خوشی تو کیا، نہیں غم کی بھی گنجائش کہیں!

اُس سکوں نے یہ اثر اپنا ہویدا کر دیا
اِک توازن سا مرے باطن میں پیدا کر دیا

وہ توازن دل مرا جس کا تمنائی بنا
چھوڑ کر سب کچھ اُسی کا ہے وہ شیدائی بنا

بس مجھے اب ہر نفس اپنی ہی دھن سے کام ہے
اور ہے آرام اسی میں، گو عجب آرام ہے

شادمانی تو کبھی میں اس کو کہہ سکتا نہیں
آہ اب اُس کا نشاں بھی مجھ میں رہ سکتا نہیں

فرطِ شادی سے بھی آتے ہیں کبھی آنسو نکل
جس قدر ہوتا ہے اُن میں رنج کا مخفی عمل

میرے غم میں ہے خوشی کے بس نشانی اُتنی ہی
یعنی ہے اس طرح مجھ میں شادمانی اُتنی ہی

خیر جو کچھ ہے بہر حال اب غنیمت ہے وہی
بیش ہو یا کم مری تسکیں کی صورت ہے یہی

ہاں اُسی سے کرب کی حالت میں بھی آرام ہے
"کیفِ غم" اپنی زباں میں سحرؔ اسی کا نام ہے

آگے جاؤ[1]

افسانہ

(از ڈاکٹر اعظم کریوی)

ہرنجن پور کے مکھیا شبراتی میاں نوجوانی میں سید پور بہت جاتے تھے، اُن کے گانوں سے سید پور بس بارہ میل تھا، جب اُنھیں کسی کام سے الٰہ آباد شہر جانا ہوتا تھا تو وہ سید پور کی طرف سے ضرور گزرتے اور اپنے ایک ہم عمر دلی دوست نجف اشرف عرف نجّن میاں زمیندار کے یہاں دو ایک روز کے لئے ضرور ٹھہرتے یہ ناممکن تھا کہ شبراتی میاں سید پور سے گزریں اور نجّن میاں اُنھیں نہ روکیں۔ اور پھر لاسہ "گلّی ڈنڈا" اور "پہاڑی ٹلّو" ایسے دیہاتی کھیل نہ کھیلے جائیں۔ مگر "یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا"۔ ادھر چالیس سال ہوگئے اور شبراتی میاں کو سید پور جانے کا اتفاق ہی نہ ہوا۔ پہلے اُن کے گاؤں کے قریب کوئی ریلوے اسٹیشن نہ تھا مگر اب وہ رام چورا روڈ اسٹیشن سے جو اُن کے گاؤں سے قریب ہی تھا سیدھے الٰہ آباد چلے جاتے تھے، سید پور کی طرف سے جانے میں تکلیف کے ساتھ ساتھ زیادہ خرچ بھی پڑتا تھا۔

چالیس سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا، زمانے میں سیکڑوں انقلابات ہوئے۔ بچّے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے، گاؤں اُجڑے اور شہر بس گئے۔ پُرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب نے لی، اب شبراتی میاں کا زمانہ تھا۔ اب غیروں کا کیا ذکر اُنھیں کی اولاد اُن ہی کے سامنے کہا کرتی تھی کہ "بابا سٹھیا گئے ہیں" شبراتی میاں سب کچھ سنتے تھے دیکھتے تھے مگر دم بخود تھے۔ گو ساٹھ سے زیادہ ان کی عمر ہو چکی تھی پھر بھی ان میں موجودہ زمانے کے نوجوانوں سے زیادہ دَم خم تھا۔ نہ تو وہ عینک لگاتے تھے اور نہ اُن کی سماعت میں کوئی فرق آیا تھا۔ دانتوں میں پائریا کا بھی روگ نہ تھا۔ مزے سے آسانی کے ساتھ چنا چبا چبا کر گانوں کے نوجوان لڑکوں کی کمزوری پر لطیف پیرایہ میں مذاق اڑایا کرتے تھے: "آجکل کے لڑکن (لڑکوں) کا تو پھونک مار دیو ہوا میں اُڑ جائیں...... مَیں جب جوان رہوں (تھا) تو بھینسہ کا ایک گھونسہ ماں گرائے دیوں رہا (میں گرا دیا تھا)...... بڑی بڑی کشتی ماریوں رہا (مارا تھا)...... تم ایسن کا تو میں اکیلو کافی ہوں (تمہارے جیسے نوجوانوں کیلئے تو میں اب بھی کافی ہوں)......"

[1] یہ افسانہ میں نے اپنے لخت جگر مہتاب احمد کی یاد میں لکھا ہے جو ۱۲ جون سنہ ۴۱ء کو جبکہ وہ بائیسویں سال میں تھا اور امسال بی۔اے کا امتحان دینے والا تھا نہر گنگ میرٹھ میں نہاتے ہوئے ڈوب کر اللہ کو پیارا ہو گیا (اعظم کریوی)

نوجوان لڑکے شبراتی میاں کی باتیں سُن کر آپس میں کہا کرتے تھے کہ بڈھے کو اب ڈینگ مارنے اور گپ اُڑانے کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ان کے گاؤں میں ایک لڑکا بی۔اے پاس کر چکا تھا وہ کہتا تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے" وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا" اب جسمانی قوت نہیں بلکہ دماغی طاقت کی زیادہ ضرورت ہے، یہ بڈھے تو زمین کے لئے بوجھ ہو رہے ہیں، فوج میں جہاں کوئی گھوڑا پندرہ سال کا ہوا اور اُسے " ضعیف و ناکارہ " کہہ کر گولی مار دیا جاتا ہے۔ یہ کساد بازاری کا زمانہ ہے اقتصادیات کا تو یہی تقاضہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو گورنمنٹ اس قسم کا قانون بنا کر ضعیفوں اور ناکاروں سے دنیا کو صاف کر دے۔ گریجویٹ کی منطق گاؤں کے لڑکے نہ سمجھ کر بھی ہاں میں ہاں ملا دیتے لیکن شبراتی میاں کا خیال تھا کہ آجکل کے نوجوان تو بس اس قابل ہیں کہ کھیت کھلیان کے بجائے گرہستی کا کام لیا جائے، یا ان سے چوخا کتا یا جائے، ممکن ہے کہ وہ شہر جا کر کرسی پر بیٹھ کر گٹ پٹ کرلیں، لیکن ہل چلانا اور کھیتی باڑی کا کام کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ نوجوانوں کے ساتھ بڈھے شبراتی میاں کی چھیڑ چھاڑ میں گاؤں والوں کو بہت مزہ آتا تھا۔ اس ضعیفی میں بھی شبراتی میاں گاؤں کے مکھیا ہوتے ہوئے بھی کھیتی باڑی کا کام خود کرتے تھے۔ ان کے بیٹے اور پوتے ان کاموں سے دُور بھاگتے تھے۔

شادی ہو یا غمی شبراتی میاں پیش پیش رہتے تھے، کسی کو ان کے مشورہ کی ضرورت ہو یا نہ ہو مگر شبراتی میاں ہمیشہ اپنا مشورہ دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ انھیں جو کچھ کہنا ہوتا تھا وہ بلا تکلف کہہ دیتے تھے کسی کو اچھا لگے یا بُرا اُن کی بلا جانے۔ اُن کے ہم عمر تو شبراتی میاں کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تھے لیکن گاؤں کے لڑکے ظاہر میں تو نہیں لیکن باطن میں ان کی باتوں کو بڑھے کی بکواس سمجھتے تھے۔

(۲)

دن یوں ہی گزر رہے تھے کہ ایک مرتبہ اتفاق سے شبراتی میاں کا گزر سید پور کی طرف ہو گیا۔ پہلے ریلوے لائن سید پور سے گزرتی تھی لیکن اب وہاں ریلوے اسٹیشن بھی بن گیا تھا جب ٹرین سید پور میں رُکی اور قلی نے پکارا " سید پور اسٹیشن " تو شبراتی میاں اونگھتے ہوئے چونک پڑے، کیا دنیا بالکل بدل گئی، سید پور! وہی سید پور نہ! جہاں اُنھوں نے اپنی نوجوانی کا کافی زمانہ گزارا تھا، وہاں کے باغوں میں آم اور جامن کی بہاریں دیکھی تھیں، چالیس سال کے گزرے واقعات اُن کی آنکھوں کے سامنے گزرنے لگے اُن کے دلی دوست نجف اشرف عرف نجن میاں یاد آ گئے، وہی نجن میاں جنھوں نے کبھی شبراتی میاں کو بغیر کھلائے پلائے اپنے گاؤں سے گزرنے نہیں دیا تھا۔ جب نجن میاں کو معلوم ہو گا کہ شبراتی میاں سید پور ہو چکر بھی اُن سے ملے بغیر چلے گئے تو ان کو دلی قلق ہو گا۔ آج کی رات سید پور ہی میں کیوں نہ ٹھہر جائیں، صبح کو گاڑی

سے چلے جائیں گے۔ وقت کم تھا زیادہ سوچنے کا موقع نہ تھا، چھوٹے اسٹیشنوں پر ٹرین زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتی۔ سید پور اور وہاں کے قدیمی احباب کی محبت نے زور مارا اور شبراتی میاں نے بیٹھ پر اپنی چھوٹی سی گٹھری باندھی، ہاتھ میں ڈنڈا سنبھالا اور اسٹیشن پر اُتر پڑے۔

سورج ڈوب رہا تھا، گائیں اور بھینسیں چراگاہوں سے واپس آرہی تھیں، کندھے پر الہ آبادی لوہبندی لاٹھی رکھے اہیر مویشیوں کے پیچھے "برہا" گاتے چلے آرہے تھے، یہ گلی ڈنڈا کھیلنے کا وقت تھا مگر اس کے بجائے شبراتی میاں نے دیکھا کہ کچھ لڑکے قمیص اور نیکر پہنے ایک میدان میں فٹ بال کھیل رہے ہیں، دو تین لڑکے پتنگ بھی اُڑا رہے تھے۔ شبراتی میاں نے جس طرف نظر اُٹھا کر دیکھا تو انھیں دنیا بدلی نظر آئی، ایک معمولی گاؤں کے بجائے اب سید پور ایک متمول قصبہ تھا۔ شبراتی میاں کو خیال گزرا کہ شاید وہ سید پور کے بجائے کسی اور قصبہ میں آگئے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک قلی سے دریافت کیا "کاہو (کیوں) یہ سید پور ہے نہ؟ جہاں سید میاں کا مجار (مزار) ہے؟" قلی نے کہا "ہاں بڑے میاں! یہی سید پور ہے، وہ سامنے سید میاں کا مزار ہے، اور اس کے پاس وہ کُٹی ہے۔ کیا آپ یہاں پہلے کبھی نہیں آئے؟"

شبراتی میاں کو قلی کی باتیں اچھی نہ معلوم ہوئیں، جہاں اُنھوں نے اپنی جوانی کا کافی وقت گزارا اُسی جگہ کے متعلق اُن پر اجنبیت کا الزام دینا اُنھیں ناگوار گزرا۔ اب شبراتی میاں اسٹیشن سے باہر نکلے اور اپنے دوست بجن میاں سے ملنے کی خوشی میں اُن کے قدم جلد جلد آگے بڑھنے لگے، اُوہ چالیس سال کے بعد آج ملاقات ہوگی، بجن میاں اُن کو دیکھکر کتنا خوش ہونگے، اُن کی عمر بھی اب میری ہی ایسی ہوگی، شکایت تو کریں گے کہ اتنے دنوں تک ملاقات کیوں نہیں کی، تو بھی شکایت تو میں بھی اُن سے کر سکتا ہوں، پہلے تو اُن کے پاس ایک بھینس تھی اور ایک ہل کی کھیتی ہوتی تھی، اب تو کئی ہل کی کھیتی کرتے ہوں گے۔ اسی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے شبراتی میاں چلتے چلتے ایک دو منزلہ عالی شان مکان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ شبراتی میاں اپنے دوست کا مکان بھول جائیں، یہ پیپل کا درخت ہے، یہ کنواں بھی رہا، اسی کے پاس بجن میاں کا تو کچا مکان تھا، مگر یہاں تو اب پکے مکانوں کے سوا کچے مکان کم دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے دروازوں پر ہر وقت چہل پہل رہتی تھی، ہر طرف زندگی کا ثبوت ملتا تھا، لیکن اب تو چاروں طرف سناٹا ہے۔

(۳)

گاؤں میں گھستے ہی شبراتی میاں نے ہر شخص سے "سلام علیکم" کہا، وہ سمجھتے تھے کہ پہلے کی طرح اس کے جواب میں لوگ اُن سے بغلگیر ہو جائیں گے، مگر نوجوانوں نے کوئی جواب نہ دیا، بلکہ شبراتی میاں کی طرف

حقارت سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ہاں ضعیفوں نے شبراتی میاں کے سلام کا ضرور جواب دیا۔ کیا گاؤں کے ساتھ ہی گاؤں والوں کی ذہنیت بھی تبدیل ہوگئی۔ شبراتی میاں کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ شام کی تاریکی بڑھ رہی تھی، دن رات سے گلے مل رہا تھا اور شبراتی میاں کو اب تک نجن میاں کا مکان نہ ملا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے دوست نجن میاں کا مکان بہت جلد پالیں گے۔ ایسے قلبی دوست کے مکان کا کسی سے پتہ دریافت کرنا وہ اپنے تعلقات کی توہین سمجھتے تھے۔ ان کے خیال سے جہاں نجن میاں کا مکان ہونا چاہیئے وہاں اب ایک عالی شان حویلی تھی۔ بیٹھک میں کرسیاں، میز، پلنگ اور تخت تو نظر پڑے لیکن وہاں کوئی انسان نہ دکھائی دیا جس سے وہ نجن میاں کا پتہ دریافت کرتے۔ اب شبراتی میاں زیادہ دیر تک حویلی کے سامنے کھڑے نہ رہ سکے۔ اتفاق سے ایک نوجوان عینک لگائے حویلی کی بیٹھک میں آیا۔ اس کو دیکھکر شبراتی میاں نے رُکتے رُکتے دریافت کیا "کا بڑا نجن میاں کا کون گھر ہے؟" نوجوان نے ایک دفعہ شبراتی میاں کی ہیئت کذائی کو دیکھا اور کہا "آگے جاؤ (بڑے میاں)" شبراتی میاں کو یاد آیا کہ نجن میاں کا گھر تو گاؤں کے اسی سرے پر تھا اب آگے کہاں جاؤں، پھر سوچا کہ ممکن ہے اب ان کا گھر گاؤں کے اندر بن گیا ہو، چنانچہ وہ آگے بڑھے۔ تھوڑی دُور چل کر وہ ایک دروازے کے سامنے پھر کھڑے ہو گئے، انھیں یاد آیا کہ یہیں کہیں پر تو مینڈو میاں کا بھی تو گھر تھا۔ مینڈو میاں سے بھی شبراتی میاں کی جان پہچان تھی۔ مگر مینڈو میاں کا بھی تو کچا مکان تھا۔ لیکن اب تو نہایت پختہ عمارت کھڑی تھی بیٹھک میں دو چار لڑکے بیٹھے تھے۔ شبراتی میاں کو خوشی ہوئی کہ ایسی بیٹھک تو ملی جو آباد ہے۔ گلی میں کھڑے ہو کر انھوں نے نجن میاں کا پتہ دریافت کیا جب کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو اُنھوں نے پھر بلند آواز سے مینڈو میاں اور نجن میاں کو پوچھا۔ ایک لڑکے نے شبراتی میاں کو جھڑک دیا "بابا! شور کیوں مچاتے ہو ہم بہرے نہیں ہیں، آگے جاؤ" شبراتی میاں کا جی تو چاہا کہ لڑکے کو گستاخی کا مزہ چکھا دیں مگر یہ سوچ کر کہ بچے ہیں خاموش ہو گئے۔ ان کو اس بات کا بہت تعجب تھا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے، کیا اُن کے سب ملنے والے گاؤں کے اس سرے کو چھوڑ کر دوسرے سرے پر جا کر بس گئے ہیں۔

اب تاریکی کافی پھیل چکی تھی، اندر گھروں کے تو چراغ جلتے معلوم ہوئے لیکن دروازے یا بیٹھکیں بے چراغ تھیں۔ شبراتی میاں کے لئے یہ بالکل نئی بات تھی۔ چالیس سال پہلے بیٹھکوں میں لالٹین نہ سہی مگر ہنڈی کے تیل کا دیا ضرور جلتا تھا۔ غریب ہو یا امیر مغرب کی اذان ہوئی اور عورتوں اور بڈھوں نے چلانا شروع کر دیا کہ جلدی چراغ جلا دو، جلدی جاؤ بیٹھک میں دیا جلا آؤ۔ مغرب کی اذان کے بعد بھی اگر کسی گھر یا بیٹھک میں چراغ نہیں جلتا تھا تو وہ گھر اور گھر والے منحوس کمتی چوس سمجھے جاتے تھے۔ تو کیا

سید پور میں نحوسی نے قبضہ جما لیا ہے۔ شبراتی میاں کی عقل حیران تھی خیریت یہ ہوئی کہ شبراتی میاں کو ابھی کچے مکانوں کی بٹھکوں میں چراغ جلتے نظر آگئے ورنہ وہ سید پور کو شہر خموشاں سمجھ لیتے۔ اگر رات نہ ہوگئی ہوتی تو شاید شبراتی میاں اب بغیر کسی سے کچھ پوچھے اپنے گھر واپس ہونے کے لئے اسٹیشن چلے جاتے۔ لیکن ان کو اشتیاق تھا کہ جب سید پور آگئے ہیں تو اپنے دوستوں کا تو پتہ چلالیں۔ اتفاق سے انھوں نے جس دروازے پر جاکر دریافت کیا اُن کو یہی جواب ملا کہ "آگے جاؤ" شبراتی میاں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور پھرتے پھراتے گاؤں کے دوسرے سرے پر پہونچ گئے۔

گاؤں کے آخری سرے پر انھیں ایک کچا پکا مکان دکھائی دیا جس کے سامنے ایک بہت بڑا چبوترہ تھا اور وہاں کئی چارپائیاں بچھی تھیں اور کئی لڑکے خوش گپیاں اُڑا رہے تھے۔ وہاں شبراتی میاں کو کچھ زندگی نظر آئی۔ لڑکوں سے باتیں کرنا یا اُن سے کچھ پوچھنا شبراتی میاں کو پسند نہ تھا۔ مگر مجبوری تھی، رات ہوگئی تھی، گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آچکے تھے اس کے آگے اور کوئی مکان بھی نہ تھا، چبوترہ پر کوئی بڈھا بھی نہ تھا جس کو شبراتی میاں مخاطب کرتے۔ چنانچہ شبراتی میاں نے مجبوراً نوجوانوں کے قریب پہونچ کر دریافت کیا۔ "کا ہوہی نجن میاں کا دوار ہے نا؟" سب جگہ وہ دریافت کر آئے تھے، سب نے یہی کہا تھا کہ "آگے جاؤ" اور اب یہ گاؤں کا آخری مکان تھا نجن میاں کا یقیناً یہی مکان ہوگا۔ لیکن اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُن کے کانوں میں پھر یہی صدا گونجی کہ "آگے جاؤ" اب شبراتی میاں کے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ کیا سب گاؤں والوں نے ان کو بھکاری سمجھ لیا ہے "آگے جاؤ" "آگے جاؤ" آخر اس کا کیا مطلب ہے۔ وہ آگے بڑھکر بلا تکلف ایک خالی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کمر سے اپنی گٹھری کھولی، ڈنڈا ایک طرف رکھ دیا۔ کندھے سے انگوچھا اُتار کر گرد راہ جھاڑی اور نوجوانوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگے:۔

"آگے جاؤ! آگے جاؤ! اب ہم آگے نہ جابے (جائیں گے)۔ جہاں جاؤ کوئی یہ نہیں کہت (کہتا) کہ ٹھہر جاؤ، سب یہی کہت ہیں کہ آگے جاؤ، گاؤں کے اخیر میں تو آئے گیوں (آگئے) اب کہاں جائی (جاؤں)، آگے تو گڑھی (تالاب) ہے۔ ہم اب آگے نہ جاب۔ پہلے جب ہم یہ گاؤں میں آوت رہن تو کوؤ (آتے تھے تو کوئی) اپنے دُوارے سے آگے نہیں بڑھے دیت رہا (بڑھنے دیتا تھا)، تب کچے مکان رہن تو لوگن (لوگوں) ماں محبت رہی سب کے دُوارے پر سانجھ (شام) ہوتے دیا جل جات رہے، اب پکی حویلی توبن گئیں مُدا کوؤ (مگر کسی) کے دُوارے پر دیا تک نہیں جلت۔ ہائے اللہ میاں وہ پُرانے جنے (آدمی) کہاں چلے گئن۔ تم ہمکا کوئو فقیر سمجھے ہو ہم تمہار محتاج نہیں یہ دیکھو ہم اپنی گٹھری میں گھی کھچڑی بیسن کی روٹی باندھے ہین۔ ہم ہوں (ہم بھی) اپنے گاؤں کے جمیندار (زمیندار) رہن۔

بس تمھار تہجیب (تہذیب) دیکھ لیا۔ آگے جاؤ، آگے جاؤ! پڑھ لکھ کے تم دو کوڑی کے ہوگئے۔ اپنے بزرگن (بزرگوں) کو بھول گیو، واہ ری تمھار پڑھائی۔ لانت (لعنت) ہے ایسی پڑھائی پر ایسی پڑھائی پر پھٹکار ہو۔ ایسی تہجیب (تہذیب) پر۔ ہم تمھرے یہاں رہیے کو (رہنے کو) نہیں آوا۔ ہم تو اپنے دوست بخشن میاں کو پوچھت (پوچھتے) یہاں تک آگئن (آگئے)"

بڈھے شبراتی میاں کی دیہاتی تقریر کو سُن کر نئی روشنی والے دم بخود رہ گئے۔ مالک مکان مہتو میاں تھے تو نوجوان مگر نہایت سُلجھے ہوئے، پُر مذاق اور بزرگوں کی عزت کرنے والوں میں سے تھے نہایت بااخلاق اور ملنسار تھے۔ اُنھوں نے شبراتی میاں سے بہت معذرت کی اور کہا "معاف کیجئے ہم باتوں میں مشغول تھے۔ بخشن میاں کا تو عرصہ ہوا انتقال ہوگیا۔ اُن کا مکان گاؤں کے اُس سرے پر اسٹیشن کے قریب ہی ہے"۔

بخشن میاں کی وفات کی خبر سُن کر شبراتی میاں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُن کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ دعائے مغفرت کے لئے ان کے دونوں ہاتھ اُٹھ گئے۔ یہ دیکھتے ہی نئی روشنی والے وہاں سے ایک ایک کرکے کھسک گئے۔ لیکن چلتے چلتے کسی شوخ لڑکے نے یہ فقرہ چست ہی کردیا۔ یعنی۔

"اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو"

جذباتِ سلیم

جمتا ہے رنگِ محفل سوزِ غمِ نہاں سے
حال اپنا کہہ رہا ہوں میں شمع کی زباں سے

شاید مرے پر آیا افسانۂ محبت
نیند آرہی ہے مجھکو خود اپنی داستاں سے

بجلی کہاں گری ہے پھونکا ہے کس کو یارب
یہ کیا میں سُن رہا ہوں صیاد کی زباں سے

قدموں سے میرے لپٹے جاتے ہیں دیر و کعبہ
کیا جانے آرہا ہوں میں کس کے آستاں سے

میرے شکستِ دل کے انداز سب کو بھائے
شاخوں سے گل بھی ٹوٹے تارے بھی آسماں سے

وہ پوچھتا نہیں کچھ میں کہہ رہا ہوں سب کچھ
ایسا بھی اک فسانہ چھیڑا ہے رازداں سے

لذت کشِ جراحت دل بھی ہے اور جگر بھی
فرصت نہیں کسی کو نظروں کے امتحاں سے

بوئے چمن پریشاں رنگِ چمن پریدہ
دل سہما جارہا ہے انجامِ گلستاں سے

آنسو مچل رہے ہیں دل بیٹھا جارہا ہے
اُٹھنے کو اُٹھ رہا ہوں میں اُس کے آستاں سے

ضمیر بھٹی سوہنپوری

تنقید کتب

پسِ پردہ[1]

یہ اختر صاحب بریلوی کے دلچسپ کلام کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے جسے سید علمدار حسین کاظمی بریلوی نے اپنے انٹروڈکشن کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں سبھی طرح کی مختلف نظمیں ہیں۔ چنانچہ "رام گنگا" اور "شرمہ" جیسی رومان انگیز نظموں کے ساتھ ساتھ مولوی، چُنگی، محترم، خانقاہ، مشاعرے جیسی اصلاحی طنزیہ اور سبق آموز نظمیں بھی ہیں۔ گو یہ نظمیں بیانیہ طرز کی ہیں لیکن ان میں زور، ترنم اور برجستگی سب کچھ موجود ہے۔ اکثر نظمیں تنقیدی اور واقعاتی ہیں مگر شاعرانہ حیثیت سے "رام گنگا" اور "حافظ رحمت خاں" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بہرحال یہ چھوٹا سا مجموعہ دلچسپ اور قابلِ قدر ہے۔ سماج اور اصلاح کا ذوق رکھنے والے اصحاب اس کا ضرور مطالعہ کریں۔

خواجہ معین الدین چشتی

یہ چھوٹا سا رسالہ اجمیر کے مشہور خواجہ غریب نواز کی مختصر سوانح عمری ہے۔ جس کو میر آغائی صاحب اجمیری نے مختلف اور مستند ذرائع سے مرتب کیا ہے۔ اور خواجہ صاحب کے متعلق غیر مسلم بزرگوں کی رائیں اور خیالات بھی درج کئے ہیں۔ آخر میں درگاہ شریف کا ایک مفصل نقشہ بھی دیدیا گیا ہے اور مختلف تعمیرات کے حالات مختصراً بیان کر دئیے گئے ہیں

میر صاحب نے اپنی چند نعتیہ، عشقیہ اور صوفیانہ غزلوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ بھی رشحات میر اَحدی کے نام سے شائع کیا ہے۔ دونوں کتابیں چھ چھ پیسے کا ٹکٹ بھیجکر میر احدی صاحب، امراؤ علی ہاؤس اجمیر کے پتہ سے منگائی جا سکتی ہیں۔

غمِ احبابِ شاد

یہ چھوٹا سا رسالہ مہاراجہ بہادر سرکشن پرشاد شاد مرحوم کا سوگ نامہ ہے جس میں راجہ نرسنگھ بہادر فانی نے بہت سی تاریخی رباعیاں اور نظمیں مہاراجہ شاد کے متعلق لکھکر اپنے دلی جذبات اور اخلاص و محبت کا اظہار کیا ہے

---

[1] لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ حجم تقریباً سو صفحات، قیمت بارہ آنے، ملنے کا پتہ میزان الادب، ذخیرہ اسٹریٹ بریلی۔

رسالہ کا نام بھی تاریخی ہے۔ جس سے مہاراجہ شاد مرحوم کا سن وفات ۱۳۵۹ھ نکلتا ہے۔ حالی صاحب نے مہاراجہ صاحب مرحوم کے متعلق ایک زوردار مرثیہ بھی لکھا ہے۔

بچوں کا تحفہ (حصہ دوم)

اس کتاب میں مولانا محمد شفیع صاحب نیر استاد ماڈرن ہائی اسکول نئی دہلی نے بہت آسان اور سلیس زبان میں بچوں کے لئے مختلف عنوانات پر دلچسپ اور سبق آموز نظمیں لکھی ہیں۔ جگہ جگہ تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ کتاب درسی ہے جو بچوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

ضخامت ۷۰ صفحات قیمت ۵ ر ملنے کا پتہ:- مولوی محمد شفیع الدین نیر کوچہ تارا چند، دہلی

ہفتہ کی خبریں

حکومت یو۔پی نے جنگ کی صحیح خبریں پہونچانے کے لئے "ہفتہ کی خبریں" نام کا ایک اردو ہفتہ وار اخبار جاری کیا ہے۔ حال ہی میں جنگ کی دوسری سالگرہ کے موقعہ پر اس اخبار نے اپنا "وی نمبر" نکالا ہے جو جنگ کے متعلق معلومات کا ایک گلدستہ ہے۔ اس نمبر کو تصویروں کارٹونوں اور مختلف طریقوں سے دیدہ زیب بنایا گیا ہے۔ جگہ جگہ پر لڑائی کے متعلق تاریخی اہمیت رکھنے والی شخصیتوں کے خیالات بھی دے دئے گئے ہیں جب سے کنور جسبیر سنگھ صاحب نے اس محکمہ کا چارج اپنے ہاتھ میں لیا ہے پروپیگنڈا کے کام میں ایک نئی روح پڑ گئی ہے۔ ہم اس نمبر کی کامیابی پر کنور صاحب اور دیگر کارکنان کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اس نئے معصر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ضروری تصحیح

زمانہ اگست ۱۹۴۱ء میں صفحہ ۵۰ پر طالب صاحب کی غزل (قند پارسی) کے چوتھے شعر کا دوسرا مصرع غلط چھپ گیا ہے۔ طرّہ کی جگہ "طرفہ" ہونا چاہیئے۔

زمانہ ستمبر ۱۹۴۱ء میں صفحہ ۱۴۲ کی آخری سطر میں بھی پوری ایک لائن چھپنے سے رہ گئی ہے۔ آخری سطر کی اصل عبارت یوں ہے:-

"مضطر اُسکو سنکر فرط مسرت اور جوش تحسین سے بیقرار ہوگئے۔ فوراً اٹھے اور حضرت رسا کو گلے لگاکر پیشانی چوم لی۔ اسکے بعد مجمع شعر سے زیادہ اس کیف تحسین سے مست و سرشار تھا، خود حضرت مضطر کی بھی ایسی ہی قدر کی گئی۔ اسی صفحہ پر یہ شعر "یہ کیسے بال بکھرا ہے یہ کیوں صورت بنی غم کی" الخ۔ مضطر کا بتایا گیا ہے حالانکہ آغا شاعر دہلوی کا ہے۔ ناظرین درست فرمالیں۔

عرض حال

کاغذ کی بیحد گرانی کے علاوہ اس وقت سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اچھا کاغذ گراں قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہو رہا ہے ہندوستانی ملوں کا کاغذ بھی کافی تعداد میں نہیں مل رہا ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں کے ایجنٹوں نے اپنے اسٹاک خالی کردیے ہیں اور خردہ فروش دوگنی تگنی قیمت لینے پر بھی دو ایک ریم سے زیادہ دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ چنانچہ اس صحیفے کا سارا پرچہ بہت معمولی کاغذ پر شائع کیا جارہا ہے۔ اس وجہ سے ضخامت میں بھی کمی کرنی پڑی۔ ہماری مشکلات میں ایڈیٹر صاحب زمانہ کی علالت سے اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ایڈیٹر صاحب کو آئندہ دو ماہ تک لکھنے پڑھنے کی ممانعت ہے۔ اس اثنا میں ہم کو امید ہے کہ ناظرین ازراہ ہمدردی ہماری موجودہ خامیوں کو نظرانداز کریں گے۔

ایڈیٹر صاحب زمانہ ان قدرشناس احباب کے تہ دل سے شکرگزار ہیں جنھوں نے اس علالت میں پرسش حالات کے علاوہ اظہار ہمدردی فرمایا۔ بیشتر حضرات کے عنایت ناموں کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اگر اتفاقاً کسی صاحب کے خط کا جواب رہ گیا ہو تو سہو فروگذاشت کے لئے ہم خواستگار معافی ہیں۔

منیجر زمانہ

THE ZAMANA, NOV. 1941.

زمانہ

مرتبہ: دیانراین نگم

نمبر ۵	نومبر سنہ ۱۹۴۱ء	جلد ۷۷

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

نمونہ سات آنہ

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید بے مثل کتابیں

میدان عمل: منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبۂ جامعہ نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے اسمیں ملک کی موجودہ بیداری و بےچینی کی جیتی جاگتی تصویریں، فطری عشق و محبت کے سادہ و دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے صفحات پانسو کتابت اعلی کاغذ نفیس اور روشن طباعت خوبصورت اور مضبوط جلد دیدہ زیب ڈسٹ کور قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنہ عہ۸

زاد راہ: منشی پریم چند مرحوم کی ان کہانیوں کا مجموعہ جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھیں قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

دنیائے تبسم: مشہور مزاحیہ نویس جناب شوکت تھانوی کے بہترین ظرافت پسند افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ ایک روپیہ چار آنہ۔

مجنوں کے افسانے: جناب مجنوں گورکھپوری اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں موجودہ کتاب اُن کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے قیمت بارہ آنے ۱۲

ملنے کا پتہ: زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور

گلشن صحافت میں ایک غنچۂ نو کا اضافہ

شباب

ادب اردو کا ایک ترقی پسند ماہنامہ

ملک کے مشاہیر اہل قلم حضرات کے بلند پایہ مقالے ترقی یافتہ ادب کے اعلیٰ مضامین دلچسپ اصلاحی افسانے اعلیٰ نفسیاتی ڈرامے تاریخی شہ پارے روح نواز پر کیف غزلیں، وجد آفریں سرمدی نظمیں دلاویز پیارے گیت ماہ بماہ اپنی تمام رعنائیوں دلفریبیوں اور مصنوعی خوبیوں کے ساتھ مطلع صحافت پر عنقریب جلوہ گر ہوگا نمونہ کا پرچہ بالکل مفت روانہ ہوگا فوراً اپنے اسم گرامی اور مکمل پتہ سے مطلع کریں۔

منیجر شباب۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۶۳ بمبئی نمبر ۲

کھیتی سے ہزاروں روپے کمائیں

ہلدی کی کھیتی باتصویر دو صد روپیہ فی ایکڑ منافع	۲ر
پان کی کاشت منافع ایک ہزار روپیہ فی ایکڑ ۔ ۔ ۔ ۔	۴ر
پپیتہ باتصویر منافع ایک ہزار فی ایکڑ ۔ ۔ ۔ ۔	۴ر
اناس باتصویر گورنمنٹ نوٹ مطابق منافع پانچسو روپیہ فی ایکڑ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۵ر
آلو کی کاشت باتصویر ڈھائی سو روپیہ منافع	۱۲ر
کل کتب خریدار کو معہ محصول ڈاک	۶ عہ

زراعتی کتب کے مشہور مصنف بابو رام پرشاد صوبہ اسٹنٹ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ریٹائرڈ گوالیار سے مل سکتی ہے۔

ناکامیِ محبّت

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم۔ اے)

فضائے محبت گلستاں گلستاں — ہوئی دفعتاً کیوں بیاباں بیاباں
ابھی جا رہا تھا خراماں خراماں — ہوئی کیسی وحشت کہ اب ہوں گریزاں
نسیمِ سحر کی سی اٹکھیلیاں تھیں — یہ کیوں دل کی حرکت بنی جوشِ طوفاں
جمعیت نہ دل کی ہوئی دو گھڑی بھی — پریشاں رہی زندگیِ پریشاں
سمجھتے تھے جس حسن کو نرم و نازک — اُسے پا کے پتھر ہوا دل ہراساں
زمیں سنگلاخ اتنی ہے جانتے گر — تو تخمِ محبّت نہ بوتے بہ ارماں
غزل کہہ کے کس کو سنانے چلے ہو — پشیماں نہ ہو گا کبھی ناپشیماں
فریبِ عالمِ رنگ و بو ہے کہ یاں ہے — جدا ذوقِ پنہاں سے شکلِ نمایاں
وہ ملنا نہیں، ہے نہ ملنے سے بدتر — جو فرطِ محبّت سے دل ہو نہ لرزاں
فضائے محبّت میں گھٹتا رہا دم — رہا عمر بھر سانس لینے کا ارماں

محبّت میں مدہوش سر پھوڑتے ہو
کہاں دل کا دل کے سمجھنے کا امکاں

ابھی نہیں ہوئی دنیا بھی عشق کے قابل — نہیں ہوا ابھی انساں کا ارتقا پورا
بہر صورت ملے اعضائے جسمانی مگر غم ہے — جسے ہم وصل کہتے ہیں وہ ملنا ہی نہیں ہوتا

شرابِ عشق

خود اپنے شیشۂ دل کی پلا کے پیتا ہوں — میں دلبروں کے دلوں میں سما کے پیتا ہوں
وہ بادہ نوش ہوں پہلے پلا کے پیتا ہوں — لبوں کو اُس کے لبوں سے ملا کے پیتا ہوں
میں آگ خانۂ دل میں لگا کے پیتا ہوں — شرابِ عشق سے شعلے اُٹھا کے پیتا ہوں
تڑپ کے چیخ کے اور تلملا کے پیتا ہوں — شراب خانے میں محشر اُٹھا کے پیتا ہوں
ہے مے حرام بطِ مے میں کر کے اُس کو حلال — شرابِ عشق کو مذہب بنا کے پیتا ہوں
خدا کے نام سے چھوڑی تھی میکشی میں نے — اُسی کے نام سے ساغر اُٹھا کے پیتا ہوں

عشقِ بلند آہنگ

رو رہا ہے شاہدِ آفاق آنسو خون کے
حسن! حفظِ انفرادی کی ہنسی اچھی نہیں

چھوڑ دو عشاق کو دنیا بدلنے کے لئے
اِس زمانے میں حسینو! دل لگی اچھی نہیں

عشق عالمگیر ہے یہ اجتماعی زندگی
جگمگا دو انفرادی زندگی اچھی نہیں

حسن سے کہدو کہ میدانِ عمل ہے منتظر
عشق کو توفیق دے یہ بےبسی اچھی نہیں

وسعتِ صحرائے عالم کا تقاضا دیکھئے
قیس کی سی زندگی مرکزی اچھی نہیں

حسن جو خود بیں ہے اُس پر کیوں گمانِ حسن ہو
عشق کے نزدیک تو کم مائگی اچھی نہیں

جو طلب گارِ جری و شیر مردِ عشق ہے
ہے وہی حسنِ حقیقی، بزدلی اچھی نہیں

شیر مردی عشق کی ہو مشتمل ہر درد پر
دردمندانِ محبت! بےحسی اچھی نہیں

حسنِ عالمگیر ہے صبر آزما جرأت شکن
اے تنک ظرفو! تمھاری میکشی اچھی نہیں

موجِ مے ہے یا کہ کوثر آفریں دل کی ترنگ
جو خمار آور ہو وہ تو سرخوشی اچھی نہیں

اس سے ٹکرانا ہے اپنا شیشۂ ہستی ہمیں
تلخ مے مینائے نیلی فام کی اچھی نہیں

عشق بازانِ مہم پسند کے آگے کانپ اٹھیں
مشکلوں کے حق میں ان کی کپکپی اچھی نہیں

رند کہتے ہیں کہ آجائے یہ راہِ راست پر
لغزشیں یہ وقت کے رفتار کی اچھی نہیں

ناتوانِ عشق ہے مدہوش پیرائے آسماں
ناتوانِ عشق کی یہ تھرتھری اچھی نہیں

شانِ مے نوشی

حضورِ پیرِ مغاں سے ملی ہے مدہوشی
ادائے مست سے کرتے ہیں رند مے نوشی

شراب خانۂ ہستی میں دورِ عیش کہاں
ہماری بادہ پرستی ہے یا کہ غم نوشی

فنا کے شیشے سے ٹکرا رہے ہیں جامِ حیات
ارے یہ بادۂ ذوقِ فنا کی سرجوشی

بہت ہی تند جو ہے ساقیِ اجل کی شراب
تو رند بھی تو ہیں خوگردۂ بلا نوشی

اُٹھا کے شیشۂ ہستی پٹک دیا مدہوش
نہ چھوڑی شیشہ شکن تونے شانِ مے نوشی

مری زندگی میں وہ نغمے نہیں ہیں
کہ جو سازِ خواب آورِ زندگی ہوں

شبے مطلعِ زیست پر وہ ستارے
نہیں ہیں کہ جو شکلِ تابندگی ہوں

جیا رائیگاں پر وہ سانسیں نہیں لیں
کہ جو غم کشِ بارِ شرمندگی ہوں

دامنِ زیست پہ غم کا رہا بکھرا ہوا رنگ
دیکھ لو اِس میں خوشی کا تو کوئی داغ نہیں

ایک خواب "ہندو مسلم اتحاد" جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوا

(از مسٹر فیاض الدین احمد فیاض گوالیاری بی۔ اے)

ہندو کہیں کے ہیں نہ مسلماں کہیں کے ہیں
دونوں یہیں رہیں گے یہ دونوں یہیں کے ہیں
(دعا ڈبائیوی)

شاید ہمارے وطن کی تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایسے ناسازگار اور ناموافق حالات کبھی پیدا نہ ہوئے ہوں جیسے کہ اس وقت کچھ عرصہ سے پیدا ہیں۔

محمد قاسم ہندوستان کا پہلا مسلم حملہ آور جب عرب واپس جانے لگا تو اس کی رخصت پر محبت اور شفقت کے آنسو بہانے والی یہی ہندوستانی قوم تھی — کیا اس وقت اتحاد اتنا ناممکن تھا؟

بابر گھر سے بے گھر ہوا تو ہندوستان کو گھر بنایا، پھر کیا اس نے اور اس کی اولاد نے اسی گھر کو اپنا گھر سمجھ کر اپنی ساری قوتیں اور دولتیں اسی گھر کے سجانے میں صرف نہیں کیں؟ اس دیس میں آنے کے بعد انھوں نے دوسرے دیسوں کو پردیس ہی سمجھا اور ان سے ناتا جوڑنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔

راجپوت راجاؤں نے مغل بادشاہوں سے رشتے کئے تو دباؤ سے نہیں بلکہ اپنا بھائی اور اپنا ہی جیسا راجہ سمجھ کر اگر یہ سودا زبردستی کا ہوتا تو راجپوتوں کی جان جاتی آن نہ جاتی! کیا اسی وقت ہندوستان میں متحدہ قومیت کی بنیاد نہیں پڑ چکی تھی؟

مہارانا پرتاپ اور مہاراجہ شیواجی کے دلیرانہ کارنامے اور سرفروشانہ مجاہدے مادر وطن کے پاؤں کی زنجیر کاٹنے کے لئے تھے نہ کہ کسی مذہبی تعصب یا قومی منافرت کے زیر اثر۔ مسجدوں کی حرمت اور مسلم قیدیوں کے ساتھ ان کا حسن سلوک اگر ایک طرف ان کی بے تعصبی کا شاہد ہے، تو دوسری طرف اس رواداران اسپرٹ کا ثبوت ہے جو اس وقت ملک میں عام تھی۔ کاش ہماری نظریں اس وطن پرستانہ بہادری اور موجودہ لیڈروں کی بہادری اور ویرتا میں فرق محسوس کر سکتیں!

سنکٹ پڑنے پر چتوڑ کی مہارانی راکھی بھیجتی ہے اور مدد کے لئے پکارتی ہے، کس کو؟ ہمایوں کو۔ کس کے خلاف؟ مظفر شاہ گجراتی کے خلاف! بھائی اجنبی بہن کا پیغام سنتے ہی مدد کے لئے دوڑتا ہے۔ کیا آج قائد اعظم اور ان کی برادری کے بدن میں اتنا ہندوستانی خون

بھی نہیں جتنا ہندوستان کے آب و دانہ نے بابر کے بیٹے کی رگوں میں دوڑا دیا تھا؟

ہندوستان پر احمد شاہ دُرّانی کا حملہ ہے، مرہٹوں سے جنگ چھڑی ہے، ابراہیم توپچی بحیثیت کمانڈر توپخانہ مرہٹہ فوج میں صف آرا ہے... بڑھتا ہوا احمد شاہ للکار کر کہتا ہے "ابراہیم بے دین ہو گیا ہے، دوزخ سے نہیں ڈرتا، ہم سے آ مل" ابراہیم جواب دیتا ہے مجھے دوزخ قبول ہے لیکن اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑنا قبول نہیں۔"

وفاداری بشرطِ اُستواری عین ایماں ہے مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

عبدالقادر بوڑھے شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیتا ہے، بدلہ لینے کون جاتا ہے؟ فاتح اعظم مہدجی سیندھیا، اُسی سے فرزند کا خطاب اور ماہی مراتب پاکر پھولوں نہیں سماتا۔ اللہ اللہ ایک کمزور اور بیکس مغل بادشاہ کے ساتھ یہ جذبۂ احترام و عقیدت!

۱۸۵۷ء کا غدر ہوتا ہے، مُلک کے نام پر نہیں، کسی خاص فرقے کے نام پر نہیں۔ سوراج کے نام پر نہیں، بلکہ نانا فرنویس کے زیرِ سرکردگی مغل راج کے نام پر۔ گوشہ نشین بہادر شاہ ظفر کے لئے۔

آج چوراسی سال بعد بھی وہی ہندوستانی سپاہی ہے جو اپنے ملک سے باہر افریقہ اور ابی سینیا کے میدان جنگ میں "شیواجی کی جے" اور "علی علی" کے نعرے لگا کر دشمن پر اس طرح ٹوٹتا ہے جیسے وہ جنگ اُسی کے وطن کی جنگ آزادی یا کوئی "دھرم یُدھ" ہو، کیا مناسب فضا پیدا ہونے پر ہندوستانی قلوب کا یہ خلوص و عقیدت، یہ ایثار و جوشِ وفاداری مادرِ وطن کے لئے آپس کے چھوٹے چھوٹے تنازعے صدیوں اور رقابتیں بھول کر اپنے بے حقیقت چھوٹے چھوٹے مفاد قربان نہیں کر سکتا۔

یوں تو دیسی صنعت و حرفت کی کمی اور سرکاری ملازمت کے لئے باہمی رقابتوں نے جب سے مشترکہ نیشنل پلیٹ فارم چھوڑ کر ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ کی بُنیاد ڈالی، باہمی بے اعتمادی کا سنگِ بنیاد پڑ چکا تھا۔ لیکن قومی منافرت کی آگ موجودہ جنگِ عظیم کے شعلوں کے ساتھ ساتھ "پاکستانی ہتھے" نے اور بھی بھڑکا دی ہے۔ اور حقیقت دیکھئے تو کچھ بھی نہیں۔ "نہ سوت نہ کپاس کولی سے لٹھم لٹھا" کا مصداق ہے!

مسلم لیگ ایک نظریہ لے کر اُٹھتی ہے کہ "ہندو نہ کبھی اپنا ہوا نہ ہوگا" اس کی نفرتیں لا محدود اور اس کی عداوتوں کی خلیج ناقابلِ عبور ہے۔ اس لئے ہم دونوں جب آپس میں مل کر ایک گھر میں چین سے نہیں بیٹھ سکتے تو آؤ درمیان میں ایک دیوار کھڑی کریں، تم اُدھر خوش، ہم ادھر خوش! اس پر

مہاسبھا چیخ اُٹھتی ہے کہ ہمارا ہندوستان ناقابل تقسیم ہے، مسلمان اس کو ٹکڑے کر کے افغانستان اور ایران سے جوڑنا چاہتا ہے، ہم ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ گاندھی جی نے اب تک ہمیں بڑے دھوکے میں رکھا، مسلمانوں سے میل ملاپ کا خیال سرے سے ہی غلط تھا۔

ایک طرف اس خیالی پاکستان کا "پاکستان ڈے" منایا گیا تو دوسری طرف اِس فرضی ہوّے کے خلاف "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگائے گئے۔ اور آپس میں لڑ مرے۔ چنانچہ آرہ، ڈھاکہ اور بمبئی کے مسلسل امن سوز اور انسانیت سوز دنگے اِسی بدلی ہوئی ذہنیت کا نتیجہ ہیں ع تقدیر ہنس رہی ہے تدبیر رو رہی ہے"۔ حالات کچھ ایسے مایوس کن پیدا ہو گئے ہیں کہ بڑے بڑے چارہ ساز ملک و ملّت ہمت ہار کر بیٹھ رہے ہیں، معدودے چند ہی اَن تھک اور بلند حوصلہ ہستیاں ہیں جو ایسے مایوس کن حالات اور مخالف اثرات کے باوجود جادۂ اتحاد میں سرگرم عمل نظر آتی ہیں، اُنھیں مُبارک ہستیوں میں نمایاں شخصیت راجیندر بابو کی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ان ہی کی اتحادی مساعی اِن چند سطور کی محرک ہوئیں محض اس لئے کہ نااُمیدی میری فطرت نہیں جی چاہتا ہے کہ سچّے محبان وطن کے سامنے ایک مرتبہ پھر وہ تجاویز پیش کروں جو اِن مسائل پر میری ایک عمر کی کدوکاوش اور تجربہ کا نچوڑ ہیں۔ اگر ارباب وطن نے توجہ کی تو مجھے قوی اُمید ہے کہ یہ معمولی معمولی اُصولی باتیں اپنی عملی سادگی اور نفسیاتی اثر اندازی کی بدولت باہمی منافرت و بے اعتمادی کے دھارے کو اب بھی پھیر سکتی ہیں۔

(۱) اسکول کے بچوں کے تعلیمی کورس اور رُجحانات کی نگرانی وطن پرستانہ اور اتحادی نقطۂ نظر سے کی جائے۔ یعنی اُن کے کورس میں اتحاد، یک جہتی اور باہمی خوش اعتمادی پیدا کرنے والی چھوٹی چھوٹی نظمیں اور تاریخی کہانیاں داخل کی جائیں۔

(۲) پبلک میں محلہ وار تنظیم اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ معقول پسندی کا وسیع پروپگنڈا کر کے ہندوؤں میں سے چھوت چھات، اونچ نیچ، نفرت اور قدامت پرستی کے عناصر دُور کئے جائیں اور مسلمانوں کو چینی مسلمانوں کی وطن پرستی اور عربوں، ایرانیوں، ترکوں اور افغانوں کی ملکی غیرت اور خودداری کے حوالے دے کر اپنے وطن اور ابنائے وطن کی طرف سے محبت اور خوش اعتمادی پیدا کرائی جائے۔ غیرت مند قومیں حب وطن میں کسی سے پیچھے رہنا کبھی گوارا نہیں کرتیں۔ صرف دونوں فرقوں میں باہم رقیبانہ اسپرٹ کے بجائے برادرانہ اخلاق اور حُسن سلوک کے جذبات پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

(۳) اخبارات کے ایڈیٹروں کو اُن کی وطنی ذمّہ داری کا احساس دلا کر نفاق انگیز مضامین کی نشر و اشاعت سے روکا جائے اور اُس ایڈیٹر کی حوصلہ افزائی کی جائے جو اتحاد کے پرچار میں کامیاب رہا ہو۔

(۴) فرقہ وارانہ جماعتوں کے لیڈروں سے مل کر اور انھیں وطن کی ضرورت کا احساس دلا کر مخالفانہ نمایشی پروسیشن نکالنے، دل آزارانہ نعرے لگانے اور نفرت انگیز تقریریں کرنے سے روکا جائے۔ انھیں محبت اور خلوص سے سمجھایا جائے کہ وہ اپنی فرقہ وارانہ جدوجہد میں اُصولِ تہذیب و اخلاق ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ اور انسانی اخوت و رواداری ملحوظ رکھیں۔ تاکہ ہم دنیا کے دیگر ممالک کے سامنے ایک بلند اخلاقی معیار پیش کر سکیں اور ہماری پُرجوش زہریلی تقریریں پیٹھ میں چھرا بھونک کر گلیوں میں چھپ جانے والے مرد پیدا نہ کریں۔ غلاموں اور قیدیوں کا باہم گالی گلوچ کرنا یا مقابلہ پر آ جانا بہادری نہیں بلکہ اخلاقی بلندی سے مخالف کو پست کرنا ہی سچی بہادری ہے۔

(۵) عقلی اور ذہنی وسعتیں پیدا کر کے ہندوستانی سماج میں اتنی سمجھ پیدا کی جائے کہ انفرادی افعال کو جماعتی قرار دینے والی ذہنیت کی روک ہو سکے۔

(۶) باہمی سلوک کی تلقین کی جائے، مُسلم کانگریسمین ہندو حلقوں میں اور ہندو کانگریسی مسلمان محلوں میں گشت کر کے بچّوں کی تعلیم اور مصیبت زدوں کی امداد کی دیکھ بھال کریں، تاکہ دونوں فرقے ایک دوسرے کے احسان مند ہو کر باہم خوش اعتماد ہو سکیں۔ کانگریس والے غور کریں کہ کیا سچّے محبانِ وطن اور خاموش کارکنوں کے لئے خدمتِ وطن کا اِس سے بہتر اور مفید تر کوئی پروگرام ہو سکتا ہے؟ گورنمنٹ پالیسی کے خلاف ستیہ گرہ اگر ایک بلند اخلاقی احتجاج ہے تو کانگریسی خادمانِ وطن کی ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہیئے جو ہماری مشترکہ سماجی برائیاں اور کمزوری دُور کرنے کے لئے ستیہ پریم اور اہنسا کا پرچار محض پلیٹ فارم سے نہیں بلکہ عام پبلک سے مل جل کر اور اُن میں گھُل مِل کر کرے۔ تاکہ عوام کی اخلاقی ذہنیت بلند ہو کر دنیا کی نظر میں ہمارا مطالبۂ آزادی جائز سے جائز تر قرار پائے۔

(۷) ہندوؤں کے تیوہاروں میں مسلمان اور مسلمانوں کے تیوہاروں میں ہندو بڑی محبت اور خلوص سے حصّہ لیں، جہاں تک ممکن ہو ان تیوہاروں کو اپنائیں۔ ایک دوسرے کو ایسے مواقع پر مبارکباد دے کر اُن کی خوشی میں اپنی شرکت اور یک جہتی کا ثبوت دیں۔

(۸) اگر غیر ضروری مضامین کا بار ہلکا کر کے، ہندی اُردو، دونوں زبانیں اسکولوں میں

لازمی قرار دی جائیں تاکہ مشترکہ سادہ ہندوستانی زبان قبولِ عام سے رواج پا سکے۔ اور ایک دوسرے کے مذہبی کلچر اور مذہبی بزرگوں کی سوانح عمریاں پڑھکر اُن سے محبت کرنا سیکھیں۔

(۹) لفظ "ہندو" اور لفظ "مسلمان" کے بجائے "ہندوستانی" کا لفظ زیادہ سے زیادہ استعمال میں لایا جائے۔

(۱۰) ذہنیتوں میں رفتہ رفتہ بلندی اور گنجائشیں پیدا ہونے پر اس اتحادی پروگرام کے آخری اور ضروری زینہ بین الاقوامی شادیاں اور خونی تعلقات ہوں گے جن سے مُلک کے دو بڑے فرقے آپس میں ہمیشہ کے لیئے ناقابلِ علحٰدگی طور پر متحد و منسلک ہو جائیں گے۔

اگر "زمانہ" کے اوراق کے توسط سے یہ خیالات سچے خادمانِ ملک اور ہمدرد ذی اثر شخصیتوں تک پہونچ جائیں اور صوبجاتی وزراء اور اربابِ کانگریس یہ تعمیری کام ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو جائیں تو ہندو مسلم اتحاد کو بالفاظ دیگر آزادیِ وطن کو اب بھی ممکن اور یقینی بنا سکتے ہیں، خواہ دُنیا کی کوئی طاقت اُن کی راہ میں کتنے ہی روڑے کیوں نہ اٹکائے۔

کلامِ حسرت

مولانا حسرت موہانی کی دو تازہ غزلیں ہدیۂ ناظرین ہیں، پہلی غزل آل انڈیا مشاعرہ کانپور منعقدہ ۲۷۔ اپریل ۱۹۳۲ء کی ہے، دوسری غزل مشاعرہ بھیساول میں ۲۴۔ اپریل ۱۹۳۲ء کو پڑھی گئی تھی۔

(۱)

طالب ہوں فیضِ غم کا اِک حُسنِ بے نشاں سے — دستِ سوال میرا اُونچا ہے آسماں سے

اظہارِ آرزو کی آئی نہ اُن سے نوبت — دل نے دریغ رکھا اِس راز کو زباں سے

اِک طرفہ ماجرا ہے بادصفتِ خودنمائی — قصدِ حذر کسی کا انبوہِ عاشقاں سے

عشقِ بتاں ہے بیشک تمہیدِ حق پرستی — رقبہ ہے ملکِ دل کا ملحق دیارِ جاں سے

حسرت کو عاشقی میں تھا زعمِ پختہ کاری — پھر بھی شکستِ کھائی اُس شوخ نکتہ داں سے

(۲)

دل اُن کو دے کے خود بھی مٹا جا رہا ہوں میں — اپنے کئے کی خود بھی سزا پا رہا ہوں میں

پیباک اُنھیں بنا کے بہ تاثیرِ جذبِ عشق — مجبور وہ تو ہیں نہیں شرما رہا ہوں میں

باکار و بامراد صفاکیش و باخدا — سب کچھ تھا عہدِ عشق میں اب کیا رہا ہوں میں

چشمِ اشکبار

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ وکیل شاہجہانپور)

ممکن نہیں ہے دہر میں اے چشمِ اشکبار
موتی پروئے تیری طرح ابرِ نوبہار

اشکوں میں تیرے خفتہ ہیں طوفاں کی شورشیں
کوزے میں تیرے بند ہے اک بحرِ بے کنار

آنسو بہا کے محفلِ ہستی میں روز و شب
تو شمعِ انجمن کو بھی کرتی ہے شرمسار

جلتا ہے تیری گریہ وزاری کو دیکھکر
ٹکرا رہا ہے سر کو پہاڑوں سے آبشار

تازہ ہیں تیری اشک فشانی سے داغِ دل
رونے سے تیرے سینۂ ویراں ہے لالہ زار

بربادیاں عقب میں ہیں گو سیلِ اشک کے
اِس سیل سے بنائے محبت ہے استوار

جینے کا لطف جب ہے کہ بزمِ حیات میں
تارِ نفس کے ساتھ رہے آنسوؤں کا تار

اسرار تیرے دیدۂ بینا سے ہیں نہاں
تیرا وجود ایک معمّا ہے پیچدار

غمہائے بے قیاس رُلاتے نہیں تجھے
حد سے فزوں خوشی ہو تو ہوتی ہے اشکبار

عظمت کا تیری گرچہ زمانہ ہے معترف
لیکن مری نگاہ میں کم ہے ترا وقار

اپنی مصیبتوں سے فقط کام ہے تجھے
تو بےکسی پہ غیر کی روئی نہ زینہار

آنسو بہائے تو جو غریبوں کے حال پر
بن جائیں تیرے اشک گہرہائے شاہوار

ایران میں تحریکِ نسواں

(از مسز شیریں فوجدار)

گذشتہ صدی کے آخر تک بیرونی دنیا کے اہل الرائے اصحاب ایران کو ایک کمزور اور پس ماندہ ملک تصور کرتے تھے۔ ایران کے لوگ زیادہ تر جاہل اور گنوار کسان تھے۔ ایران قعرِ مذلت میں گرا ہوا تھا۔ اور ملک میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو مجلسی اصلاح کے لئے تیار اور آمادہ ہو۔ حالانکہ ایران کسی زمانہ میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا اور دنیا میں اُس کی حیثیت بہت ممتاز سمجھی جاتی ہے۔

ایران سرحد بازنطائن سے وسطی ایشیا تک اور خلیج فارس سے کوہ قاف کی برفانی چوٹیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے فرمانرواؤں کو تمام دنیا میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے دورِ عظمت میں ایران کی عورتوں کو پوری آزادی حاصل تھی۔ ایران کی عورتیں تمام علوم و فنون میں ماہر تھیں جو نسوانی ترقی کے لئے لازمی ہیں۔ فنِ سپہگری مثلاً گھوڑے کی سواری اور اسلحہ کے استعمال سے بھی ایران کی عورتیں بخوبی واقف تھیں، اور وقتِ ضرورت پر وہ مردوں کے دوش بدوش میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتی تھیں۔ چنانچہ اُن کے شاندار کارنامے آج تک اوراقِ تاریخ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

جب ایران اور بازنطائن کی سلطنتیں اسلامی فتوحات میں شامل ہوگئیں، تو اسلام کا ہر طرف دور دورہ ہوگیا، اور قدیم زرتشتی سلطنت کی تباہی کے ساتھ عورتوں کی آزادی بھی چھن گئی، اور اُنھیں حرم کی چہار دیواری میں دوبارہ مقید کردیا گیا۔ انھیں مالِ منقولہ کی طرح مردوں کی خوشی پر چھوڑ دیا گیا۔ اسلام نے عورتوں کا مجلسی درجہ بہت بلند کردیا تھا، لیکن مسلمانوں کی تنگ ذہنیت نے عورت کو پھر قعرِ مذلت میں گرادیا، اور اُس کی حیثیت ایک جانور سے زیادہ نہ رہی۔ اِس کی پرورش نہایت لاپرواہی سے کی جاتی کیونکہ لڑکے کی نسبت بڑی ہوکر وہ والدین کے لئے زیادہ مفید ثابت نہ ہوسکتی تھی۔ عورت کو تعلیم دینا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ لڑکی کا وجود والدین پر بارِ خاطر تھا۔ اس لئے اُس کی شادی آٹھ دس سال کی عمر میں ہی کردی جاتی، اور اُسے اس قدر ذلیل سمجھا جاتا کہ عورت کو زدوکوب کرنا عام ہوگیا۔ کیونکہ خاوند کے نقطۂ خیال سے عورت کو مارنے والی چھڑی خاص طور پر عرش سے نازل ہوئی تھی۔ شادی کی بے ثباتی اس حد تک پہونچ گئی کہ مرد کو حق حاصل تھا کہ وہ ایک عورت سے محض چند گھنٹوں، دنوں یا مہینوں کے لئے شادی کرلے

اور جب چاہے اُس سے علیحدہ ہو جائے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ عورتیں نہایت ناگفتہ بہ حالات میں گھر سے نکال دی جاتیں۔ اِن مجلسی مظالم کا اثر یہ ہوا کہ لاتعداد عورتیں بے حیائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئیں اور آبرو باختہ عورتوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔

چونکہ عورتیں علم و ادب اور مذہبی واقفیت سے قطعاً بے بہرہ تھیں اور اُنھیں معلوم نہ تھا کہ پیغمبر اسلام نے انھیں کیا مجلسی درجہ دیا ہے اس لئے بیچاری خاموشی سے مردوں کے مظالم برداشت کرتی رہتی تھیں؛ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایران کی اخلاقی پستی انتہا تک پہونچ گئی۔ ۱۸۴۴ء میں ایران میں ایک ایسا انقلاب آیا جس نے دیرینہ بداخلاقیوں کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکا۔ یہ انقلاب تحریک بہائی کا مرہونِ منت تھا، تحریک بہائی میں عورت اور مرد کا مجلسی درجہ بالکل برابر ہے۔ اِس تحریک میں شامل ہونے والی پہلی عورت خاتون قرۃ العین تھی۔ اس کی دماغی قابلیت اور بلند حوصلگی سے آزادیِ نسواں کی تحریک میں جان پڑ گئی۔ بقول پروفیسر براؤن اس اُولوالعزم خاتون کا ظہور ایران جیسے پس افتادہ مُلک میں معجزے سے کم نہ تھا۔ وہ چار دیواری اور پردہ کو خیرباد کہہ کر آزادیِ نسواں کی علمبردار بن گئی۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتی اور عورتوں کی آزادی کے حق میں تقاریر کرتی اور ہزارہا عورتیں اور مرد اس کے مداح بن گئے۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۰ء میں قرۃ العین ایک قومی شخصیت بن گئی۔ مذہبی پیشواؤں اور سرکاری عہدہ داروں کو خدشہ ہونے لگا کہ کہیں یہ عورت موجودہ نظامِ حکومت کو درہم و برہم نہ کر دے اس لئے اسے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ لیکن چونکہ اس کا رسوخ پبلک میں بہت زیادہ تھا اس لئے اسے ۱۸۵۲ء میں قتل کر دیا گیا۔ اگرچہ اس بہادر خاتون کی زندگی عین عالمِ شباب میں ختم کر دی گئی لیکن اس کی تحریک نہ دب سکی۔

باوجود مذہبی پابندیوں کے ایران کی عورت شاہراہ آزادی پر بدستور گامزن رہی۔ اور مرد کے برابر حقوق کا مطالبہ جاری رہا۔ اور سنہ ۱۹۱۰ء میں کئی زنانہ سوسائیٹیاں خفیہ طور پر معرض وجود میں آئیں، جن میں ہزاروں عورتیں شامل ہو کر رضاکارانہ کام پر تیار ہو گئیں۔

اسی سال ایک علم دوست خاتون طوبیٰ خانم نے پہلا زنانہ اسکول قائم کیا، چونکہ مذہبی پیشوا تعلیم نسواں کے سخت مخالف تھے اس لئے زنانہ اسکول کے کھُلنے پر بہت چراغ پا ہوئے۔ طوبیٰ خانم کو کافر قرار دیا گیا اور اُستانیوں اور طالبات کو زد و کوب کیا۔ اس لئے کابینۂ ایران کی توجہ اس طرف مبذول کی گئی، خوش قسمتی سے کابینہ میں چند افراد آزاد خیال تھے۔ اس لئے اُستانیوں اور طالبات کی حفاظت کے لئے آدھ درجن سپاہی مامور کر دئے گئے۔

بعد میں ایران کے شاعر اور اہل قلم حضرات بھی اس طرف متوجہ ہوئے اور بجائے گل و بلبل کی داستان سنانے کے اصلاحی ڈرامے اور نظمیں سپرد قلم کرنے لگے۔ چنانچہ عشقی جیسے انقلابی شاعر نے کہا ہے کہ "پردے نے ہماری عورتوں کو پس افتادہ بنا دیا ہے، عورت کی چادر یا اس کا منہ کا پردہ کیا معنی رکھتا ہے! یہ پردہ کفن ہے، جو لوگ اپنی عورتوں کو جیتے جی کفن میں ڈالتے ہیں اُن کو ڈوب مرنا چاہیئے۔ اگر عورتیں کفن میں ملبوس کر دی جائیں تو ہماری قوم کا نصف حصہ مردہ ہو جائیگا"
ایک دوسرے مشہور شاعر ایرج مرزا نے لکھا "ایران کی عورت کب تک پردہ میں رہیگی، مرد کی آنکھیں آخر کب کھلیں گی، کیا عورت بنی نوع انسان نہیں ہے؟ کیا وہ نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتی؟ عورت کی اہم ترین ملکیت اُس کی عصمت ہے نہ کہ چادر یا نقاب؟ اگر عورت بدعنوانیاں اختیار کرنا چاہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی، اس لئے بہترین تجویز یہ ہے کہ عورتوں کو مناسب تعلیم دی جائے قرآن کریم یا حدیث میں یہ کہیں بھی نہیں لکھا کہ عورتوں کو بد صورت بنایا جائے، پردے اور عصمت میں دُور کا بھی تعلق نہیں"۔

اخباروں اور اسٹیج پر بھی ملاؤں اور مذہبی ٹھیکیداروں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا گیا، آخرکار عورتوں کی آزادی اور ترقی میں ان کی تمام رکاوٹیں بے سود ثابت ہوئیں۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں جب رضا شاہ پہلوی نے عنانِ حکومت سنبھالی تو تمام ایران کی فضا بدل چکی تھی، اور آزاد خیالی کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ رضا شاہ نے آزاد خیال پبلک کی تمام توقعات پُوری کیں اور ایسی اصلاحات نافذ کیں جن کی ایک عرصہ سے ضرورت تھی۔ چنانچہ اصلاحِ نسواں کے سلسلہ میں ایک قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے تمام شادیاں اور طلاق سرکاری طور پر درج ہونے لگیں، شادی کے لئے لڑکے کی عمر کم از کم اٹھارہ (۱۸) سال اور لڑکی کی عمر کم از کم سولہ (۱۶) سال مقرر کی گئی۔ طبی لحاظ سے جو مرد یا عورت شادی کے قابل نہ ہو اُس کے لئے شادی کرنا ممنوع قرار پایا۔ کوئی مرد بغیر موجودہ بیوی کی رضامندی کے دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ عورت معقول وجوہات کی بنا پر طلاق حاصل کر سکتی ہے، شادی سے قبل لڑکے اور لڑکی کو کم از کم دو سال کا موقع دیا جائے جن میں وہ ایک دوسرے کی عادات و اطوار سے کما حقہٗ واقف ہو سکیں۔ اس طرح ازدواج محبت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ایک غیر ایرانی مرد ایرانی عورت سے شادی نہیں کر سکتا جب تک حکومت ایران سے اجازت نہ حاصل کی جائے۔

۱۹۳۶ء تک رضا شاہ پہلوی کے حرم میں ایک ایسا نقاب استعمال ہونے لگا جس میں ہاتھ پاؤں ننگے رہتے تھے، اور اسی لباس میں ملکۂ ایران ایک بہت بڑے تماشے میں شامل ہوئیں۔ اس

تقریب میں ملکہ کا چہرہ ایک دو دفعہ کھل گیا۔ چنانچہ بعض مذہبی لوگوں نے اس پر بہت ناک بھوں چڑھائی اور ملکہ کو تقریب میں داخلہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ملکہ نے اس بے عزتی کو برداشت نہ کرتے ہوئے رضا شاہ کو ٹیلیفون کیا۔ رضا شاہ اُسی وقت پچھتّر میل کا سفر طے کر کے پہونچے اور تمام حاضرین کے سامنے اُس مُلّا کو پیٹا جس نے ملکہ کو تقریب میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی تھی۔

مُلّاؤں نے شاہ کے اِس رویّہ سے بھانپ لیا کہ اب ہماری دال نہیں گلے گی، چنانچہ ان کا اقتدار ایران میں ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں ملکۂ ایران نے تمام یورپ میں بے پردہ سفر کیا۔ اِس کے دو سال بعد ایران میں پردہ قانوناً ممنوع کر دیا گیا۔ چنانچہ اُسی وقت سے ایران کی عورتیں اپنی مغربی بہنوں کے دوش بدوش جادۂ حیات میں گامزن ہیں۔ اور عورتوں کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے ہندوستان کی عورتیں بدقسمتی سے پس ماندگی، لاعلمی، ہیچ مقداری میں مبتلا ہیں، اور بدستور اسی پس افتادگی کی حالت میں رہیں گی جب تک انھیں اپنی بہتری کا خیال خود نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ قدرتِ کاملہ کبھی یہ نہیں چاہتی کہ جنسِ لطیف وہ کام نہ کرے جس کی اہلیت اس میں موجود ہے۔ خدائی انصاف کا بھی یہ تقاضا ہے کہ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہوں، کیونکہ دونوں جنسوں میں کسی کو بھی دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔ مسلم خواتین پر لازم ہے کہ وہ قرآن شریف کے معانی و مطالب سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ پیغمبرِ اسلام نسوانی آزادی کے کتنے بڑے علمبردار تھے قرآن کریم میں ارشاد ہے :-

> "مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے سر، گردن اور چھاتی کو ڈھانپیں، اور اپنی زینت اپنے خاوند، سسر، بیٹے، بھائی، بھتیجے، غلام اور بچوں کے سوا کسی پر ظاہر نہ کریں۔"

اِس میں چہرہ کا ذکر نہیں آیا، اگر زینت سے مراد چہرہ ہوتا تو صاف صاف ظاہر کر دیا جاتا کہ چہرہ چھپانا فرض ہے۔

آخر میں مَیں اپنی بہنوں سے کہوں گی کہ اگر تم پردے میں رہو گی تو عنقریب وہ وقت آئیگا جب تم اپنے شوہروں کی نظر سے گر جاؤ گی۔ ہر عورت کو چاہیئے کہ توجّہ سے تعلیم حاصل کرے اور اپنی فطری ہمت سے اپنے بدنصیب اور پست ملک کی ترقی میں کوشش کرے۔

بلیک ہول اور آرمینین

(از مسٹر نقی احمد خاں ارشاد فاطمی، بی۔اے (آنرز)، پٹنہ)

رسالۂ "زمانہ" ماہ ستمبر میں میرا مضمون بلیک ہول کی مشہور من گھڑت کہانی کے متعلق شائع ہو چکا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اُن چند آرمینین نوشتوں کو جو مہر لیب نہیں ہیں پیش نظر رکھکر اس واقعہ پر مزید روشنی ڈالوں۔ سب سے پہلے جس آرمینین نوشتے سے اِس اہم تاریخی واقعہ کا حوالہ ملتا ہے وہ ایک خط ہے، جو جوزف اِنرائن (Joseph Enrine) مشہور تاجر کلکتہ نے اپنے لڑکے کو لندن بھیجا تھا۔ اس خط میں جوزف اپنی تباہ حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے اِس واقعہ کا حوالہ دیتا ہے اور نواب کی شان میں کلمۂ بد استعمال کرتا ہے۔ خط کی زبان اس بات کی صاف شہادت ہے کہ جوزف کو مرحوم نواب سے کوئی خاص مخاصمت تھی، ورنہ اگر وہ صرف اس واقعہ ہی کو بیان کرتا تو ان الفاظ کو جو اُس نے نواب اور مسلمانوں کی شان میں استعمال کئے ہیں کبھی نہ کرتا، بلکہ صرف اپنی تباہ حالی ہی کا تذکرہ کرتے ہوئے یا اس واقعہ کا حوالہ سیدھے سادے الفاظ میں دیتے ہوئے خط کو تمام کرتا۔ لیکن بجائے سیدھے سادے الفاظ کے چند نہایت ہی نامہذب الفاظ جیسے بدمعاش سراج الدولہ (Wicked Sirajuddola) یا بے رحم مسلمان (Unmerciful Mohammadans) اس خط میں ملتے ہیں۔ ایک طرف تو نواب اور مسلمانوں کی شان میں وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے، اور دوسری جانب وہ انگریزوں کی مدح کرتا ہے، اور ان کو (Glorious English) کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک کی عیب جوئی اور دوسرے کی مدح سرائی کسی خاص مخاصمت پر مبنی ہے۔ ورنہ اگر جوزف حق بیں ہوتا تو دونوں کو ایک نظر سے دیکھتا۔

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے، ہال وِل ایکسو چھیالیس (۱۴۶) آدمیوں کا تذکرہ کرتا ہے جو تنگ و تاریک کمرے میں گھٹ گھٹ کر ہلاک ہو گئے تھے۔ مگر بخلاف اس کے ہلاک شدہ قیدیوں کی تعداد جو جوزف بتاتا ہے اُس میں اور اِس میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ جوزف کے خیال میں ہلاک شدہ قیدیوں کی تعداد چار سو (۴۰۰) تھی۔ یہ اختلافِ بیان بھی اپنی صداقت کو صاف روشن کر رہا ہے۔ اور صاف صاف لفظوں میں ظاہر کر رہا ہے کہ ہم میں کہاں تک صداقت ہے۔

ایک اور تذکرہ جس کا حوالہ پروفیسر سیڈلس (Saidlus) دیتے ہیں، وہ "تاریخ ہندوستان"

مصنفہ ٹامس خوجمین" (History of India by Thomas khasjmen) ہے۔ جوزف کی طرح ٹامس بھی ایک الہ آبادی آرمینین تاجر تھا۔ اس کی تاریخ الہ آباد میں ۱۸۶۵ء میں لکھی گئی تھی۔ مگر جس طرح ہال وِل اور جوزف کے بیان میں اختلاف ہے اُسی طرح جوزف اور ٹامس کے بیان میں بھی اختلاف ہے۔ ماسوا اس کے خود ٹامس کی تاریخ ہی محض دروغ مجسّم ہے اور اُس کا قلم اُس کی جہالت اور تنگ نظری کی صاف صاف شہادتیں دیتا ہے۔ ہمعصر تذکروں سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ نواب ناظم بنگالہ سے آرمنوں کے ایک عرصۂ دراز سے تعلقات چنداں کچھ اچھے نہ تھے اس باہمی تعلقات کی کشیدگی کا بڑا سبب آرمنوں کی خود پسندی تھی۔ یہودیوں کی طرح یہ بھی سازش کرنے میں بڑے ماہر تھے۔ ایک طرف تو ان سے انگریزوں سے ساز باز تھا، اور دوسری جانب نواب کی ڈیوڑھی تک رسائی تھی۔ نہ تو نواب مہابت جنگ کو اور نہ خود سراج الدولہ ہی کو ان سے کوئی وجہ مخاصمت تھی۔ ہاں البتہ سراج الدولہ کے کلکتہ پر حملہ کرنے کے بعد دونوں کے تعلقات ایک دوسرے سے بہت زیادہ کشیدہ ہو گئے تھے۔ اس مخاصمت کی بنا خود ارمنی تجّار نے ڈالی تھی۔ جس وقت نواب کے سپاہی فورٹ ولیم میں موجود تھے یہ مدراس گورنمنٹ سے موجودہ نواب کی حکومت کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ چنانچہ نواب کی غیبت میں چند سپاہیوں نے موقعہ غنیمت پاکر چند مالدار آرمنوں کو لوٹا بھی تھا۔

کلائیو کے کلکتہ پہونچنے پر جو صلح کمپنی اور نواب کے درمیان ۹۔ فروری ۱۷۵۷ء میں بمقام علی نگر ہوئی تھی، اُس میں منجملہ اور شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس حملے میں جو نقصان تاجروں کو پہونچا ہے، وہ نواب کی حکومت تاوان کی صورت میں ادا کرے گی۔ نواب کی تباہی کے بعد اور میر جعفر کی مسند نشینی کے وقت بھی یہی شرط علیٰ حالہ قائم رہی۔ بعد میں اس کا کیا حشر ہوا دنیا پر صاف روشن ہے۔

اب ایسی صورت میں جب ارمنوں اور نواب کے درمیان لاگ ڈانٹ چلی آتی تھی ہم کس طرح ان کے نوشتوں میں صداقت کی جھلک پا سکتے ہیں۔ پروفیسر ڈوڈوِل (Dod well) کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ نویس بھی اُسی بادۂ خالص کے جُرعہ نوش تھے جس کا ساغر ہال وِل کے ہاتھوں بزم سیاست میں پہلی بار چلا تھا۔ اسی طرح مسٹر واٹس (Mr. Wats) اپنی کتاب Apology of Conspiracy. میں اور اور لوگوں کے نام گنواتے ہوئے جو نواب کے خلاف سازشی کمیٹی میں شریک تھے چند آرمنوں کے نام بھی رقم کرتے ہیں۔ ان کی روح رواں جوزف اِنزائن تھا۔ ظاہر ہے کہ محض سیاسی

کشمکش کو گنجلک کرنے اور سازشی کارروائیوں کو اور زیادہ مستحکم کرنے کے لئے اس محض بے بنیاد واقعہ کا پروپیگنڈا کلکتہ سے لندن اور لندن سے مدراس تک کیا گیا۔ اس پروپیگنڈا میں نہ صرف انگریزوں ہی کا ہاتھ شامل تھا بلکہ اُن تمام خودغرض سیاسی افراد کا بھی ہاتھ تھا جو نواب کی تباہی کے بعد اپنا اپنا کیریر بنانے کی فکر میں مشغول تھے اور جنھوں نے موقع پا پاکر اپنے کو ہر طرح سے مالا مال کر لیا تھا۔

جب ہم اٹھارھویں صدی عیسوی کی تاریخ ہندوستان کا مطالعہ کرتے ہیں، تو اس قسم کے افراد بہ کثرت نظر آتے ہیں جو اپنی اپنی سیاسی چالوں سے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے چنانچہ تاریخ بنگال میں بھی ایسے افراد کی کمی نہ تھی، کشن چند، امین چند، جگت سیٹھ، ڈنبھ رام اور میر جعفر وغیرہ وغیرہ اسی قسم کے افراد تھے۔ اِن افراد کے ساتھ ساتھ بیرونی و اندرونی معاملات کو پرکھنے والے حضرات بھی موجود تھے جو ہندوستان کے تین کونوں پر بیٹھے بیٹھے اپنا سیاسی کھیل دکھا رہے تھے۔ اور رفتہ رفتہ اپنی سیاست کا جال بنگال سے اودھ تک پھیلا رہے تھے۔

نوائے راز

(از حضرت ابوالفضل رازؔ چاندپوری)

نگاہِ شوق وقفِ حسنِ فطرت ہوتی جاتی ہے
طبیعت محرمِ رازِ محبت ہوتی جاتی ہے

نمایاں شوخیِ رنگِ طبیعت ہوتی جاتی ہے
کہ ہر کافر ادا سے اب محبت ہوتی جاتی ہے

محبت آہ کیا شے ہے محبت، کیا کہوں تم سے
مجھے معلوم دل کی قدر و قیمت ہوتی جاتی ہے

مرا ذوقِ پرستش ہے جُدا سارے زمانے سے
محبت کرتا جاتا ہوں، عبادت ہوتی جاتی ہے

مَیں جتنا غور کرتا ہوں نظامِ بزمِ ہستی پر
اُسی نسبت سے ظاہر اب حقیقت ہوتی جاتی ہے

جفائے چرخِ کج بُنیاد کو راحت سمجھتا ہوں
دلیلِ راہِ عرفاں ہر مصیبت ہوتی جاتی ہے

قیامت ہے کہ اربابِ سخن سب اُٹھتے جاتے ہیں
نظر والوں سے خالی بزمِ نظرت ہوتی جاتی ہے

معاذاللہ! یہ بزمِ سخن، یہ نغمہ آرائی
کہ اک بازیچۂ اطفال حکمت ہوتی جاتی ہے

وطن والوں سے کوئی کاش کہہ دے رازؔ یہ جاکر
بہارِ زندگانی نذرِ غربت ہوتی جاتی ہے

ترانۂ شیکسپیئر

(از جناب مظفر حسین شمیم)

ہمارے مکرم دوست حضرت شمیم نے شیکسپیئر کے ایک دل آویز ترانہ کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے، اول تو کسی غیر زبان کا ترجمہ نثر میں ہی مشکل ہوتا ہے لیکن نظم کا ترجمہ نظم میں کرنا اور زیادہ کٹھن ہوتا ہے مگر شمیم صاحب نے جس لطافت سے انگریزی جذبات کو اُردو زبان میں ادا کیا ہے وہ ہماری داد سے مستغنی ہے (ا-ز)

سنا رہی ہے بہشت کے در پہ ایک کوئل نیا ترانہ
وہ صبح کا دیوتا بھی اُٹھا، وہ اُس کا رتھ بھی ہوا روانہ
وہ اُس کا اندازِ خسروانہ، وہ اُس کی شانِ قلندرانہ
بھری ہے سورج مکھی کی گنگا میں جگمگاتی مئے مغانہ
چھپا ہے گیندے کی انکھڑیوں میں حسین کرنوں کا کارخانہ
ہر ایک پتّی بنی ہوئی ہے بجائے خود اک شراب خانہ
پلا رہا ہے وہ اپنے گھوڑوں کو بڑھ کے یہ آبِ جاودانہ
وہ صبح انگڑائی لے رہی ہے وہ زندگی کا پیام آیا
اے میرے محبوب اُٹھ کہ اب آفتاب آتش بجام آیا

Hark, hark the lark at heaven's gate sings.
And phoeluns' gins arise,
His steeds to water at those springs
on chaliced flowers that lies.
And winking marry buds that his
To ope their golden eyes
With everything that pretty is.
My lady sweet, arise.
Arise! arise.

مُسافر کی ڈائری

قصّہ

(از مسٹر امرناتھ جوہری، ایم۔ اے)

(۱)

کرپا شنکر سال بھر ہی کا تھا کہ اُس کی ماں رُکمنی اِس جہانِ فانی سے چل بسی، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے باپ نے اُسے گھر کی بوڑھی خادمہ جسودا کی گود میں ڈال دیا۔ اور بولے "اِس بچّے کی پرورش اب تمھیں کروگی جسودا، تمھیں اب اس کی ماں ہو" جسودا کے اور کوئی بچّہ نہ تھا، اُس کے تین بچے اُس کی آنکھوں کے سامنے گذر چکے تھے، اُن کی صورت نظروں میں پھر گئی، ماما نے جوش کھایا، جذباتِ مادری سے وارفتہ ہوکر کرپا شنکر کو گود سے چمٹا لیا۔

بیوی کے مرتے ہی بابو رما شنکر کی گرہستی چوپٹ ہو گئی، اُن کے پاس زمین، جائداد روپیہ پیسہ کی کمی نہ تھی۔ ایک بینک میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے نوکر تھے، اس کے علاوہ کافی اثاثہ بھی تھا۔ مگر ایک مرتبہ جس محبت کے پودے کو سینچ چکے تھے، کسی دوسرے کو اس میں شریک نہ کرنا چاہتے تھے، دوستوں نے بہت اُونچ نیچ سمجھائے۔ بعض بڑے بوڑھے رشتہ دار ناراض بھی ہو گئے مگر رما شنکر دوسری شادی پر رضامند نہ ہوئے۔ گھر کے سب کام کاج کی دیکھ بھال جسودا کے ذمّہ رہی۔

اب رما شنکر کی تمام اُمیدیں اور تمنّائیں اپنے اکلوتے لڑکے کی ذات سے ہی وابستہ ہوگئیں جب تک گھر رہتے ہمیشہ اُس کو نظروں کے سامنے رکھتے۔ اُس کے کپڑے خود بدلتے اور باغ میں ٹہلانے لیجاتے اُس کے بال سنوارتے ہوئے اُنھیں ایک عجیب لطف حاصل ہوتا تھا۔ اُس کی توتلی بے معنی بولی سے اُنھیں معلوم ہوتا گویا رُکمنی یم لوک سے اُن سے باتیں کرنا چاہتی ہے۔ دفتر جاتے تو بددل ہوکر بیچ میں اگر کسی وقت لڑکے کی یاد آتی فوراً چھتری اُٹھاکر گھر آتے اور اُسے دیکھکر پھر چلے جاتے۔ شام کو جب دفتر برخاست ہوتا تو بہت تیزی سے گھر جاتے۔ جی چاہتا اڑکر جائیں اور کرپا شنکر کو دیکھ آویں، ملنا جلنا ہنسنا بولنا سب بند ہو گیا تھا۔ دوست آشنا عزیز، اقارب کسی کی اُنھیں فکر نہ تھی۔ وہ اپنے دل کے کونے کونے میں رکمنی ہی کی تصویر کا عکس پاتے تھے، اپنے دل میں ماں کے دل کی تکلیف محسوس کرتے تھے، جیسے کہ رکمنی کی روح اُن کے جسم میں سرایت کر گئی ہو۔

رفتہ رفتہ کرپا شنکر بڑا ہونے لگا، اب وہ ماں کے علاوہ اور الفاظ بھی بولنے لگا تھا۔ اپنی توتلی زبان میں جس وقت وہ باپوجی کے بجائے "دادو دی" کہتا، "یا" "پا" مانگتا تو رما شنکر کو عجیب لطف آتا۔ اُن کے پیٹ پر جب کبھی وہ لیٹتا یا بیٹھتا یا کبھی اُن کو تکیہ سمجھ کر کھیل کیا کرتا یا اُن کے کان اور بال کو کھینچتا تو رما شنکر پھولے نہ سماتے اور اُن کی آنکھیں بھر آتیں اور زور سے بچے کو سینہ سے لپٹا کر آرزوؤں کے اتھاہ سمندر میں گم ہو جاتے۔

اُنھوں نے ایک ڈائری بنالی تھی، اِسی میں وہ اپنی زندگی کے حالات تحریر کرتے جاتے تھے۔ روز رات کو جب گھر کے سب لوگ سو جاتے تب وہ اپنی اس "رفیقۂ حیات" کو کھولتے تھے۔ دیر تک اُسے پڑھتے پھر اُس میں آگے کا حال لکھ دیتے تھے۔ اِس ڈائری کے ایک ایک صفحہ پر، ایک ایک لفظ میں جو تمناؤں کے دفتر اُنھوں نے قلمبند کر دئے تھے۔ اُن سے اُنھیں دلی تسکین ہوتی تھی۔ بہت کچھ غور و خوض کے بعد اُنھوں نے اُس کا نام "مسافر کی ڈائری" رکھا تھا۔ اِس ڈائری کو اُنھوں نے اپنی زندگی کے سات دوروں میں تقسیم کیا تھا۔ پہلا دور بچپن کا زمانہ تھا جب اُن کے والدین زندہ تھے، دوسرا دور دس برس کی عمر سے لے کر (جب اُن کے والد نے اس دنیائے فانی کو خیر باد کہا) اٹھارہ ۱۸ برس کی عمر تک تھا۔ تیسرا اٹھارہ سے لے کر اب تک نو سال کی شادی شدہ زندگی سے متعلق تھا۔ یہ اس ڈائری کا سب سے دردناک باب تھا۔ چوتھا چل رہا تھا۔ اور اس کا نام اُنھوں نے "کرپا شنکر" رکھا تھا "طلوع" پیدائش سے لے کر ۱۵ سال تک" پانچویں کا نام تھا "خمار" ۱۵ سے ۲۵ تک چھٹے اور ساتویں دور میں کرپا شنکر کا نام غائب ہو گیا تھا چھٹے کا نام اُنھوں نے رکھا تھا "غروب" ساتویں کا نام ابھی تک سوچ نہیں پائے تھے۔ گذشتہ اور آئندہ زندگی کی اُنھوں نے اِسی طرح تقسیم کی تھی۔

(۲)

جاڑوں کے دن تھے، سرشام سے ہی لوگ لحاف اوڑھ لیتے یا انگیٹھی کے سامنے بیٹھ جاتے تھے لیکن رما شنکر کو اِن چیزوں سے کوئی مطلب نہ تھا۔ اُوور کوٹ پڑا پڑا سڑ رہا تھا لیکن اُسے کوئی پہننے والا نہ تھا۔ رکمنی نے ضد کر کے حال میں ہی بنوائی تھی، لیکن تب سے اب تک اُس میں کوئلہ نہیں پڑا تھا رما شنکر کو اب کسی بات سے مطلب نہ تھا۔ زندگی یوں ہی بسر ہو رہی تھی۔ گویا اُس کی رنگینی اور لطافت اُن کے لئے ختم ہو چکی تھی۔ جسبودا بارہا کہتی "اتنا غم کیوں کرتے ہو باپوجی! جانے والی تو چلی گئی اُس کے بھاگ میں اتنا ہی سُکھ دیکھنا بدا تھا" تو رما شنکر یہ کہہ کر ٹال دیتے "مجھے کسی کا کوئی غم نہیں ہے"۔

اُس دن پورنماشی کی رات تھی، رما شنکر بہت دیر تک بتی جلائے اپنی ڈائری لکھتے رہے۔ یہ دیکھکر

جسودا سو گئی۔ کرپا شنکر چھ سال کا ہو چکا تھا لیکن ابھی تک وہ جسودا کے پاس ہی سویا کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ حسب معمول سو رہا تھا یکایک پیروں کی آہٹ پاکر جسودا چونک اُٹھی آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ کھڑکی کے پاس سے کوئی شکل دھیرے دھیرے اُس کے سرہانے آئی اور کھڑی ہوگئی۔ پھر اس شکل نے جھک کر کرپا شنکر کے منہ پر اپنا منہ رکھدیا۔ جسودا نے بڑے ضبط سے کام لیا ورنہ چیخ اُٹھتی۔ چپکے چپکے اس شکل نے کواڑ کھولے۔ چاند کی کرنیں اندر آئیں اور جسودا نے دیکھا کہ وہ بابو رما شنکر تھے۔ آہستہ سے کواڑ بند کرکے وہ باہر چلے گئے۔

جسودا پسینے پسینے ہوگئی، چپ چاپ اُٹھی اور رما شنکر کا پیچھا کرنے لگی، چاندنی پھیلی ہوئی تھی، اس لئے وہ بڑی احتیاط سے چھپ چھپ کر چل رہی تھی۔ رما شنکر دائیں بائیں، آگے پیچھے دیکھتے ہوئے تیزی کے ساتھ جمنا کی طرف چلے جا رہے تھے۔ کنارے پر پہونچکر رک گئے۔ جسودا بھی تھوڑی دور پر ایک پیڑ کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ پھر اُس نے دیکھا کہ رما شنکر نے سب کپڑے اُتار ڈالے صرف نیکر پہنے رہے اور ٹھیک کنارے پر کھڑے ہوکر ہاتھ جوڑ کر چاند کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر اُنھوں نے جھک کر جمنا جل ماتھے سے لگایا۔ اور دھیرے دھیرے پانی میں اُترنے لگے۔ جسودا کانپ اُٹھی۔ ایسی ٹھنڈی رات میں ننگے بدن بابو رما شنکر کو پانی میں جاتے ہوئے دیکھکر اُس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ایک لمحہ کے لئے تو اُسے یہ خیال ہوا کہ رما شنکر کوئی بڑی تپسیا کر رہے ہیں جس میں خلل نہیں ڈالنا چاہئیے مگر اُس کی قوت ضبط جواب دے چکی تھی۔ اُس سے رہا نہیں گیا۔ وہ چیخ مار کر کنارے پر دوڑی "بابو جی" اور اُس کے ساتھ ہی ایک دوسری باریک چیخ سنائی پڑی "بابو جی" ایک لمحہ کے لئے اُس نے دیکھا کہ خوف سے کالا چہرہ کئے آنکھیں پھاڑے کرپا شنکر کھڑا ہے، اور پھر وہ بیہوش ہوکر گر پڑی۔

(۳)

وقت نے مسافر کی ڈائری کے صفحے پلٹے۔ کرپا شنکر سات برس کا ہوا، آٹھ کا ہوا، دس کا ہوا اور پھر میٹرک میں پڑھنے لگا۔ سالوں پہلے اُس دن جاڑے کی رات میں اُس نے جو بابو رما شنکر کو جمنا میں کھڑے دیکھا تھا۔ وہ یاد پوری طرح سے تو اب نہیں رہی تھی لیکن اُس کا دھندلا سا عکس اُس کے دماغ میں نقش ہوگیا تھا۔ غیر معلوم طور سے اُسے جمنا سے ڈر لگتا۔ اُس کے دوست اُس سے بوٹنگ کے لئے کہتے تو اُس کا تخیل اُس کے والد کی تنہائی میں لا کر اُڑتا۔ وہ ہمیشہ سست رہتا۔ والد کی محبت سے اُسے خوف معلوم ہوتا۔ اکلوتا لڑکا ہونے پر بھی وہ گھر میں شکایت کرنا نہ جانتا تھا۔ زور سے بولتا تو ڈر کر اِدھر اُدھر دیکھتا کہ بابو جی تو کہیں نہیں سُن رہے ہیں اسکول سے گھر آتے میں اگر دیر ہو جاتی تو اُسے ایسا لگتا گویا اُس کے والد اُسے کھا جائیں گے۔ والد کی

ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے کو بیکس سمجھتا، بابوجی سے وہ مَن کی باتیں نہیں کہہ سکتا تھا، بابوجی سے وہ رُوٹھ نہیں سکتا تھا۔ شام کو کھیل سے لوٹ کر ہمک کر وہ بابوجی کی گود میں نہیں چمٹ سکتا تھا۔ بہت دنوں سے اُس کا رونے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن آج تک وہ کبھی کھُل کر نہ رو سکا تھا۔ کھیل کود سے اُسے شوق نہ تھا، ہنسی دل لگی، یار دوست، سب سے وہ الگ رہتا، گویا پڑھنا لکھنا ہی اُس کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔

کرپا شنکر میٹرک میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا، والد کی خوشی کی حد نہ تھی۔ گھر بھر میں بچّوں کی طرح دوڑتے پھرتے تھے۔ جھبوا کی دھوتی میلی اور پھٹی ہوئی تھی۔ بہت جھُنجھلائے "تمھیں آج کے دن بھی یہی دھوتی پہننے کو رہ گئی تھی" نوکر بازار گیا تو وہیں کا ہو رہا۔ بابو پران ناتھ اتنی دیر تک بیٹھک میں بیٹھے رہے مگر مہارکباد کی کا ایک لفظ بھی منھ سے نہ نکلا، اُسی دن شام کو بہت بڑی دعوت کا انتظام تھا، شہر کے مشہور آدمی مدعو تھے۔ سب لوگ کرپا شنکر کی تعریف کر رہے تھے۔ بابو رما شنکر تو گویا آسمان میں اُڑ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اُنھیں بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ اتنی زیادہ خوشی اُنھیں اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

بہت رات جا چکی تھی، سب لوگ جا چکے تھے، گھر کے سب لوگ بھی سو گئے تھے، مگر رما شنکر ابھی تک اپنے کمرہ میں بیٹھے ہوئے "مسافر کی ڈائری" پڑھ رہے تھے، اُنھیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ایک دن ہی اُن کی زندگی کا سب سے قیمتی دن تھا۔ گویا وہ پیدا ہی اُس دن کے لئے ہوئے تھے رکمنی کی یاد تازہ ہو گئی اور روتے روتے اُنھوں نے لکھا :۔

"شکروار، ۱۴۔ جون، بھگوان میری یہ خوشی قائم رکھنا، آج رکمنی زندہ ہوتی تو شاید خوشی کے مارے پھُولی نہ سماتی۔ آج میری پندرہ سال کی محنت سپھل ہو گئی۔ جس اُمید کے سہارے میں زندہ تھا، وہ آج پوری ہوئی۔"

پھر کچھ جگہ چھوڑ کر لکھا تھا "آج کرپا شنکر کا عہدِ طفلی ختم ہو رہا ہے۔ بھگوان! رکمنی کی کوکھ کو شرمندہ مت کرنا۔ نہیں تو اُس کی روح کو سخت تکلیف ہو گی۔"

پھر آخر میں لکھا تھا "مستقبل کے جو خواب مَیں دیکھ رہا ہوں اُنھیں حقیقت بنا دینا..."

(۴)

لیکن مسافر کی زندگی کا پانچواں دور اتنی آسانی سے نہ گذرا۔ ایشور نے اُن کی بیکارسی ملنے نہیں یہ تو کوئی نہیں جانتا لیکن تقدیر نے رما شنکر کے آخری دورِ زندگی میں ضرب لگائی اس کا خواب میں بھی خیال نہ ہو سکتا تھا۔ زندگی کا "خمار" اتنی جلدی اُتر جائے گا، یہ اگر وہ سمجھتے تو شاید کرپا شنکر کے اِس حصۂ زندگی

کو وہ خار" قرار ہی نہ دیتے ۔ ایشور نے اُن کے لیئے اتنے دُکھ جمع کر رکھے ہیں، یہ اگر رکمنی کی موت کے وقت ہی پتہ چل جاتا تو شاید وہ اُسی وقت رکمنی کے ساتھ اُس کی چتا میں بھسم ہو جاتے اور یہ دُکھ دیکھنے کے لیئے زندہ نہ رہتے۔

کرپا شنکر اب کالج میں پڑھتا تھا، وہی ڈرپوک فطرت وہی اداس چہرہ، وہی مغموم تصویر، لڑکے مذاق اُڑاتے، اُس کے پژمردہ چہرہ پہ ہنسی آ جاتی۔ کسی چیز کا شوق نہیں، خالی گھنٹوں میں لڑکے تفریح کرتے، چائے اور رس گلّے اُڑاتے، کرپا شنکر چپ چاپ لائبریری میں جا کر بیٹھ جاتا، کالج میں ڈبیٹ ہوتی ٹینس ہاکی ہوتی، بوٹنگ ہوتی مگر کرپا شنکر سب میں غیر حاضر۔ اُس وقت وہ ماتھے پہ ہاتھ رکھے ریاضی کے کسی مشکل سوال یا کیمسٹری کے کسی اہم مسئلہ کو سلجھاتا ہوتا۔ زندگی میں کتنی رنگینی ہے، کتنا سُرور، اِس نوجوان کو اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ پروفیسر کہتے "کرپا شنکر اتنا زیادہ نہ پڑھو، تم نے جتنا پڑھا ہے اُس کے آدھے میں بھی فرسٹ ڈویژن لا سکتے ہو" تو کرپا شنکر ایک بے کیف ہنسی ہنس دیتا، کہتا "میں نے ابھی پڑھا ہی کیا ہے، دنیا کا لا محدود علم حاصل کرنے کے بعد بھی جب نیوٹن نے اپنے آپ کو بچہ بتایا تھا، تو میں کس گنتی میں ہوں۔"

لیکن رما شنکر نے ایک دن بھی اُس سے اِس کی بابت بات چیت نہ کی۔ معمولی طور سے یہ تو وہ کہتے رہتے تھے کہ "بیٹا اپنی تندرستی کا دھیان رکھنا، خوب پڑھو لکھو، اسی سے تم ایک دن بہت بڑے آدمی بن جاؤ گے" ۔ اور جب اس کے جواب میں کرپا شنکر اپنے دل و دماغ کی راکھ میں سے جلتا ہوا مختصر سا لفظ کہتا "بہت اچھا" اُس وقت رما شنکر کی نظر کسی کتاب پہ ہوتی، یا اپنی ڈائری پہ۔ اس وقت اگر وہ کرپا شنکر کے چہرہ کو دیکھ لیا کرتے، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیا کرتے، تو شاید وہ بہت کچھ سمجھ سکتے تھے، شاید اُنھیں احساس ہو سکتا کہ کرپا شنکر کے سینہ میں بھی ایک بچہ کا دل ہے، جو کھیلنا چاہتا ہے، ہنسنا چاہتا ہے، اُمنگوں کو پورا کرنا چاہتا ہے، زندگی کی رنگینیوں میں غرق ہونا چاہتا ہے شاید اُنھیں محسوس ہوتا کہ اُن کی غیر فطری زندگی اس ننھے سے بچے کے ملائم دل کو افسردہ بنا رہی ہے لیکن جب غم ہی زندگی کا انجام ہو تو کیا کوئی انسان اُسے روک سکتا ہے؟

اِس لیئے اچانک ایک دن جب کالج کے ڈاکٹر کی چٹھی اُن کے پاس پہونچی، تو وہ فالج زدہ انسان کی طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہ گئے۔ یہ کرپا شنکر کی ہیلتھ رپورٹ تھی، لکھا تھا "کرپا شنکر کے پھیپھڑے خراب معلوم ہوتے ہیں، اگر جلد ہی علاج نہ کیا گیا تو تپ دق کا اندیشہ ہے۔" اس کے ساتھ ہی پرنسپل صاحب کا بھی ایک خط تھا۔ اس میں لکھا تھا، کہ اگر کرپا شنکر ڈاکٹری معائنہ میں پاس نہ ہوا تو اُسے امتحان میں

بیٹھنے کی اجازت نہ ملے گی۔"

دو دن تک رما شنکر اپنے کمرے میں بند رہے، نہ کھایا، نہ پیا، نہ کسی سے بولے۔ زندگی کے جو ہوائی قلعے اُنھوں نے بنائے تھے وہ سب گرتے ہوئے نظر آئے، شروع سے اب تک کے واقعات دماغ میں پھر گھوم گئے، جگر میں ٹیس سی اُٹھی، اچانک اُنھیں اس رات کا خیال آگیا جب وہ جمنا جی میں کھڑے ہوئے اپنی تپسیا پوری کر رہے تھے۔ اُنھیں ایسا محسوس ہوا کہ شاید اس رات کا واقعہ ہی اس حالت کا باعث نہ ہو۔ یہ خیال اُن کے دماغ میں ایسا نقش ہو گیا کہ بارہا کوشش کرنے پر بھی وہ اس کو نہ بھلا سکے فضا میں اُنھیں ایک باریک چیخ سی سُنائی پڑی "بابوجی" دیوار پر نظر جما کر اُنھوں نے دیکھا، کسی کی دو بیٹھی ہوئی آنکھیں اُنھیں دیکھ رہی ہیں، باہر ہوا چل رہی تھی، اُنھیں معلوم ہوا گویا وہ چلّا رہی ہے "بابوجی" اُن کے سامنے دو چٹھیاں پڑی ہوئی تھیں، اُنھیں معلوم ہوا گویا وہ دو بیٹھی ہوئی آنکھیں ہیں۔

تیسرے دن وہ باہر نکلے، منہ زرد ہو گیا تھا، گویا قبر میں سے نکلے ہوں، عضو عضو میں درد ہو رہا تھا سیدھے کرپا شنکر کے کمرے کی طرف گئے، اُس کی کھانسی کی آواز سُنتے ہی ایک دم ٹھٹک گئے جیسے کسی نے جلتا ہوا بھالا سینے میں مار دیا ہو، پھر آہستہ آہستہ وہ اندر داخل ہوئے۔

جا کر دیکھا کہ کرپا شنکر واقعی بہت کمزور ہو گیا ہے، روز ہی اس کو دیکھتے تھے۔ لیکن آج معلوم ہوا جیسے اُسے برسوں بعد دیکھا ہو، جیسے اِس اثنا میں وہ اندھے ہو گئے ہوں، اُنھیں دیکھتے ہی کرپا شنکر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو بیٹھو" رما شنکر نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کیسی study ہو رہی ہے؟"

"خوب پڑھ رہا ہوں" کرپا شنکر نے کہا۔

"اور طبیعت کیسی رہتی ہے؟"

"طبیعت بھی ٹھیک رہتی ہے۔"

"اب تو بہت کمزور ہو گئے ہو، کیا بات ہے؟"

کرپا شنکر نے جھینپتے ہوئے کہا، "کچھ نہیں بابوجی، ادھر کچھ کھانسی کی شکایت رہتی ہے.... ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

رما شنکر نے پوچھا "کیا تمھارا ڈاکٹری معائنہ ہوا تھا؟"

"ہاں"!

"ڈاکٹر کچھ کہتے تھے؟"

کچھ رُک رُک کر کرپا شنکر نے کہا" یہی کہتے تھے کہ مجھے کچھ دنوں قطعی آرام کرنا چاہیئے"......
شاید مجھے تپ دق......"

رماشنکر نے بات کاٹتے ہوئے کہا" نہیں نہیں، ایسی بات منھ سے نہ نکالو، اپنی کھانسی کا علاج کراؤ اور آرام کرو، پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، کل ہی عرضی بھیجدو۔ ابھی تو تمھارے امتحان کے چھ سات مہینے ہیں......"

تھوڑی دیر بیٹھکر بابو رماشنکر چلے گئے، کرپا شنکر پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا ڈاکٹر کی کوئی چٹھی آئی ہے مگر پوچھ نہ سکا، دل کی بات دل ہی میں رہ گئی، اتنے میں اُس کے سینہ میں بڑی زور کا درد اُٹھا اور وہ دونوں ہاتھ سے سینہ دباکر پلنگ پر لیٹ گیا۔

(۵)

کرپا شنکر نے چارپائی پکڑ لی، بعض وجوہ سے بابو رماشنکر اُسے کسی سینیٹوریم (Sanatorium) میں نہ بھیج سکے۔ وہیں علاج شروع کردیا۔ سول سرجن ہر تیسرے روز آتے۔ کالون (Colvin) ہاسپٹل سے نرسیں بلوالی تھیں، بینک سے چھٹی لے لی تھی، دن رات کرپا شنکر کے پاس ہی رہتے، بہت سے جپ تپ پوجا پاٹھ کرائے۔ مگر اُن سب کا کوئی نتیجہ نکلتا ہوا نہ معلوم ہوا۔

کئی مہینے ہوگئے تھے، مگر کرپا شنکر کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، کھانسی کے ساتھ اب خون بھی آنے لگا تھا، جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ لیکن چہرہ پر وہی چمک تھی، کمزوری کے مارے اُٹھنا مشکل ہوگیا تھا، لیکن قوتِ گویائی میں کمی نہ آئی تھی۔

ایک دن شام کو جب کرپا شنکر ٹہل کر آیا تو اُس کی طبیعت بہت خراب ہورہی تھی تکان کے مارے کھڑا ہونا مشکل ہورہا تھا، آتے ہی چارپائی پر لیٹ گیا۔ رماشنکر بہت دیر تک اُس کے سینے کو ملتے رہے دوا پی کر کرپا شنکر کی آنکھ لگ گئی تو وہ بھی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ بہت رات گئے کرپا شنکر کی آنکھ اچانک کھُل گئی، اُس کے سینہ میں اُس وقت بھی بڑے زور کا درد ہورہا تھا، پاس ہی کے کمرے میں نرس اور جسو دا سو رہی تھیں، کھڑکی کی درازوں میں سے اُس نے دیکھا اُس کے والد کے کمرے میں روشنی ہورہی تھی اور باہر ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی جسودا کی لاپرواہی سے اُس دن کھڑکی ادھ کھلی رہ گئی تھی۔ بڑی تکلیف سے کرپا شنکر اُٹھا۔ بتّی جلائی اور کھڑکی بند کرنے لگا۔

اچانک اُس کے سینہ میں پھر زور کا درد ہونے لگا۔ اُس کے جی میں آیا زور سے بابوجی کو آواز دے لیکن تمام گھر کو جگا دینے کے ڈر سے وہ ایسا نہ کرسکا، اُس نے سوچا جاکر بابوجی کو بلا لاؤں، وہ آکر دوا

ئل دیں گے تو درد کم ہو جائے گا۔ ایک ہلکا سا کمبل اوڑھ کر وہ اپنے کمرہ سے باہر نکلا، ٹھنڈی ہوا کا جھونکا لگتے ہی اُسے معلوم ہوا گویا اُس کی ہڈی ہڈی کے اندر برف کے ٹکڑے بھر دیے گئے ہیں۔ مکان کا چوک پار کر کے وہ والد کے کمرے کے دروازے تک پہونچا۔ ذرا سا دھکا دینے سے ہی دروازہ کھل گیا۔ اور اندر جا کر اُس نے دیکھا کہ ایک تخت کے اوپر اُس کے والد سو رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا اور نیچے "مسافر کی ڈائری" کھلی پڑی تھی۔ ایک لمحہ کے لیئے اس کے دل میں اس ڈائری کو پڑھنے کی زبردست خواہش ہوئی۔ ہمیشہ ہی والد کے خلاف حکم سمجھ کر وہ اس خواہش کو دبا لیتا تھا۔ مگر آج اُسے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ ضمیر نے ہلکی آواز میں کہا " یہ پاپ ہے، یہ چوری ہے، لیکن پیر خود بخود اُس کی طرف چل دیئے آہستہ سے اُس نے وہ ڈائری اُٹھالی، اور دھیرے سے وہ دروازہ بند کر کے باہر آ گیا، اُسی وقت گھڑی نے دو بجائے۔

اپنے کمرہ کے کواڑ اندر سے بند کر کے اُس نے اُسے کھولا، والد کی زندگی کی یہ جو کہانی اُس کے سامنے تھی، اُس میں کتنی تکلیف، کتنا دُکھ، اور کتنی پیاس بھری ہوئی تھی۔ اس کا تجربہ اُسے پہلی ہی بار ہوا، صفحے پلٹتے پلٹتے اُس نے اُس واقعہ کا حال بھی پڑھا، جو دُھندلے سے خواب کی طرح اُس کے دماغ میں نقش تھا اُس کا دل لرز اُٹھا، ایک لمحہ کے لیئے اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے والد سیاہ لباس پہنے اُس کے سرہانے کھڑے اُسے پیار کر رہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں "چلو" پھر وہ ڈائری کے صفحے اُلٹتا گیا۔ اچانک ایک جگہ رُک کر رُک گیا، بڑے بڑے لفظوں میں سُرخ روشنائی سے لکھا تھا "باپ کے گناہوں کا نتیجہ بیٹے کو اُٹھانا پڑتا ہے ہے بھگوان، کون جانتا تھا کہ میرے دل کی آگ میرے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ کرپا شنکر کا بال بھی بیکا نہ ہونے پائے۔"

کرپا شنکر پڑھتا رہا اور روتا رہا، اپنی ماں کی فرضی تصویر اُس نے اپنی آنکھوں کے سامنے کھینچی، اُف اُس کی ماں آج زندہ ہوتی تو وہ دنیا میں کتنا خوش قسمت ہوتا۔ والد نے جو کچھ رکمنی کی بابت لکھا تھا اُس کا ایک ایک لفظ اُسے پاگل بنانے لگا۔ پھر جب اُس نے اپنی ماں کی موت کا حال پڑھا تو اُسے بے حد رنج ہوا۔ ڈائری میں لکھا تھا " آج دس بجے رکمنی کو بہت زور کی گرمی لگی، میں برابر پنکھا جھل رہا تھا، پھر رکمنی نے میرے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لئے اور بولی، " سوامی، اس جنم میں تو آپ کی کچھ سیوا نہ کر سکی، اُلٹے آپ کو جیون بھر دُکھ دیا" میں نے اُسے شانت کیا تو بولی " میرا ایک باغ ہے، اُس میں ایک سفید مکان ہے وہیں میں رہونگی، تم آؤ گے نہ؟ بولو، وہ دیکھو میرے للّو کا بیاہ ہو رہا ہے، کتنی سُندر بہو ہے، میں اپنی چمپا کلی اور اپنا ہار بہو کو دیدوں گی، اُس کے گورے گورے شریر میں زیور کتنی شوبھا دیگا

بولو، تم چپ کیوں ہو، للو کو آشیرباد بھی نہیں دیتے، بہو کے سر پر ہاتھ بھی نہیں رکھتے، تو سہاگ وتی ہو بہو ..... اور تھک کر کہا، رام، میں جواب کیسے دیتا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے رکمنی کو پکڑ لیا اور چلا اُٹھا، میں تمھیں نہیں جانے دوں گا، رکمنی ....." پھر اُس صفحہ پر رام ہی رام لکھا ہوا تھا، آخر میں لکھا تھا "آج رکمنی مجھے چھوڑ کر چلی گئی"۔ پھر لکھا تھا۔ "آج رکمنی نے سُہاگ کی ساڑی پہنی ہے، آج رکمنی کا بیاہ ہے، آج اگنی پھر اس بات کی گواہی دے گی" پندرہ دن بعد کی تاریخ میں لکھا تھا۔ "زندگی کی تحریک ہی گویا ختم ہو گئی ہے، میرا کسی کام میں جی نہیں لگتا، ہر وقت طبیعت چاہتی ہے کہ دنیا سے بھاگ جاؤں، ہے جگدیشور! رکمنی بغیر میں کیسے زندہ رہوں گا"۔

پھر ایک مہینہ بعد لکھا تھا، "میں زندہ ہوں، رکمنی ایک خواب بن گئی ہے، اور کرپا شنکر ایک حقیقت ہے بھگوان، تمھاری یہ کیسی لیلا ہے"

پڑھنے میں کرپا شنکر اتنا محو تھا کہ جب پانچ بجے تب وہ چونک اُٹھا، اُس وقت وہ اپنے والد کے نام رکمنی کا خط پڑھ رہا تھا، جو اُس نے شادی کے ایک سال بعد بھیجا تھا۔ خط محبت اور درد سے بھرا ہوا تھا یہ خط ادھورا ہی چھوڑ کر کرپا شنکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ احتیاط سے کواڑ کھولے، ابھی تک کوئی جاگا نہ تھا، والد بھی سو رہے تھے، ڈائری کو اُسی طرح اُسی جگہ رکھکر وہ واپس لوٹ آیا، دل بھرا ہوا تھا آنکھوں میں آنسو تھے، چوری کی شرم انھیں آنسوؤں میں بہہ گئی۔

—— (۶) ——

دوسرے دن کرپا شنکر کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ صبح سے ہی بڑے زور کی کپکپی پیدا ہو گئی، اور سانس زور سے چلنے لگی۔ آنکھیں رات کو جاگنے اور رونے کی وجہ سے سُرخ ہو رہی تھیں، چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا سول سرجن نے ہمت ہار دی، الگ سے جا کر بابو رما شنکر سے کہا "ویل، بابو صاحب ہم اب تک موت سے لڑتا رہا ہے، لیکن آج کیس ڈینجرس (Dangerous) ہے۔ ہم خدا سے تمھارے بچہ کے واسطے دعا مانگے گا" رما شنکر اُس کے پیروں پر گر پڑے "ڈاکٹر صاحب کسی طرح اس کو بچائیے، جو کچھ میرے پاس ہے سب آپ کو دیدوں گا۔"

مگر کرپا شنکر کی حالت میں کوئی ترقی نہ ہوئی۔ دن بھر بے ہوش پڑا رہا۔ رات کو اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا "بابوجی! مجھے معاف کرو۔"

رما شنکر نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تم جلد ہی اچھے ہو جاؤ گے بیٹا"

کرپا شنکر کو بڑے زور کی کھانسی آئی اور اُس میں خون بھی نکلا۔ پھر اُس نے کہنا شروع کیا "بابوجی!

مجھے چھوڑ کر کہیں چلے مت جانا"

والد نے بھرائے ہوئے گلے سے کہا "نہیں بیٹا میں کہاں جاؤں گا؟"

کرپاشنکر کہتا رہا "میری ماں کتنی اچھی تھی، بابو جی، تم نے اُسے کیوں جانے دیا؟ بچا کیوں نہ لیا، بابو جی"۔ پھر سانس لے کر کہا "مجھے ولایت بھیجو گے نہ بابو جی، میرے پروفیسر کہتے تھے مجھے ضرور ہی ولایت جانا چاہیئے، میں وہاں سے ڈاکٹریٹ لاؤں گا، کیوں بابو جی؟"

رماشنکر نے کہا "میں تمھیں ضرور ولایت بھیجوں گا"

بات کرتے کرتے کرپاشنکر تھک گیا، اور پھر خاموش لیٹ گیا، پھر غالباً وہ سو گیا، اور بہت دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا۔

رات بہت زیادہ جا چکی تھی، اچانک اُس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، اُسے معلوم ہوا کہ وہ جسودا ماں کے پاس سو رہا ہے اور اُس کے والد اُس کے ٹھیک سرہانے جھک کر اُسے پیار کر رہے ہیں، وہ کانپ اُٹھا۔ آنکھیں کھول کر اُس نے دیکھا کہ وہ اکیلا پڑا ہوا ہے۔ پھر یکایک اُسے والد کی ڈائری کی یاد آئی جس کو وہ ادھوری ہی پڑھ سکا تھا، آج کھڑکی بند تھی، اِس لئے وہ بڑی تکلیف سے اُٹھا اور دروازہ کھول کر دیکھا کہ والد کے کمرے میں اس وقت بھی روشنی ہو رہی تھی۔ اس کی تمام قوتیں سلب ہو چکی تھیں۔ ایک قمیص پہنے ہی وہ باہر آگیا اور والد کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ "مسافر کی ڈائری" کھلی پڑی ہے لیکن والد وہاں نہیں ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے "والد کہاں گئے؟" یہ سوال اُس کے دماغ میں پیدا ہوا، لیکن اُس نے گویا فوراً ہی اِس کا جواب پا لیا۔ آہستہ سے اُس نے اُس نے سڑک کی طرف کا دروازہ کھولا اور دھیرے دھیرے جمنا کی طرف چل دیا۔

اس دن بھی پورنماشی کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا، اور کرپاشنکر شہر کی تنگ گلیوں کو طے کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اُسے نہ ٹھنڈ لگ رہی تھی نہ تکان معلوم دیتی تھی، کوئی طاقت تھی جو اُسے کھینچے لئے جا رہی تھی اچانک دُور سے جمنا کو دیکھتے ہی اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ اُسے معلوم ہوا کہ بیچ جمنا میں اُس کے والد کا ڈھانچہ اپنے سفید دانت نکالے ہنس رہا ہے۔ ایک ہولناک چیخ اُس کے منہ سے نکلی "بابو جی" اور وہ وہیں گر پڑا۔

تین بجے جب رماشنکر کی آنکھ کھلی اور وہ کرپاشنکر کے کمرے میں آئے تو دیکھا کہ کرپاشنکر غائب ہے۔ پھر اپنے کمرے میں گئے تو "مسافر کی ڈائری" اُن کو دیکھ کر گویا ہنس پڑی۔

تنقیدِ کتب

ذکر و فکر

مصنفۂ مقصود زاہدی۔ اس کتاب میں تین سماجی مضامین اور آٹھ افسانے ہیں، مقصود حضرت ساغر نظامی صاحب ایڈیٹر "ایشیا" نے لکھا ہے۔ مضامین موجودہ ہندوستانی مسئلوں سے تعلق رکھتے ہیں، "ماحول" پہلا مضمون ہے، اس کے اندر ماحول کی سائنٹیفک تشریح کی گئی ہے، دوسرا مضمون "تعصّب" ہے اس میں فاضل مصنف نے اُن لوگوں کا تجزیہ اُتارا ہے جو بہت بڑھ بڑھ کر وفاقِ عالم کی ڈینگ ہانکتے ہیں مگر اپنی روزمرہ کی زندگی میں ادنےٰ سے ادنیٰ تعصبات کو بھی دور نہیں کر سکتے تیسرا مضمون "ہندوستان میں طبقاتی تقسیم" کے متعلق ہے۔ اس میں مصنف نے اشتراکی زاویۂ نگاہ سے ہندوستان میں طبقات کی تقسیم کی ہے۔ یہ مضامین معمولی طور سے اچھے ہیں اور خیالات کے لئے ہلکے سے تازیانہ کا کام دیتے ہیں مصنف کے دل میں سماج کا درد ہے اور انھوں نے گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہو کر بہت کچھ سوچا اور سیکھا ہے۔ مگر ان کے مضامین میں (Reformer) سدھارک کا جوش و خروش نہیں ہے احساس کی وہ تیزی، تخیلات کی وہ تڑپ، جذبات کی وہ ہنگامہ آرائی جو انسان کو زندہ بم کا گولہ بنا دیتی ہے اُن میں نہیں ہے۔ ان مضامین میں قوت کی کمی ہے۔

اس کے بعد افسانوں کا نمبر آتا ہے، ان میں سے تین "مغنّی" "دُکھتی رگ" اور "ڈاکٹر بیگ" مختصر خاکے ہیں ادبی نقطۂ نگاہ سے یہ بہت اونچے درجے کی چیزیں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ پانچ افسانے اور ہیں "میلے کو" "بندگی بیچارگی" "فریب خیال" "شاہد کی ڈائری" اور "جنسی تعلیم کا ایک موثر ذریعہ"۔

بندگی بیچارگی افلاس کی تصویر ہے، اور دو زاویات نگاہ کی کشمکش کا نقشہ ہے ایک بہن حد درجہ کی خدا پرست اور دیندار ہے۔ دوسری بہن ملحد اور بے دین ہے۔ مگر یہ کشمکش جذباتی کلائمکس کے درجہ تک نہیں پہونچتی۔ جنسی تعلیم کا ایک موثر ذریعہ بہت طنزی (Satirical) کہانی ہے۔ اس میں موجودہ زمانے کی کھلی جنسی تعلیم اور پُرانے زمانے کی پوشیدہ جنسی تعلیم کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مگر نئے اور قدیم اُصولوں کا تصادم پھیکا ہے۔ "شاہد کی ڈائری" کا مضمون کافی غور و خوض کے بعد منتخب نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں ہوسٹل کی زندگی کا تجزیہ اُتارا گیا ہے، شاہد اور پروفیسر صاحب کی عشق بازی، ہوسٹل کی مکدّر فضا، لبرل ایجوکیشن اور رومان پرستی کے نتائج۔ سب اس افسانہ میں منقوش کئے گئے ہیں، مگر گناہ کی یہ تصویر گناہ کے لئے نفرت پیدا نہیں کرتی بلکہ پڑھنے والے کے دل میں گناہ کی محبت پیدا کر دیتی ہے۔ نوجوانوں کے لئے شاہد اور پروفیسر کا تعشق عبرت انگیز

لہ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ ساغر۔ ادبی مرکز۔ میرٹھ۔ حجم ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۸ر

نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ دلآویزی لئے ہوئے ہے۔ یہ اخلاقی تنزل ہمیں دنیا کے بہترین ادب میں ملتا ہے پر الف لیلہ، قصہ طوطا مینا، زولا (Zola) اور آسکر وائلڈ (Oscar Wilde) وغیرہ کے افسانے اسی ضمن میں آجاتے ہیں۔

'میلے کو' اور 'فریب خیال' مصنف کے کامیاب افسانے ہیں۔ 'فریب خیال' ۳۵ صفحہ کا لمبا افسانہ ہے اس میں تمول اور افلاس کا دردناک تصادم دکھایا گیا ہے۔ راشد ایک نہایت مالدار آدمی کا لڑکا ہے۔ ایک غریب مگر ذہین ماسٹر فاضل سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں سوشل اونچائی اور پستی کی خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ افلاس کی مروت اور روا داری اور تمول کی بے اعتنائی اور طوطا چشمی بہت اچھی طرح دکھائی گئی ہے۔ اس افسانہ میں طول زیادہ ہے جو آرٹ کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ درجہ کی چیز نہیں ہے۔ پلاٹ کی ساخت میں چستی نہیں ہے جس کی وجہ سے جذباتی کلائمکس کسی ایک جگہ سب سے زیادہ قوت کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ منتشر ہو جاتا ہے۔ پلاٹ میں unity کی کمی ہے۔ فاضل کے علاوہ اس کے بھائی عاقل اور اُس کی ماں کا کردار بالکل صحیح ہے۔ اور جذباتی مصوری اُن میں کافی اچھی ہے۔

'میلے کو' نہایت کامیاب افسانہ ہے۔ یہ افسانہ Subjective ہے اور اس میں نفسیاتی کلائمکس کافی زوردار ہے۔ نصرو ایک غریب کا لڑکا ہے، نوچندی کا میلہ دیکھنے کے لئے اُس کے پاس کل تین پیسے ہیں، اتنے کم داموں میں وہ کیا کرے۔ ایک طرف میلے کی خوبصورت دلچسپیاں دوسری طرف نصرو کی بے بضاعتی ان کے تصادم سے جو کلائمکس نصرو کے چونی پا جانے کی خواہش کی شکل میں پیدا ہوتا ہے وہ بہت جاندار چیز ہے۔ اس کے علاوہ Subjective افسانوں میں جس ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی بہت صحت کے ساتھ کھینچا گیا ہے

مصنف نے ہندوستانی زندگی کو دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یہ کتاب اُن کی پہلی تصنیف ہے اور بقول حضرت ساغر نظامی "میرے خیال سے اُنھیں اس پر ناز نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہ نوید اُن کے لئے شاید کم نہیں کہ ایک جدید مصنف ان کی روح میں بیدار ہو رہا ہے"

(امرناتھ جوہری ایم۔ اے)

ہفت اورنگ

(مولفہ اقبال حسین انصاری)

یہ کتاب اقبال انصاری صاحب کی تالیف ہے جو لکھنؤ یونیورسٹی کے ممتاز گریجویٹ ہیں اور یونیورسٹی سے اپنی علمی تحقیقات کے سلسلہ میں دو طلائی تمغے بھی حاصل کر چکے ہیں۔ دو سال سے سراج الدین علی خاں آرزو پر پی ایچ۔ ڈی کے لئے ریسرچ کر رہے ہیں اور اُن کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ چنانچہ

اس سلسلے میں رسالہ نگار لکھنؤ میں اُن کے دو قابل قدر مضامین شائع ہو چکے ہیں

"ہفت اورنگ" ایران کی سیاسی و ادبی تاریخ ہے جس میں آٹھ سو برس قبل مسیح سے بیسویں صدی تک کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ مؤلف نے اپنی ذہانت سے پوری تاریخ ایران سات مقالوں میں تقسیم کردی ہے، یہ مقالات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) زردشت (۲) ایران میں شاعری و ادب (۳) فردوسی طوسی

(۴) چہار مقالۂ نظامی عروضی سمرقندی (۵) صوفیانہ لٹریچر (۶) لسان الغیب (۷) شیخ علی حزیں

مؤلف نے ان میں سے اکثر مضامین کے ماخذ بھی بتائے ہیں

دوسرا مقالہ جس کو کتاب کی جان سمجھنا چاہیئے ظہور اسلام سے لیکر رضا شاہ پہلوی تک کے لٹریچر کو محیط کئے ہوئے ہے۔ اس میں مصنف نے قابل قدر اختصار اور قابلیت کے ساتھ ایران کی ادبی تاریخ سے بحث کی ہے

تیسرا مقالہ فردوسی طوسی سے متعلق ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جائے گا۔ آخری باب میں شیخ علی حزیں سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ شائع ہو چکا ہے اور بقیہ دو حصے زیر طبع ہیں۔ اس کا طرز تحریر انگریزی ادب سے ملتا جلتا ہے۔ قابل مصنف کی بعض رایوں کے متعلق اختلاف رائے کی کافی گنجائش ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب کالج کے طالب علموں کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔

(اختر)

نغمۂ خاموش

یہ کتاب بابو شیام نراین ماتھر صاحب تمیر اکبرآبادی کے سنجیدہ اور مزاحیہ اور اصلاحی کلام کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ آپ ایک نغز گو اور پختہ کار شاعر ہیں۔ آپ کے دادا بابو ہرگوبند سہائے نشاط مرزا غالب کے ہمعصر اور ایک مشہور شاعر تھے۔ آپ کے نانا رائے بہادر منشی شیو رام نراین صاحب آرام غالب کے دوست اور مکتوب الیہ تھے۔ اس اعتبار سے تمیر صاحب ایک خاندانی اور مستند شاعر ہیں۔ اور آپ کو ماں باپ دونوں کی طرف سے دماغی قابلیتیں وراثتہً ملی ہیں۔ چنانچہ آپ کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اور ابھی آپ اسکول کے ایک کم عمر طالب علم ہی تھے کہ آپ نے بہت سی چیدہ چیدہ غزلیں مرتب کر کے گلزار شاکر کے نام سے شائع کیں جو اب تک موجود ہیں۔ اس زمانہ میں تمیر صاحب شاکر تخلص فرماتے تھے۔ آپ کے خاندانی ادیب ہونے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ آپ نے کم سنی کے زمانہ میں ہی کئی کتابیں مثلاً تصریح المصادر، لذت کونین، جگت پرماتم، بہار دوجہاں اور گلدستۂ یوگ لکھیں، تصنیف و تالیف کی یہ قابلیت خدائی دین ہے

یہ مجموعہ نظم و نثر مختلف رنگ کے خوشبو دار پھولوں کا ایک روح پرور گلدستہ ہے جس کے تین حصے ہیں، رنگ وحدت، رنگ تبسم اور فیشن ایبل تیلیاں۔ تینوں حصوں کا موضوع اسم بامسمٰی ہے۔ رنگ وحدت میں

سنجیدہ و رنگین کلام ہے جسے پڑھکر دل میں سرور اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے، نمونۃً ایک باعی مندرجہ

ملتا ہی نہیں ہم کو جواب ہستی گھٹتا ہی نہیں زور شباب ہستی
پیوند زمیں ہوا کہ ہو نذر آتش ہو جائیگی تیز اور شراب ہستی

رُباعی کے آخری دونوں مصرعے واقعات اور تجربات پر مبنی ہیں۔ نئی شراب کو زمین میں دفن کر دینے سے اس کی حدت اور تیزابیت کم اور مزا اور کیف زیادہ ہو جاتا ہے، اور یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ شراب اسپرٹ ہوتی ہے اور اسپرٹ نذر آتش کرنے سے شعلہ دیتی ہے۔ دیکھیے ذیل کے دو شعر کتنی دور کے کہے ہیں:۔

شش جہت میں بھی سما سکتی نہیں وحدت تیری بوئے گل کی طرح ہے پھیلی ہوئی کثرت تیری

بوئے گل سے کثرت کی وضاحت کرنا بالکل اچھوتی بات ہے۔ اسی طرح لفظ رنظر کو ذیل کے شعر میں بھی نہایت عمدگی سے سمویا ہے:۔

اب من و تو نہیں، اک حسن ازل ہر سو ہے دیکھنا یہ ہے کہ اب میں ہوں کہ باقی تو ہے

کتاب کے دوسرے حصہ میں مزاحیہ کلام ہے، جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام اور رائج الوقت انگریزی الفاظ کو خوش اسلوبی کے ساتھ سلک نظم میں پرو دیا ہے، اور مشرقی و مغربی مذاق کو عمدگی سے سمویا ہے، نمونہ حاضر ہے:۔

میں اگر دیکھوں تو دیکھوں غیر کیوں دیکھا کریں اب نہیں اچھا ہے رہنا روزنِ دیوار کا
جب سے اوبزرویٹری میں آ گئے مسٹر سپر سامنے رہتا ہے منظر اک نہ اک اسٹار کا

تیسرا حصہ فیشن ایبل تیتلیاں نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہے، نثر ایسی رنگین ہے کہ منشی سجاد حسین مرحوم کے اودھ پنچ کی یاد تازہ کر دیتی ہے اور اس کا پورا لطف کتاب پڑھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ نثر میں جگہ جگہ طنزیہ و مزاحیہ شعر داخل کر کے آج کل کی دلدادگانِ فیشن لیڈیز کے جو چٹکیاں لی ہیں وہ بہت پُرلطف ہیں دو چار شعر حاضر ہیں:

پھولے وہ پھول باغ میں حسن بہار کے بلبل گلوں کے لے گئی جمپر اتار کے
سڑتے گل ہیں بیٹی کوٹ کے دامانِ وائل میں مچل جاتی ہیں جیسے مچھلیاں آغوشِ ساحل میں

حصۂ نثر میں دو تین مضمون اور بھی ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شروع میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ نے ایک فاضلانہ دیباچہ لکھا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے شعر و سخن کے متعلق بعض بحث طلب مسائل پر بھی اظہار خیال کیا

Veyie کپڑا al Jumpers star al Observatory al

رفتارِ زمانہ

پچھلی مرتبہ رفتارِ زمانہ درج کرنے کے بعد سے ابتک ہٹلر کی دو تقریریں ہوچکی ہیں۔ پہلی تقریر اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں کی تھی جس کا لب و لہجہ کسی قدر سنجیدہ اور نرم تھا، یہ سنجیدگی غالباً اس لئے پیدا ہوگئی تھی کہ اُسے روس میں بالفاظ برنارڈ شا "مکھن کے اندر چھری کی طرح کاٹتے ہوئے بڑھنا نصیب نہ ہوا" وہ کسی خاص کامیابی کا اعلان نہ کرسکا بلکہ جرمنوں سے موسم سرما کی سختی برداشت کرنے کے لئے تحفے مانگنے پڑے۔ اُس نے یہ کہاکہ روس پر اُس نے مجبوراً حملہ کیا، کیونکہ جیسے ہی اُس نے ناروے میں حملہ کرکے برطانیہ سے نبٹنا چاہا ویسے ہی اُس کو معلوم ہوا کہ عقب میں بیشمار روسی فوجیں جرمنی پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اسی تقریر میں اُس نے یہ اعلان بھی کیا کہ پچھلے چالیس گھنٹوں سے روس پر ایک عظیم الشان حملہ ہورہا ہے یہ شدید حملہ ماسکو کی طرف کیا گیا، حملہ کا ایک رُخ شمال مغرب کی جانب سے یعنی کوہستان ولدائی کے جنوب میں سینن کراد اور سمولنسک کے درمیان اور دوسرا رُخ جنوب مغرب کی جانب سے ماسکو برانسک ٹولا وغیرہ لائن پر شروع ہو وہ مواقع جہاں پر ان حملوں نے روسیوں پر چھاپہ مارا کم و بیش وہ تھے جہاں روسی جنرل ٹموشنکو کی فوجوں کا تصادم مارشل وارو شلاف اور مارشل بوڈینی کی فوجوں سے ہوا تھا۔ اس حملے کے ساتھ ہی ساتھ سامنے سے بھی سمولنسک ماسکو لائن پر حملہ شروع کردیا گیا۔ جس کا مقصد وسطی محاذ کے مورچوں میں گویا ایک پچر ٹھونک دینا تھا۔ تاکہ مارشل ٹموشنکو کی فوجیں دوسرے جنرلوں کی فوجوں سے علحدہ ہوجائیں۔ اور وسطی فوج مختلف حصوں میں منقسم ہوجائے تاکہ ہر حصہ کا علحدہ علحدہ آسانی سے خاتمہ کردیا جائے۔ روسی لائن میں بہت جلد ٹوٹ شروع ہوگئی اور جگہ جگہ اکیسو چالیس میل کی حد تک گہرے گہرے پچر ٹھونک دیئے گئے۔ مرکزی دھاوا بالخصوص کامیاب ثابت ہوا۔ چند دنوں ہی میں جرمن فوجیں ویازمہ تک جو ماسکو سے صرف اکیسو چالیس میل ہے پہنچ گئیں۔ بہترین روسی فوجیں جو نزدیک تھیں سماً مدد کے لئے بھیجی گئیں ہر چند روسی فوجوں نے شدت سے مقابلہ کیا مگر ویازمہ اُنھیں خالی ہی کرنا پڑا روسی فوجوں کے پیچھے ہٹ جانے سے اُن کا کثیر حصہ پچھڑ گیا۔ لیکن اس کے بعد ہی یہ فوجیں نازی افواج کے حلقے توڑکر اپنی فوجوں سے آملیں۔ آخرکار جرمن حملہ بھی موجائسک پر جو ماسکو سے چالیس میل ہے روک دیا گیا۔ اس کے کچھ دنوں پہلے سوویٹ گورنمنٹ اور غیر ملکی سفارتیں ماسکو سے جنوب مشرق میں ساڑھے پانچسو میل کے فاصلے پر واقع Kujbyshev کے لئے روانہ ہوگئی تھیں۔ یہ مقام وولگا (Volga) پر واقع ہے۔ ماسکو کے شہریوں سے

یہ مضمون ۳۰۔ نومبر ۱۹۴۱ء کا لکھا ہوا ہے۔

اپیل کی گئی کہ وہ بھی شہر کی حفاظت میں جان توڑ کوشش کریں۔ اطلاع ملی ہے کہ روسی فوجیں موجائسک سے ہٹ آئی ہیں۔ جرمنوں کا شمالی مغربی دھاوا زیادہ کامیاب نہ ہوسکا کیونکہ روسیوں نے بھی شدید حملے کرکے انھیں Kalinin سے آگے جو ماسکو سے ۱۰۰ میل ہے بڑھنے نہ دیا۔ جنوبی مغربی sector میں جرمن تولا تک پہونچ سکے ہیں جو گھمسان لڑائی کے باوجود ابھی تک روسیوں کے قبضے میں ہے۔ ماسکو پر جرمن حملے کی وجہ سے لینن گراڈ پر جو دباؤ دشمن کے حملے کا تھا کسی قدر ہلکا پڑ گیا۔ آخر نومبر ۱۹۴۱ء تک یہ حصہ روسیوں ہی کے ہاتھ میں ہے گو کہ اس سے پیشتر مشہور ریلوے جنکشن Tikhvin روسیوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ (وروالگا لینن گراڈ ریلوے کو بھی جرمنوں نے کاٹ دیا تھا۔

یوکرین میں جو انحطاط روسی حملے میں شروع ہوگیا تھا اس اثنا میں جاری رہا، خارکوف جو ایک صنعتی شہر ہے، آخر اکتوبر تک جرمنوں کے ہاتھ میں آگیا۔ اڈیسہ بھی دس ہفتے تک شدید مقابلے کے بعد روسیوں کے ہاتھ سے نکل گیا روسیوں نے شہر خالی کرنے سے پہلے اُسے جلا کر خاک کردیا۔

ماسکو پر حملے کے ساتھ ساتھ جرمنوں نے جزیرہ نمائے کریمیا پر اپنا دباؤ بڑھانا شروع کردیا۔ روسیوں نے پارکوف پر انھیں روکے رکھا مگر آخر میں اُن کو پسپا ہونا پڑا۔ اور نومبر کے پہلے ہفتے میں جرمنوں نے بڑھ کر روسی فوجوں کو دو حصوں میں توڑ دیا چنانچہ ایک حصہ نے جزیرہ نما سباسٹاپول کے راستے سے خالی کردیا۔ اور دوسرے نے کرچ کے راستے سے۔ ان سطور کے لکھتے وقت تک سباسٹاپول کی بیرونی حفاظتی حدود جرمنوں کے قبضے میں آچکی ہیں۔ روسیوں نے کرچ کو بھی خالی کردیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ Don-Basin پر قبضہ جمانے کے لئے کوشش کی جارہی ہے۔ چنانچہ بندرگاہ Rostov پر جو Don کے دہانہ پر واقع ہے تسلط کرلیا ہے۔ Rostov اور Kirch پر قبضہ ہوجانے کے بعد کاکیشیا کے لئے جنگ شروع ہوگئی ہے اور جرمن دھاوے کو روکنے کے لئے روسی انتہائی پامردی سے مقابلہ کررہے ہیں۔

مشرق وسطیٰ

روس کا شروع سے تقاضا تھا کہ جرمنوں کے خلاف ایک دوسرے محاذ پر بھی جنگ چھیڑ دی جائے۔ اس وقت براعظم یورپ میں کسی محاذ پر جرمنوں کے خلاف معرکہ آرائی ممکن نہیں ہے، کیونکہ ہٹلر کا تمام یورپ بھر میں سکہ چھایا ہوا ہے اور فرانس کا پورا ساحل اس کے قبضے میں ہے۔ اس لئے برطانیہ نے لیبیا کے صوبہ سرینایکا میں جنرل کننگ ہم کی ماتحتی میں جرمنوں کے خلاف معرکہ چھیڑ دیا۔ اس اچانک حملے کا مقصد یہ ہے کہ مثلث سولم۔ کیپوزو۔ طبرق میں گھری ہوئی جرمن فوجوں کو تباہ کردیا جائے۔ چنانچہ پچھلے دنوں سے فولادی ٹینکوں کی شدید ترین جنگ جاری تھی جس میں فریقین کو بہت سا نقصان اٹھانا پڑا اب لڑائی پیدل فوج میں نہایت سختی سے جاری ہے۔ پہلے دن برٹش فوجیں جرمن علاقہ کے اندر پچاس میل تک گھس گئیں اور سیدی رزیغ (جو طبرق کے جنوب مشرق میں تھوڑے ہی فاصلہ پر واقع ہے) اُن کے قبضے میں آگیا۔ برٹش فوج طبرق میں سے باہر آکر اتحادی افواج کے

مل ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور جرمن اس کی پوری مزاحمت کر رہے ہیں۔ اس شدید اور تازہ جنگ میں انگریزوں کو بڑے فائدے ہیں۔ اب اُن کی ہوائی طاقت بھی جرمنی سے بڑھ رہی ہے اور رسد رسانی کا انتظام بھی بہت اچھا ہے۔ یہ حملہ کامیاب ثابت ہوا تو سویز اور بحیرۂ روم کا انگریزی بیڑہ دشمن کے ان حملوں سے محفوظ ہو جائے گا جو لیبیا کی بندرگاہ سے کرتا ہے۔ اس کے علاوہ روس کو کوئی خاص مدد اس حملہ سے نہیں مل سکتی۔

مشرق بعید | واشنگٹن میں ایڈمیرل نومورا (Admiral Nomura) کی بات چیت کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا جس کی وجہ سے ٹوکیو کے فوجی افسر برافروختہ ہو گئے۔ چنانچہ پرنس کونویو Prince Konyo کی کیبنٹ کو مستعفی ہونا پڑا اور جنرل ٹوجو (General Tojo) کی رہنمائی میں ایک نئی وزارت قائم ہوئی۔ جسے "سو فی صدی جنگی کیبنٹ" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی ساتھ جاپان کے تعلقات روس کے ساتھ خراب ہو گئے۔ جس کے معنی سیاسی حلقوں میں یہ لئے گئے کہ روس کے ساتھ وہی برتاؤ کیا گیا جس طرح شکست فرانس کے بعد اٹلی نے اتحادیوں کے ساتھ کیا۔ اور اس خیال کو اس بات سے مزید تقویت حاصل ہو گئی کہ منچوریا میں جاپان نے تقریباً ایک کروڑ فوج اکٹھا کر رکھی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جاپان کی نئی وزارت کے کئی ذی اثر رکن سائبیریا پر حملہ کرنے کے حق میں ہیں۔ جرمن ریڈیو بھی جاپان کو اس حملہ پر اُکسا رہا ہے۔ مگر ابھی تک سائبیریا پر حملہ نہیں ہوا، شاید اس لئے کہ جاپان امریکہ کی جانب سے مطمئن نہیں ہے۔ جاپان کے بعض مقتدر مدبر سنگاپور، جزائر شرق الہند اور آسٹریلیا پر بحری حملہ کرنے کے حق میں ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پچھلے چند ہفتوں سے جاپانی فوجوں نے ہند چینی میں پوری مداخلت شروع کر دی ہے۔ اور جاپانی اخبارات علانیہ الزام بھی لگا رہے ہیں کہ تھائی لینڈ جاپانیوں کے خلاف انگریزوں کے ساتھ مل کر ساز باز کر رہا ہے۔ اور جرمن اخبارات بھی ان کی ہمنوائی کر رہے ہیں۔ ابھی تک کوئی خاص کارروائی نہیں کی گئی ہے اور جاپان کو ہنوز امریکہ کی طرف سے اطمینان حاصل نہیں ہے۔ جاپان نے حال ہی میں ایک سفیر خاص یعنی مسٹر کروسیو کو پریسیڈنٹ روزویلٹ اور اُن کے وزیر خارجہ مسٹر کارڈل ہل سے بات چیت کرنے بھیجا ہے۔ مگر آخر نومبر تک جو خبریں اُن کی مختلف ملاقاتوں کے بارے میں موصول ہوئی ہیں اُن سے یہی ثابت ہو رہا ہے کہ امریکہ جاپان کی خواہشات پوری کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور نہ وہ چین کے متعلق اپنی پالیسی بدلنے کو تیار ہے۔ اسی دوران میں جاپان کے ایک وزیر نے اپنے یہاں کی پارلیمنٹ میں ایک سخت تقریر کی جو امریکہ اور انگلستان کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا۔ غرض آپس کی غلط فہمیاں بڑھتی ہی جا رہی ہیں ۹ نومبر ۱۹۴۱ء کو لندن میں مسٹر چرچل نے ایک تقریر کے دوران میں یہ اہم اعلان کیا کہ برطانیہ ہر حال میں امریکہ کے ساتھ ہے۔ اور اگر امریکہ کو جاپان کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑا تو برطانیہ بھی ایک گھنٹے کے اندر جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا۔ برطانیہ نے سنگاپور، ملایا۔ اور برما وغیرہ میں فوجی انتظامات بھی مکمل کر لئے ہیں۔

۶ دسمبر ۱۹۴۱ء کو

امریکہ نے فلپائن وغیرہ میں جاپانی کارروائیوں کے مقابلہ کا پورا بندوبست کر لیا ہے۔ غرض جنگ کا پورا سامان تیار نظر آرہا ہے، البتہ پہل جاپان ہی کو کرنا ہوگی۔ دیکھئے جاپان کے ارباب حل وعقد صلح کو ترجیح دیتے ہیں یا جنگ کو۔

ہندوستان

وائسرائے کی کونسل کی توسیع کردی گئی اور اب ہندوستانی ممبران کی تعداد غالب ہوگئی ہے۔ سر اکبر حیدری، مسٹر رگھویندر راؤ، سر فیروز خاں نون، سر سلطان احمد، مسٹر انے اور سر نلنی رنجن سرکار حکومت ہند کی ذمہ داری میں شریک ہوگئے ہیں۔ مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ مسٹر جناح کو مسلم لیڈران کا کونسل کی ممبری قبول کرنا نہایت ناگوار گذرا، اس لئے انھوں نے بڑی ردوکد کی، ان معززین سے جواب طلب کئے اور ان کے خلاف اظہار رائے کیا۔ گورنمنٹ ہند سے بھی اظہار ناراضگی کے طور پر مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے نئے اجلاس میں ممبران مسلم لیگ نے شرکت نہیں کی۔ کانگریس نے تو پہلے ہی سے بائیکاٹ کر رکھا ہے چنانچہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کے ممبران شریک اجلاس نہیں ہوئے تو اسمبلی میں ہندوستانی ممبران کی تعداد صرف ایک درجن کے قریب رہ گئی۔ اس پر بھی اس مختصر جماعت نے کئی قابل قدر تجویزیں پاس کرلیں اور گورنمنٹ نے بھی انمیں کوئی مداخلت نہیں کی۔ چنانچہ اٹلانٹک چارٹر کی دفعہ ۳ کی جو تاویل مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ نے کی ہے اسمبلی نے اُس کے خلاف ریزولیوشن پاس کردیا۔ اسمبلی نے ایک ریزولیوشن ہندوستان و برما کے معاہدہ کے خلاف بھی پاس کیا ہے جسمیں اس معاہدہ کو اُن وعدوں کے خلاف بتایا گیا ہے جو وقتاً فوقتاً پارلیمنٹ میں ہندوستان سے برما کے متعلق کئے جاچکے ہیں۔ اسی مقصد کا ایک ریزولیوشن سیلون اور ہندوستان کے متعلق بھی پاس کیا گیا ہے۔ سیاسی قیدی بھی بہت جلد رہا ہونے والے ہیں۔ پچھلے سال مسٹر جوشی کو گورنمنٹ نے نظربند قیدیوں سے ملاقات کرنے کی اجازت دی تھی تاکہ وہ انکی شکایات کا پتہ لگائیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کے متعلق اپنی رپورٹ گورنمنٹ ہند کے پاس بھیجدی ہے مگر گورنمنٹ تاحال اس پر کوئی فیصلہ نہیں کرسکی جس پر نظربند قیدیوں نے بھوک ہڑتال شروع کردی۔ چنانچہ مسٹر ممدوح نے اسمبلی میں اس مطلب کا ریزولیوشن پیش کیا کہ ہندوستان کے تمام سیاسی قیدیوں کو فوراً رہا کردیا جائے۔ چونکہ اس تجویز کا اطلاق دیولی کیمپ کے نظربندوں پر بھی ہوتا تھا اس لئے مسٹر میکسویل نے اس کے متعلق صوبجاتی گورنمنٹوں سے مشورہ کرنے کے لئے زور دیا۔ اس پر یہ ریزولیوشن واپس لے لیا گیا تاکہ گورنمنٹ کو اس پر مزید غور وخوض کا موقع مل جائے۔ مگر ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ مسٹر جوشی اور بعض دیگر اشخاص کی کوشش سے نظربندوں نے بھوک ہڑتال بھی ختم کردی۔

اسی اثنا میں مسٹر ایمری کی ایک تقریر اور ہوئی جس میں انھوں نے حسب توقع اٹلانٹک چارٹر کے متعلق مسٹر چرچل کے بیان کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان اٹلانٹک چارٹر کے سلسلہ میں اس قدر کیوں مصر ہے خصوصاً جبکہ سال گذشتہ کا اعلان نہایت واضح اور دُور رس ہے۔ اعلان اگست کا بار بار ذکر کرنا ہندوستانی رائے عامہ کی کھُلی ہوئی توہین ہے افسوس مسٹر ایمری ابتک اس بات کو محسوس نہیں کرسکے کہ اگست ۱۹۴۰ء کے اعلان سے نہ ہندوستانیوں کو تشفی ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ کاش وہ اسی حقیقت کو ذہن نشین کرسکیں کہ انکی ہر تقریر سے ہندوستانی مسئلے میں ہر دفعہ ایک نئی اُلجھن پیدا ہوجاتی ہے اس لئے اگر وہ کچھ اور نہیں کرسکتے تو کم از کم سکوت ہی اختیار کئے رہیں۔

(س۔پ)

٭ اس مضمون کے چھپتے چھپتے خبر آئی کہ جاپان نے برطانیہ اور امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کردیا ہے۔

THE ZAMANA, DEC. 1941 REGD. No. A 147

زمانہ

مرتبہ دیا نراین نگم

جلد ۷۷	دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء	نمبر ۶

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ۵ ممالک غیر سے آٹھ روپیہ

نمونہ سات آنہ

زمانہ

جلد ۷۷ — دسمبر ۱۹۴۱ء — نمبر ۶

محذوفاتِ شعر

(از جناب جلالی شاہجہانپوری)

شعر اپنی اثر انگیزی کے لحاظ سے از خود تیر و نشتر نہیں بن جاتا، بلکہ اس کے لئے مختلف النوع صورتیں اختیار کرنی پڑتی ہیں، اس کے بعد جسم شعر میں جان پڑتی ہے۔ اُن میں سے ایک مشہور صورت حذف اجزاء کی ہے۔ یہی چیز بعض صورتوں میں چمنِ شعر کی رنگینی میں سامانِ صدبہار پیدا کر دیتی ہے، اور بعض جگہ اسی سے شعر کی ساری لطافت و رنگینی برباد ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ جو مضمون شعر میں بیان کیا جائے اس کا اتنا حصہ نہ چھوٹنے پائے جس سے شعر کا مفہوم متعین کرنے میں سامع کو ہفتخواں طے کرنا پڑے۔ کیونکہ یہ عروس شعر کے حسن میں صورت خرابی پیدا کر دیتی ہے۔ بعض لوگ اس حذف کو اختصار لفظی سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بھلا اس اختصار سے کیا فائدہ جو فہم و خرد کی گرہ کشائی سے باہر ہو۔ شعر کی ادبی تعریف یہی ہے کہ "وہ کلام جس سے دل میں انبساط و ترنم کی ایک رنگین لہر پیدا ہو جائے"۔ لیکن جب عقل کو موشگافیاں کرنی پڑیں تو لطف و انبساط کا تخیل بھی موہوم۔ ایسے اختصار کو بلاغت کی اصطلاح میں اضلال کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

شاعر کا مدعا صرف یہ ہے کہ مگس کا باغ میں آنا کسی طرح ٹھیک نہیں، کیونکہ یہ باغ میں آکر پھولوں

کارس جو سے گی، نتیجہ میں اس سے شہد اور موم پیدا ہوگا، موم سے شمع بنے گی، اور شمع پر پروانہ اپنی جان قربان کرے گا۔ گویا نگس کا باغ میں آنا حقیقت میں خونِ ناحق کا باعث ہے۔ شعر کے اندازِ بیان میں اس قدر پیچیدگی اور اُلجھاؤ ہے کہ محذوفہ اجزا تک رسائی ہر شخص کی قوتِ فہم کا کام نہیں۔

تا خاکِ کفِ پائے ترا نقش نہ بستند
اسباب تپ و لرزہ نداد ند قسم را

اِس کا مفہوم متعین کرنے کے لئے سب سے پہلے دو باتوں کا ذہن نشین کرنا ضروری ہے:-

(۱) جھوٹی قسم سے تپ و لرزہ آجاتا ہے،

(۲) ممدوح کے خاکِ پا کی لوگ قسم کھایا کرتے ہیں۔

اب شعر کا مطلب یہ ہوا کہ قسم میں یہ تاثیر کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھائے گا اُس کو تپ چڑھ آئے گی، اُس وقت سے پائی جاتی ہے جب سے ممدوح کے کفِ پا کا نقش زمین پر بنا، اب اگر کوئی ممدوح کے کفِ پا کی قسم کھاتا ہے تو اُس کو تپ آجاتی ہے، ورنہ پہلے جھوٹی قسم سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس مضمون میں یہ حصّہ کہ "جھوٹی قسم سے تپ و لرزہ آجاتا ہے" کہیں مذکور نہیں اور نہ شعر کے مذکورہ اجزا، اس محذوفہ جز کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

عیش ایں باغ باندازۂ یک تنگ دل است
کاشش گل غنچہ شود، تا دلِ ما بکشاید (قدسی)

شعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا باغ ایک نہایت مختصر باغ ہے، اس میں صرف اس قدر وسعت ہے کہ ایک تنگ دل آدمی خوش ہولے، اِس لئے یہ نہیں ہوسکتا کہ میرا دل بھی اس میں شگفتہ ہو اور پھول کی کلی بھی کھل سکے، بدیں وجہ شاعر آرزو کرتا ہے کہ کاش پھُول کلی بن جائے اور میرے دل کی شگفتگی کے لئے بھی گنجائش نکل آئے۔ شعر کا یہ آخری حصّہ فی بطن الشاعر ہے اور بظاہر کوئی قرینہ بھی موجود نہیں جو اس جزءِ محذوفہ کی طرف رہنمائی کرسکے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے (غالب)

شعر معنی آفرینی کے اعتبار سے اپنی جگہ پر بالکل مکمل ہے، لیکن اس کا آغاز اور تقریب کچھ اس طرح نظروں سے اوجھل ہے کہ شارحین نے اس کا حقیقی مفہوم سمجھنے میں بڑے بڑے مغالطے کھائے۔ مثلاً طباطبائی مرحوم لکھتے ہیں کہ "تجھ سے تو مجھے کوئی شکایت نہیں، لیکن نامہ بر کو میرا سلام شکایت آمیز پہونچا دینا"۔ مولانا حسرت موہانی رقم طراز ہیں کہ "نامہ بر سے میرا سلام کہیو، یعنی بطور طعن کے، کہ واہ کیا خوب ہمارا کام کیا"۔

دوسرے شارحین نے بھی اسی طرح کی قیاس آرائیاں کی ہیں جو حقیقت شعر تک کسی نوع نہیں پہنچتیں۔ چونکہ مصنفِ شعر خوب سمجھتا تھا کہ آغاز اور تقریب کا سمجھنا دشوار ہے اس لئے اُس نے خود ہی شعر کا صحیح مفہوم سمجھانے کی کوشش کی، ملاحظہ ہو:-

"یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے، یعنی عاشق کو ایک قاصد کی ضرورت ہے، لیکن اندیشہ یہ ہے کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے، ایک دوست اُس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اُس سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد الیہ ہے، میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ خیر اُس کے ہاتھ خط بھیجا گیا قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا، قاصد مکتوب الیہ کو دیکھکر والہ و شیفتہ ہوگیا۔ کیسا خط، کیسا جواب، دیوانہ بن، کپڑے پھاڑ، جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس واقعہ کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے، کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر! اے ندیم! تجھ سے کچھ کلام نہیں، لیکن اگر نامہ بر کہیں ملے تو اُس کو میرا سلام کہیو، کہ کیوں صاحب! تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا۔"

اگر صرف الفاظ کی مدد سے اس شعر کا مطلب بیان کیا جائے تو محذوفہ اجزا تک رسائی بہت مشکل ہے کیونکہ اِن الفاظ میں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں، جو اِن اجزا تک ذہن کو پہونچا سکے۔

غم سے دل خون ہو، اور آنکھ میں صہبائے نشاط
یہ کہیں میرے ہی تخئیل کی پرواز نہ ہو

یہ شعر بھی مفہوم کے لحاظ سے دلکش ہے، لیکن بعض حصے اس طرح فی بطن الشاعر ہیں کہ شعر ایک چیستان اور معمّہ بنکر رہ گیا ہے۔ شعر کو بار بار پڑھیئے مگر اس کے تلمیحی مفہوم کی طرف عنانِ توجہ منعطف نہیں ہوتی۔ اور خصوصاً "یہ" کا مشارٌالیہ تو صرف مصنف کے سمجھنے کی چیز ہے۔ مصنف کی زبانی شعر کا تلمیحی مفہوم سننے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ شاعر کو کسی وجہ سے یہ یقین ہوگیا کہ اُس کی محبوبہ اُس پر فریفتہ ہے لیکن مشکلات کے سر بفلک پہاڑ حائل ہونے کی وجہ سے ملاقات کا تخیل ...... محال وجنون، کاہشِ فراق نے اُس کے دل کا خون کر دیا ہے۔ حُسنِ اتفاق کہیئے یا خوش نصیبی کہ ایک مرتبہ شاعر کو دیدار نصیب ہوگیا..... اور قریب سے، محبوبہ کی چشمان مست جوشِ نشاط سے چمک رہی تھیں، تبسم پیہم مسرتِ قلبی کا آئینہ دار تھا، رشکِ ماہتاب چہرہ پر شادمانی کی موجیں کھیل رہی تھیں، خوشی اور مسرت کا عالم دیکھکر شاعر کا حسرت زدہ اور اُمیدوں بھرا دل دھک سے ہوگیا، اُس کا خیال تھا کہ اندوہِ جدائی نے اُس کی محبوبہ کو غم سے نڈھال کر دیا ہوگا، آنکھوں سے حزن و ملال ٹپکتا ہوگا، مستی میں ڈوبے ہوئے چہرہ سے یاس و حسرت برستی ہوگی۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ اب اُسے خیال آیا کہ شاید میں خود فریبی میں مبتلا ہوں، شاید یہ محض میرے تخیل کی کارفرمائی ہے کہ میں نے اپنی محبوبہ کو اپنا والہ و شیدا خیال کر لیا ہے۔

اور یہ فرض کرلیا ہے کہ جس طرح غم جدائی اور اندوہِ فراق نے میری جان پر بنادی ہے اُسی طرح اُسے بھی خون در جگر کر رکھا ہے۔ اگر غمِ الفت نے اُسے اِس درجہ غمزدہ بنایا ہوتا جتنا میں سمجھ رہا ہوں تو چہرہ پر اس قدر آثار نشاط کا پایا جانا ممکن نہ تھا۔ دوسرے مصرع میں "یہ" سے شاعر کا مفروضہ مراد ہے کہ میری محبوبہ میری پرستار ہے اور غمِ الفت سے اُس کا دل بھی خون ہوگیا ہے۔"

جب تک سامع کا دماغ پوری طرح اس واقعہ سے واقف نہ ہو، اُس وقت تک اجزائے محذوفہ تک جو فی لبطن الشاعر ہیں، ذہن کی رسائی ناممکن سی ہے۔ ایسے وسیع اور تلمیحی مفہوم کو شاعر کے موجودہ الفاظ پورے طور پر ادا نہیں کرتے اور نہ کوئی ایسا قرینہ موجود ہے جو صحیح مفہوم تک ذہن سامع کی رہنمائی کرسکے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مضمون کا اتنا حصہ صحیح طور سے محذوف مانا جاسکتا ہے جس سے معانی کے سمجھنے میں ناقابل فہم پیچیدگی اور ناقابل رسائی بُعد نہ پیدا ہو جائے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مضمون کے کسی جزکا چھوٹ جانا چمن شعر کی لطافت و تازگی میں سامانِ صد بہار پیدا کردیتا ہے۔ لیکن اسی شرط کے ساتھ کہ شعر میں ایسے الفاظ یا جملے موجود ہوں جو ذہن کو جز محذوف تک آسانی سے پہونچا دیں۔ اگر ایسے الفاظ و اشارات موجود نہیں تو یقیناً کلام کی شگفتگی اور رنگینی میں کمی پیدا ہو جائے گی۔ مولانا حالیؔ "مقدمۂ شعر و شاعری" میں لکھتے ہیں کہ "جو الفاظ حذف کئے گئے ہوں اگر وہ بغیر ذکر کے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں تو محسنات شعر میں شمار کئے جاتے ہیں۔"

حقیقت میں کلام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ الفاظ مختصر سے ہوں اور مضمون وسیع۔ لیکن اس اختصار کے ساتھ مفہومِ شعر میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہو۔ اسی چیز کے پیش نظر عربی ادب میں کلامِ خوب کی تعریف میں یہ مختصر سا مگر جامع جملہ کہا گیا ہے "خَیْرُ الْکَلَامِ مَا قَلَّ وَدَلَّ" یعنی بہترین کلام وہ ہے جس کے الفاظ قلیل ہوں مگر معنی کثیرہ پر دلالت کرتے ہوں۔ قلت الفاظ کے ساتھ معانی کثیرہ کی صحیح ترین مثال "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ" ہے۔ دنیا کے تمام نیک و بد افعال گنا کر جزا و سزا کو بیان کرنا کتنا وسیع مضمون ہے لیکن صرف اس جملہ کے کہہ دینے سے معاً یہ تمام مضمون ذہن میں آجاتا ہے کہ جو اعمال ہم یہاں کریں گے وہاں اُس کا ثمرہ ضرور ملے گا۔ دوسری مثال "کردنی خویش آمدنی پیش" ہے۔ الفاظ اتنے قلیل اور مختصر لیکن معانی میں کس قدر وسعت۔ اس ایجاز کی ایک قسم بلاغت کی اصطلاح میں ایجاز حذف کہلاتی ہے جس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ کلام کا کوئی جز اس نہج سے محذوف ہو کہ جس کی طرف سامع کا دماغ کلام سُنتے ہی منتقل ہو جائے۔ مثلاً:-

یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں اور یہ کیفیتیں
کون رہ سکتا ہے تیرؔ ایسے ساماں دیکھکر

چاروں طرف کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، عطر بیز اور فرحت آگیں ہوائیں چل رہی ہیں کیف و سرور کی بارش ہو رہی ہے، ہوا میں شراب کی سی مستی ہے۔ ایسے بہار بداماں اور میخانہ بدوش موسم میں نیز! کون ایسا کوتاہ قسمت ہوگا جو پینے اور پلانے کی آرزو نہ رکھتا ہو کیونکہ پینا اور پی کر بہک جانے کا سارا لطف اسی شراب پرور موسم میں ہے۔ شاعر نے اس آخری ٹکڑے کا شعر میں ذکر نہیں کیا، لیکن شعر کے اندازِ بیان اور اس کے سابق اجزا سے یہ محذوفہ جز ہر شخص کے دماغ میں آجاتا ہے اور اسی انداز نے شعر کے صہبائے حسن کو دو آتشہ سے سہ آتشہ بنا دیا ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا، مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیئے

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میں محبوب کے کاشانۂ دولت پر پہونچا تو پہلے خاموش رہا، پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا۔ لیکن جب شوقِ دیدار میں دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹنے لگا تو میں نے فرطِ شوق میں پاسبان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا، اس پابوسی سے وہ حقیقت واقعہ تک پہونچ گیا، اور اُس نے اس کے نتیجہ میں میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو اُس کو اس صورت میں کرنا چاہیئے تھا۔"

اس شعر سے نہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کہاں کا ہے اور نہ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ شوریدگیٔ عشق کی وجہ سے بیچارے عاشق کا کیا حال ہے، اور یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ پاسبان کے قدم لینے کا کیا نتیجہ ہوا۔ مگر 'پاسبان'، 'گدا سمجھ کے'، 'مری جو شامت آئی' ایسے اجزا موجود ہیں جن سے اُن اجزا کا بآسانی پتہ چل جاتا ہے جو بطنِ شاعر میں موجود ہیں۔

حسد سے دل اگر آزردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

انسان جب گھر کی چہار دیواری میں محصور رہتا ہے تو اُس کو دنیا و مافیہا کی مطلق خبر نہیں ہوتی، اور نہ دنیا کے ترقی و تنزل کے اسباب کی اس کو اطلاع ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر سوسائٹی کا کوئی فرد ترقی کے مدارج طے کرتا ہوتا ہے تو وہ بوجہ حسد اس کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن دوستی و مروت کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے اُسی قدر یہ بات اُس پر واضح ہوتی جاتی ہے کہ خود دنیا کی خوشحالی نتیجہ ہے صرف اُس کی محنت و کاوش اور تدبیر و ذہانت کا۔ یہ تو جائے رشک بھی نہیں حسد کیا معنی۔ لہٰذا خود بھی وہی وسائل و ذرائع اختیار کرنا چاہیئں جن سے عروس آسودگی سے ہم آغوشی حاصل ہو سکے۔ اس شعر میں "اے مخاطب" کا ٹکڑا محذوف ہے اور گرم تماشا ہو اس پر قرینہ ہے۔

مجھ تک کب اُس کی بزم میں آیا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

شاعر کا بیان ہے کہ" مجکو بزم محبوب میں ہزاروں مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا، غیر نوازی تو ہمیشہ دیکھی لیکن میرے پاس کبھی جام نہ آیا، آج نہ معلوم ساقی اپنے دستور اور معمول کے خلاف یہ مہربانی کیوں کررہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اُس نے شراب میں کچھ ملا دیا ہے، خواہ یہ ساقی کی شرارت ہو یا رقیب کی سازش" اِس شعر کا یہ حصّہ کہ" پھر آج دستور کے خلاف مجھ تک جام کیوں آیا" فی بطن الشاعر ہے، اور ذہن کی رسائی جزرِ محذوفہ تک نہایت آسانی سے ہوجاتی ہے۔

دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے
ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا (حالی)

" اب دوستوں سے ملاقات نہ ہوسکے گی" اس جگہ محذوف ہے، اور مصرع اُولیٰ کا اندازِ بیان اور الفاظ کی ترتیب اِس حذف پر قرینہ ہے۔

قاصد کو خط سمیت کیا پُرزے پُرزے ہائے
کیا جانے لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں

" اگر ایسا جانتا تو نہ لکھتا" اس جگہ محذوف ہے، قاصد کا خط سمیت پُرزے کیا جانا اور اندازِ تحریر پر اضطراب اس حذف پر قرینہ ہے۔

سخت شرمائے میں اتنا نہ سمجھتا تھا اُنھیں
چھیڑنا تھا تو کوئی شکوہ بیجا کرتا

یعنی میں اپنے محبوب کو بہت سادہ مزاج خیال کرتا تھا، اِس لئے میں نے اُسے چھیڑنا چاہا تو سچی شکایتیں کیں کہ وہ اُن سے ناراض و شرمندہ نہ ہوگا، لیکن وہ سمجھ گیا اور بہت شرمایا، اب مجھکو افسوس ہے، اگر چھیڑ چھاڑ ہی مقصود تھی تو جھوٹی شکایتیں کرنی چاہیئے تھیں، اس صورت میں وہ شرمندہ بھی نہ ہوتا، اور چھیڑ چھاڑ کا لطف بھی قائم رہتا۔ اس مضمون کا یہ حصّہ کہ" میں نے اُس کو چھیڑا، اور سچی شکایتیں کیں" محذوف ہے، اور مضمون شعر کے بقیہ حصّے اُس کی جانب کھُلی رہنمائی کرتے ہیں۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے، لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

اس جگہ" لیکن" کے بعد" یہ بھی تم کو معلوم ہے" فی بطن الشاعر ہے، اور" لیکن" ہی اس جزوِ محذوف

پر قرینہ ہے۔

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا (میرؔ)

مصرعۂ ثانی کے شروع میں "معلوم نہیں" محذوف ہے۔ اور شمع کا صبح تک سر دھننا اس پر دلیل ہے۔

خط لکھا اُس کو بہ اُمیدِ جواب
ہائے قسمت کا لکھا بھول گیا (نواب نصیر الدین خاں خیالؔ)

خط کا جواب "محال ست و جنوں" اس جگہ محذوف ہے اور مصرعِ ثانی اِس جزو محذوفہ کو صاف طور سے بتا رہا ہے۔

قندِ آمیختہ با گل نہ علاجِ دلِ ماست
بوسۂ چند بیامیز بدشنامے چند

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ "عاشق بیمار ہے، معشوق کو بھی معلوم ہوا کہ عاشق بیمار ہے اور دل کی بیماری ہے اس لئے وہ دوا کے طور پر گلقند لاتا ہے اور عاشق کو دیتا ہے، اب وہ محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ پھول جو قند کے ساتھ ملے ہوئے ہیں یعنی گلقند یہ میرے دل کا علاج نہیں ہے بلکہ اس کے لئے دوسرا ہی گلقند درکار ہے اور وہ یہ ہے کہ چند گالیوں میں چند بوسے ملا لو۔" اتنے وسیع مضمون کو دو مصرعوں میں ادا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں پر کلام کا ایک بڑا حصہ محذوف ہے۔ یعنی عاشق کا دل کی بیماری میں مبتلا ہونا اور معشوق کا اس سے واقف ہو کر گلقند لے جا کر دینا، لیکن کلام کی ترکیب ایسے منتخب الفاظ سے کی گئی ہے کہ ذہن فوراً غیر مذکور مضمون کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مثلاً "نہ علاجِ دلِ ماست" کا ٹکڑا صاف طور پر بتا رہا ہے کہ عاشق کو دل کی بیماری ہے۔ ورنہ علاج کی کیا ضرورت تھی۔

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اُس کے روبرو نہ گیا (میرؔ)

مصرعۂ اول میں "کہنے کو" اور مصرعۂ ثانی میں "جب اُس کا سامنا ہوا" محذوف ہے۔ اور دل میں مسودوں کا ہونا اور اُس کے روبرو پیش نہ جانا اِس حذف پر قرینہ ہے۔ اِسی مفہوم کو خود میرؔ نے دوسرے انداز سے پیش کیا ہے لیکن وہ محذوفات جو طائرِ مضمون کو آسمانِ ہفتم پر پہونچا دیتے ہیں اس جگہ موجود نہیں اس لئے شعر کے اثر میں کہ بائیت پیدا نہ ہو سکی۔

کہتے تھے اُس سے ملے تو کیا کیا نہ کہیئے لیک وہ آ گیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات

اِسی سے ملتا جلتا ایک اور شعر ہے:۔

کہتے تھے کہ یوں کہتے جو یار آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اِن اشعار میں الفاظ کی بہتات کے بجائے اگر کچھ ایسے اجزار محذوف ہوتے جو سامع کے دماغ کو اجزائے محذوفہ کی طرف منتقل کر دیتے تو اِن اشعار میں بھی وہی اثر انگیزی اور کہربائیت پیدا ہو جاتی۔

اِس سلسلہ میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ شعر کے محذوفات اُسی وقت آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں جبکہ سلسلۂ مضامین سے صرف ایک سلسلہ حذف کیا جائے۔ اگر زیادہ سلسلے محذوف ہونگے تو ذہن کو اور اِک شعر میں پریشانیاں اُٹھانی پڑیں گی، کیونکہ اس صورت میں شعر کے معنی متعین کرنے میں پیچیدگی زیادہ ہو جاتی ہے اور ذہن اُس طرف منتقل نہیں ہوتا۔

اُردو اور پرتگالی الفاظ

پرتگالیوں کو اپنے دورانِ اقتدار میں ہندوستانیوں سے تجارتی، مذہبی اور سیاسی حیثیت سے برابر سابقہ پڑتا رہا چنانچہ آج اُردو زبان میں جو پرتگالی الفاظ مستعمل ہیں وہ اُسی دور کی یادگار ہیں۔ درحقیقت انگریزی کے بعد پرتگالی الفاظ کی تعداد اُردو میں خاصی ہے اُردو نے اپنے دامن میں دیگر یورپین زبانوں کے الفاظ کو بھی جگہ دی۔ پرتگالی بعض پھلوں کے پودے یا بیج اپنے ساتھ لائے۔ ان کے پرتگالی نام کچھ تغیر کے ساتھ رائج ہو گئے اور آج بھی عام ہیں۔ مثلاً انناس (پرتگالی Anannas) سنترہ (پرتگالی Cinta) موسمبی (پرتگالی Mozumbique) اکبر کی وفات کے بعد زراعت میں ایک نئی بات یہ پیدا ہوئی کہ تمباکو کی کاشت شروع ہو گئی جسکا علم ہندوستانیوں کو پرتگالیوں سے ہوا چنانچہ تمباکو اور ساگودانہ دونوں الفاظ پرتگالی ہیں۔ لباس کے متعلق بھی چند پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں داخل ہو گئے۔ مثلاً سایا (Saia) بٹن (Button) فیتہ (Fita) بعض چیزیں جو ہندوستانی گھروں میں ہوتی ہیں اُنکے نام بھی پرتگالی ہیں مثلاً۔ بالٹی (Baldi) بوتل (Bottle) الماری (Almario') میز (Meza')۔

ہماری زبان میں پرتگالی الفاظ کا تلفظ بہت کچھ بدل گیا ہے جس کی وجہ سے اب ہم ان کو اپنے الفاظ سمجھتے ہیں مثلاً

اردو	پرتگالی	اُردو	پرتگالی
مارتول	Martel	غنڈا	Gandaia
پادری	Padre	نیلام	Lelam
کارتوس	Cartouche	انگریز	Ingrez.

(عالمگیر)

میرے وطن

(از باوا کرشن گوپال مغموم بی - اے)

اے وطن! اے رشکِ جنّت! اے مرے ہندوستاں ۔۔۔ دولت و اقبال میں تھا تو کبھی فخرِ جہاں
وائے گردش! آج تو ہے کشتۂ تیغِ خزاں ۔۔۔ مدفنِ ویراں نظر آتا ہے تیرا بوستاں

پھر بھی اے میرے وطن! مجھکو محبت تجھ سے ہے[1]

صنعت و حرفت میں تھا لاریب اُستادِ زماں ۔۔۔ حکمت و علم و تصوف میں تھا یکتائے جہاں
دَورِ حاضر میں ہے کیا عبرت فزا تیرا سماں ۔۔۔ خوار تجھ سا اب نہیں کوئی ہے زیرِ آسماں

پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

آہ! وہ دن جب تو دستِ غیر سے آزاد تھا ۔۔۔ تیرا ہر فرزند عیشِ حرّیت سے شاد تھا
راحتِ جاوید سے مسکن ترا آباد تھا ۔۔۔ لیکن اب بھولا ہوں جو رنگیں فسانہ یاد تھا

پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

قابلِ نظّارہ تھی تیری بہارِ رنگ و بو ۔۔۔ خواب میں بھی غیر قوموں کو تھی تیری جستجو
برسرِ بازار گو لُٹتی ہے تیری آبرو ۔۔۔ بہہ رہا ہے آج گو تیرے شہیدوں کا لہو

پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

ہند! تھا اِک دن مسلّم تیرے دہقاں کا وقار ۔۔۔ اُس کے بَل بوتے پہ تھا تیری فضیلت کا مدار
داغِ عُسرت سے ہے سینہ آج اُس کا داغدار ۔۔۔ گو نہیں دامن ترا بھارت اُسے جائے قرار

پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

وہ ترا مزدور، وہ اِک پیکرِ مہر و وفا ۔۔۔ جس کی ہمت سے ہوئی تعمیر ایوانِ بقا
آج ہے سرمایہ داری کے ستم میں مبتلا ۔۔۔ رو رہا ہے تو بھی اُس کے حال پر صبح و مسا

پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

چل رہی ہے ہر طرف جہل و تعصب کی ہوا ۔۔۔ ہو رہا ہے گل محبّت کا چراغِ پُر ضیا

---

[1] یہ مصرعہ میرے دوست مسٹر جگن ناتھ آزاد بی ۔ اے . خلف منشی تلوک چند صاحب محروم کا ہے ۔ (مغموم)

ہندو و مسلم نے توڑا رشتۂ مہر و وفا　　　آشتی سے ہیں ترے فرزند گو نا آشنا

پھر بھی اے میرے وطن مجھ کو محبت تجھ سے ہے

خاک بر سر فکرِ روزی میں ہیں تیرے نوجواں　　　ہو کے بی۔اے، ایم۔اے بھی ملتی نہیں ہیں روٹیاں

تنگ آ کر تنگ دستی سے ہیں وہ آتش بجاں　　　آہ! اس پہ بھی ستم کرتا ہے تجھ پر آسماں

پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

مفلسی گو کر چکی ہے بادۂ عشرت حرام　　　پی رہے ہیں روز و شب ہم تلخیِ عسرت کے جام

جو تھے سلطانِ جہاں اب ہیں غلام ابنِ غلام　　　صبح ہے صبحِ الم، اور شام ہے حسرت کی شام

پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

قندِ پارسی

(از حضرت جلال الدین طالب)

لطف بر من کند و یا نکند　　　لطف باشد اگر جفا نکند

کن وفائے چو گفتمش گفتا　　　عمر ہرگز بکس وفا نکند

از تو اے گل دمے جدا باشم　　　پیشِ ایں روزِ بد خدا نکند

ہر چہ خواہد بمن کند بختم　　　کاشش در عشق مبتلا نکند

آرزویم بآں شود حاصل　　　بہر مرگم از آں دوا نکند

آنچہ با من تو مہرباں کردی　　　آشنائی یہ آشنا نکند

دردِ عشقش دوائے دل باشد　　　دردِ مارا کسے دوا نکند

آں نگہ را حذر انگہ دارد　　　تیر از وے گہی خطا نکند

ہر کہ چشمش شدہ برویت باز　　　باز چشمش بما سوا نکند

اے صنم من زیادِ تو غافل　　　گاہ باشم دمے خدا نکند

در نہاں خانۂ دلم آید　　　از حیا گر بدیدہ جا نکند

کے پیامم برد بآں بد خو　　　چوں ز کویش گذر صبا نکند

ما ز رسمِ وفا نمے گذریم　　　او وفائے اگر بما نکند

جانِ طالب بجو نمی ارزد　　　بر تو آں را اگر خدا نکند

تین پتھر

(از رائے زادہ گوبند پرشاد صاحب آفتاب بی۔اے، آئی)

کائناتِ عالم کی تکوین کا حال تو قدرت کی بے پایاں توانائیوں ہی کو معلوم ہوگا، لیکن کرۂ ارض کی ساخت میں اجزا رِ بانظم اور بےنظم کی زوجیہ تخلیق مشاطگی حُسن ازل کی زنگا رنگی پر دال ہے۔ اجزا رِ بےنظم کا تعارف عام طور پر جمادات کے نام سے ہوتا ہے، جس کو علمی زبان میں ارضیات یا طبقات الارض بھی کہتے ہیں۔

طبقات الارض میں مٹی اور پتھر کے الفاظ سے کان ناآشنا نہیں ہیں، لیکن مٹی علمی نگاہ سے بےمعنی ہے، علم ارضیات پتھر ہی کے نام سے ہر چیز کو پکارتا ہے اور مٹی کو ایک عامیانہ لفظ سمجھ کر اس وجہ سے کہ وہ مرکب ہے اور ترکیب گِلی میں ہمیشہ تنوع ہوتا ہے، اس لفظ کے استعمال سے کُلی پرہیز کرتا ہے۔

اس علم میں پتھر سے مراد ہے عناصر کا ایک مجموعہ، خواہ اُس کی تجمیع کسی صورت سے کارخانۂ قدرت کے صنّاعوں نے کی ہو۔ لیکن پتھر بنظر علمی ہمیشہ مرکب شئے سمجھا جاتا ہے۔ اِلّا نہایت خاص حالتوں میں اور وہ بھی اس وجہ سے کہ کانوں میں صنّاع ازل نے اُس کی خالص تشکیل و تکوین کی زحمت برداشت کی ہے۔ چنانچہ اس معنی میں معدن اور پتھر ایک ہیں۔

لیکن عامیانہ زبان کی مرادوں سے ہم اپنے مضمون کا دامن خالی نہیں رکھنا چاہتے اس لئے زیر بحث تین پتھروں کے ذکر میں قارئین کرام کو اجازت دیتے ہیں کہ مفہوم لفظ پتھر میں تحجر قدرتی اور احساس سختی کا مفہوم فی الباطن اور مفہوم فی الخارج اپنے دماغوں میں مصوّر ہونے دیں۔

آسمان ارضیات کی یہ تین تجلیاں قوت برقی کی طرح ہفت اقلیم پر اپنے اقتدار وسیع کی شعاعوں سے متحرک بالعمل ہیں، اور بےشمار صورتوں میں ظاہر ہوکر اپنی جلوہ گری سے انسانی نگاہوں کو خیرہ کرتی رہتی ہیں۔

یہ تین پتھر ہیں:-

(۱) آہک (چونہ)

(۲) بلّور اور

(۳) کُرن (کرُنڈ)

اور ہم ان افراد ثلاثہ سنگین کو جُدا جدا خلعتِ تحریر سے سرفراز کرنے کا ارادہ بطریق ذیل رکھتے ہیں:-

آہک:- آہک وہی زہر ہے جس کو ہندوستان کی کثرت آبادی اپنی آرائش جسمانی کے اہم جزو

حُسن افزا یعنی پان کے ساتھ روزانہ کھائی رہتی ہے۔ اور جو جدید علم التغذیہ کی رو سے صحتِ انسانی کے قیام کا ایک بنیادی پتھر ہے۔ جس کو خمیرۂ مروارید اور دوسری طبی ترکیبوں میں اطبا اسلامی دَور کی مسلسل تاریخی ہدایتوں سے پیمانۂ قوت کی ساقی گری کا جوہر خاص سمجھتے آئے ہیں اور جس کو برطانوی حکومت اور دَور حاضرہ کے ارتقا پذیر علم ادویہ سازی میں کیلشیم کے پُرزور نام سے جامۂ ترکیب پہنایا جاتا ہے۔

یہی وہ واصل سخت و کرخت ہے جو دنیا کے سخت سے سخت افراد کو اس طرح وصل و پیوند کر دیتا ہے کہ وہ قیامت تک نہیں بچھڑتے۔ اور اس کے اس عمل وصل میں قضا و قدر کی حیرت انگیز صناعیوں نے یہ خاصیت ودیعت کی ہے کہ کہنگی و امتداد زمانہ اس کو بہت زور سے چمٹنے اور گرفت کو قوی کرنے کی سہولت امتیازی دیتا ہے۔ اس کا سوزِ دروں قوائے وصل کی گرمی کو تیزی بخشتا ہے اور اسی کے وسیلہ سے دورِ سابق کے تمدن و معاشرت کی یادگاریں دورِ حاضرہ کی پناہ میں آکر شرف مہمانی سے ممتاز ہوئی ہیں اور اسی کی گرم رفتاری اور آتش پائی سے شہریت کی عظیم الشان بنیادیں آسمان سے سرگوشیاں کرنے لگی ہیں۔

تعمیراتِ عالم میں چونہ اور چونہ کے مرکبات نے سلطنت بابل کے باغاتِ معلق اور دَورِ عمرانی کے اہرامِ مصر سے لے کر فارس کے تختِ مرمر اور ہندوستان کے روضۂ تاج گنج تک حُسنِ عالم کی مشاطگی میں حصۂ اکثر لیا ہے اور اب سایۂ داور آتش بافتہ حالت میں سمینٹ بنکر نہر سوئز اور نہر پناما اور سوئزرلینڈ کی سُرنگ سے لیکر لندن نیویارک۔ ٹوکیو اور دوسرے دارالامارات کی تعمیر تک سیکڑوں آرائشوں اور ہزاروں زیبائشوں کے ساتھ چہرۂ عالم کو دُلھن کی طرح آراستہ کیا ہے۔

اجزائے عاملہ آہک کی تحریک انسانیت پروری دنیائے نباتات پر بھی دستِ شفقت دراز کرتی ہے۔ چنانچہ فرشِ زمین پر قوائے نمو کے جو قالین میزبانِ فطرت نے بچھائے ہیں اُس کی آب و تاب کے انواع رنگ تدبیر آہک ہی کی سلسلہ جنبانی کا نتیجہ ہیں، اور تغذیۂ نباتی کے معدنی کھادوں میں آہک کو طرۂ امتیاز حاصل ہے۔

اس کے سوز دروں کی جزرومد افزائیاں عجائب خانۂ قدرت میں جاذبِ نظر ہیں۔ چنانچہ کبھی (فائر اکسٹنگوئشر Fire Extinguisher) آلات نار کُش بنا کر دیدۂ اتفاقات سے نگاہِ قہر چُرا لیتا ہے۔ اور کبھی مصالحۂ نور افزا (کاربائڈ Carbide) کی ساخت سے محافل انسانی کو جلوۂ چراغانی اور ضیائے شادمانی بخشتا ہے، کبھی نقش و نگار متنوعہ کی حسین سجاوٹوں سے سطح سادہ و سطح روغنی میں رنگ بھرتا ہے۔ اور کبھی عمل ہائے مختلفہ کے ماتحت مصوری کے فنِ لطیف کی دستگیری و اعانت پر آمادہ ہوتا ہے۔

حالتِ خلوص میں آہک کے سنگِ آبدار، قوتِ خورد بینی کی افزائش سے نگاہِ تحقیق کا دامن تھام لیتے ہیں۔ اور اگر کہیں جم کر بیٹھ گئے تو مرمریں فرش کی آب و تاب کا جلوہ پیش نظر

کر دیتے ہیں۔

یہ اپنے ہم نشینوں کے اثرِ صحبت سے اگر متاثر نہ ہوں تو حسن رواداری مٹ جائے چنانچہ تاثراتِ ہم نشینی سے فیضیاب ہو کر مختلف رنگ آفرینیوں سے نہ صرف اپنے آب حُسن کی آرائش کرتے ہیں بلکہ حسینانِ عالم کے گلوئے خوش آواز میں ہارین کر شائستگی زیور کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ اور آئینہائے حسن نما اور تصویر ہائے حیرت افزا کی ترفیع و تصنیع سے اور آرائشی اشیاء کے ارتقائے خوش نمائی سے بصارتِ حُسن کی سُرمہ کشی کرتے ہیں۔

آہک کا تنوع آب و رنگ اور تحجّر جسم و سنگ آئینۂ فہرست ذیل سے عکس نما ہوگا:۔

آہک خالص	آہک آمیزشی
آئس لینڈ اسپار	ماربل
پرل اسپار	ہسلو پائٹ
کیلسائٹ	لائم اسٹون
ایروگونائٹ	لیتھو گرافک اسٹون
فائبرس اسپار	پیرائی لٹس
ماربل	جپسم
چاک	ٹیوفیشیس لائم
	آرجلیشیس لائم اسٹون

بلّور

جامِ بلّوریں میں ہے یوں کس شرابِ لالہ گوں ہو جیسے کیفیت افزا نور سحر رنگِ شفق

حضرت شیخ محمد ابراہیم ذوق کے اس جامِ شاعری کو جس آب و رنگ نے بھرا ہے وہ یہی بلّور تو ہے جس کے چشمۂ فیض نے قارئین کرام کی تشنہ نگاہیوں کو تجلّیات امدادی کے خلعتِ امتیازی سے سرفراز فرمایا ہے۔

آپ اس کو سنگِ بصری سمجھکر معالجۂ انسانی کے لئے مخصوص فرمائیں تو زیبا اور اگر عقیق یمنی تصوّر کر کے حلق عشاق کی تشنگی رفع کرنے کے لئے اُن کو لبِ یار کی خیالی تصویر پیش فرمائیں تو بجا۔ یہی فادزہر اور زہر مہرہ بن کر تقویتِ قلب کا بنظرِ اطبّاء یونانی باعث ہے۔ اور یہی بنفشئی شعاع کے معالجۂ جدید سے ڈاکٹروں کے زاویہ ہائے علاج کا مرکزِ انظار۔

اِسی نے ربعِ مسکوں کے اُن عظیم و وسیع صحراؤں کی تشکیل کی ہے جن کی ہوا خواہی میں جادو کلام نسیم نے

یوں لکھا چھلا ہے: ۔

پانی کو پتا نہ تھا شجر کا عنقا تھا نام جانور کا

اور اسی نے کثیر الوسعت اور عظیم الجسامت سمندروں کو آب بخشی ہے۔ جن کی آہستہ آہستہ سطح فرازی نے حضرت عیسیٰ نہیں بلکہ حضرت آدم کی آنکھیں دیکھنے والے زمانے کو پہاڑوں کی صنعت کا ازلی جلوہ اور آبی کرشمہ دکھایا ہے۔

اس بلور کی سخت طبیعی کو صناع ازل نے اپنی آتش قہر کی حیرت کار فراوانیوں سے پگھلا پگھلا کر بہت نرم کرنا چاہا مگر اس کی سرکشیوں نے ندا کی طرح بازگشت کی اور مُلا ظہوری کی ہم آواز ہوگئیں :۔

رود بوئے مشک و پر د رنگِ لعل ظہوری محال است تغییرِ ما

پگھلانے کے بعد اس کے تحجر سنگین کی سخت طبیعت کو دوبارہ ملائم کرنے کی مساعی جمیلہ قضا و قدر کے قادر و توانا ہاتھوں میں زمین آسمان کے دو آسیائی پاٹ بنا کر کار فرما ہوئیں اور آج تک بلور کی باریک سائیدگی میں مصروف ہیں۔ چنانچہ پردہ گیتی کی ہر مٹی اور ریت اسی راستے کی خاک ہے اور بحری ساحلوں کے اور پہاڑی دامنوں کے تمام سنگریزے اسی عمل ملایم سازی کے رہین منت ہیں۔ تاہم اندرونِ ارض کے قعر شیطانی میں مخفی تحجرات بلور جو آج تک جابجا باندازِ سرکشانہ سطح زمین پر برآمد ہو رہے ہیں حضرت یاس کی بلند آہنگیوں سے اس طرح آواز ملا رہے ہیں کہ :۔

نہ چھپا پر نہ چھپا جوہرِ عالی نسبی یاس مٹنے پہ بھی سنگِ درِ جاناں نہ بنے

سختی طبع تو بلور کا عذر معشوقانہ تھا، ورنہ حسن آب و رنگ کا جلوۂ نمایاں دکھانے والی یہ عروسِ فطرت اپنے زیور طلائی کو پیرزال دنیا کے غارت گر ہاتھوں کو اُس وقت تک نہیں لٹانا چاہتی تھی جب تک اس بُڑھیا سے چکّی نہ پیسوا لے۔

چنانچہ ہر کانِ طلا بلور کے حسن آب و رنگ سے جلوہ فزا نظر آئے گی اور ہر جگہ ایک دنیا سونا برآمد کرنے کے لئے چکّی پیستی دکھائی دے گی۔

صناعِ ازل اور مصنوعِ افضل کے اس راز و نیاز کو نظر مشاہدہ نے دیکھکر دو اصول فطرت تحقیق فرمائے، جن سے صنعتِ انسانی کے شاندار مستقبل کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ صناع ازل سے سنگِ بلور کا پگھلانا سیکھا اور مصنوع افضل سے سخت طبیعی اور حجر سازی میں سبق آموزی کی۔ چنانچہ چونا اور سیمنٹ کی آمیزش سے سائیدہ بلور جس کو عرف عام میں ریت کہتے ہیں عمارات عالیہ اور ستونہائے تعمیریہ کی پائداری و استحکام کا باعث ہے۔ اور شیشہ سازی اور اعلیٰ درجہ کی کٹھالی میں پگھلنے کی خاصیت سے آلات روشنی

ظروف اور سیکڑوں خدماتِ نمایاں انسان کی کر رہا ہے۔

اور اب جبکہ قدرتی رنگوں کے کیمیائی تجربہ سے دورِ حاضرہ کی ایجادات آب و رنگ نے نقلی جواہرات بنانے کی صنعت کو ممیزانہ فروغ بخشا ہے، حسن اور حسن افزائیوں کی خدمت گزاریوں میں بلور طرۂ امتیاز سے بہرہ ور ہے۔ اور ماہرینِ سائینس اس کی سخت طبعی کی افزایش میں دست گیری و اعانت پر آمادہ ہیں تاکہ اُس کی جلائی استعداد میں ترقی ہو اور گھسائی کی قوتوں میں اضافہ۔

بلّور کا تنوع آب و رنگ اور تجزّ جسم و سنگ آئینۂ فہرست ذیل سے عکس نما ہوگا:-

بلّور خالص	بلّور آمیز شی
	کوارٹز
	چیلی ڈونی
راک کرسٹل	جاسپر
ایمی تھسٹ	پلیزما
	بلڈ اسٹون
	ایگیٹ
کارنی لین	اوپل
نیچرل سلیکا	اونکس
کرسٹل کیٹس آئی	جیٹ
	سینڈ اسٹون
	سینڈ
	ارتھ
	وُڈ فوسل

کُرُن

کارخانۂ قدرت کی مصنوعات میں فلزات کی اہمیت کے بعد کُرُن کی اہمیت کا درجہ ہے۔ اور قیمت میں یہ سب فلزات پر فوقیت رکھتا ہے۔

اس کی سختی نو درجہ کی ہوتی ہے اور سوائے الماس کے کُرُن کی سختی کا دنیا میں مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت نے کُرُن کو ہر در کی دریوزہ گری کے لئے پیدا نہیں کیا ہے اور مقاماتِ

خاص میں بیش قیمت پتھر دستیاب ہوتا ہے۔

ہندوستان میں یہ جا بجا دستیاب ہوتا ہے، خصوصیت سے جوپنور اور ریاست ریواں میں اور برہما میں اس کی کثرتِ وقوع نے نیلم اور یاقوت کی کھدائیں برآمد کی ہیں۔ جن سے لاکھوں روپیہ کی آمدنی ہو چکی ہے۔ حال میں ریاست کشمیر میں بھی اس کا پتہ چلا ہے اور نیلم کی کھدان بھی دستیاب ہوئی ہے۔

یہ پتھر ہر رنگ کا ہوتا ہے لیکن سُرخ رنگ یاقوت میں ہو کر کھل جاتا ہے۔ اور نیلا رنگ نیلم میں جا کر تاج پہنتا ہے۔

اِس کے سوا سفید، زرد اور سیاہ و سبز رنگ بھی شاذونادر ملتا ہے اور بڑی قیمت دلاتا ہے۔
کُرنڈ عموماً فسان بنانے کے کام آتا ہے اور جواہرات تراشنے اور جِلا دینے اور مختلف گھسائیوں میں مستعمل ہے۔

اب مختلف اقسام کی آریاں اور گھسائی کے کاغذ اور گھسائی کے آلات بھی اس سے بنائے جاتے ہیں

قندِ پارسی

(از مولانا جلال الدین صاحب طالبؔ)

دل برد از من طرفہ نگارے — در حُسن نورے در خوئے نارے
قدِ بلندش آزاد سروے — طرزِ خرامش موجِ بہارے
از روشِ نیکو مصحف بگردن — وز خال ہندو کافر دیارے
درجِ دہانش درجے ز گوہر — بر رو نوشتہ خطِ غبارے
برقِ درخشاں آں فرقِ روشن — زلفِ سیاہش بر دوشِ مارے
از خندہ روئے بر غیر گلشن — وز شعلہ خوئے بر من شرارے
از لعلِ لبہا معجز نمائے — وز چشمِ جادو چوں سحر کارے

صبر و قرارے از وے چہ جوئی
طالبؔ ندارد صبر و قرارے

شاعر

(از پنڈت جیمنی سرشار، خیرپور سادات)

ہمنشیں! کیا پوچھتا ہے کیا بتاؤں کیا ہوں میں
درد کی تصویر ہوں، احساس کا پُتلا ہوں میں

دہر میں آیا ہوں، رنگ اپنا جمانے کے لئے
ذی خرد لوگوں کو دیوانہ بنانے کے لئے

وہ ملی توفیق، حاصل اِتنی قدرت ہے مجھے
جس کی بیحد وسعتوں پر خود بھی حیرت ہے مجھے

ہے عبث یہ بحث، کیا ممکن ہے کیا ممکن نہیں
میں اگر چاہوں تو کوئی بات ناممکن نہیں

خاک کے ذرّوں کو یوں تابندہ کر سکتا ہوں میں
انجمِ افلاک کو شرمندہ کر سکتا ہوں میں

قبضۂ قدرت میں میرے بات ہے یہ بیگماں
آسمانوں کو زمیں کر دوں، زمیں کو آسماں

دل جو پتھر ہو اُسے پانی بنا سکتا ہوں میں
چشمِ تر سے اس کو بہنا بھی سکھا سکتا ہوں میں

میں جو چاہوں سادہ پانی کی بھی وہ تعظیم ہو
اس کا ہر قطرہ جوابِ کوثر و تسنیم ہو

موت تک کو خوابِ غفلت سے جگا سکتا ہوں میں
زندگی کی آگ سینوں میں لگا سکتا ہوں میں

کارفرمائی تخیل کی مرے دوزخ بہشت
یہ تمیزِ نیک و بد، پست و بلند و خوب و زشت

ساکنانِ فرش سے کیا عرش کی باتیں کروں
فرش پر بیٹھا ہوں جب تو فرش کی باتیں کروں

انجم و شمس و قمر تاباں ہیں جو افلاک پر
میرے دل کے داغ ہیں یہ میری آہوں کے شرر

شب کے سناٹے میں جا کر باغ میں روتا ہوں میں
شبنم آسا ہر گل و غنچہ کا منہ دھوتا ہوں میں

جام میں میرے بھری ہے وہ محبت کی شراب
بوڑھے چہروں پر بھی جس سے لوٹ سکتا ہے شباب

مُردہ جسموں میں نئی جاں ڈالنے والا ہوں میں
خونِ دل سے حسرتوں کو پالنے والا ہوں میں

زندگی تخلیق ہوتی ہے مرے مضمون سے
کیونکہ لکھتا ہوں اِسے اپنے جگر کے خون سے

رقص کرتے ہیں فرشتے بھی مری آواز پر
میں بقا کے گیت گاتا ہوں فنا کے ساز پر

سُننے والے! دل کے کانوں سے مری آواز سُن
تجھ سے کہتا ہوں میں اپنی زندگی کا راز سُن

باندھنے والا طلسم الفاظ کا، ساحر ہوں میں
تو اگر اب بھی نہیں سمجھا تو سُن "شاعر" ہوں میں

روس کا انقلابی انشا پرداز

از جناب مائل نقوی صدر انجمن ترقی اُردو و سکریٹری اُردو کانفرنس بھوپال

جدید روسی ادب کو جس کی طرف مفکرین عہد حاضر کی توجہ نہایت سرگرمی سے مبذول ہے عالم وجود میں آئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ انیسویں صدی عیسوی کا ابتدائی حصّہ اسکی پیدائش کا زمانہ ہے جس طرح ہندوستان میں موجودہ اُردو انشا پردازی کی ایجاد کا سہرا سرسید علیہ الرحمۃ اور اُن کے رفقائے کار کے سر ہے اِسی طرح روس میں جن مصنفین نے "جدید روسی ادب" کی داغ بیل ڈالی اُن میں پشکن، لیما ٹوف، اور گوگال خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کے خیالات میں اسقدر زور اور طبیعت میں وہ روانی نہ تھی کہ یورپ کے مشرقی حصّہ سے اُٹھ کر اسکے مغربی حصّہ تک پہونچ سکیں۔ اسی لئے برّ اعظم کا مغربی خطّہ ان کے کارناموں حتیٰ کہ ناموں سے بھی بالکل نا آشنا رہا۔ انگلستان کا مشہور مصنف میتھیو آرنلڈ جو اِن لوگوں کا ہمعصر تھا اپنی ایک تصنیف میں ایک جگہ لکھتا ہے " سرزمین روس میں اسوقت تک کوئی نامور شاعر پیدا نہیں ہوا"۔ اسی طرح انیسویں صدی کا مایۂ ناز ادیب کارلائل جسنے اپنے ملک کے ادب میں بہت سی مفید راہیں نکالیں اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں رقمطراز ہے:-

"روسی قوم اگرچہ یورپ کے بیشتر حصہ کو اپنے زیر اقتدار کئے ہوئے ہے لیکن ادب و انشا میں اس نے کوئی قابل قدر چیز اس وقت تک دنیا کے سامنے پیش نہیں کی"۔

آخر کار قدرت نے ٹالسٹائی اور آئیون ٹرگنیاف کی صورت میں دو ایسے ادیب پیدا کئے جنھوں نے اپنے زور قلم سے دیرینہ ادبی جمود میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور جنکی ولولہ انگیز تصانیف روسی ادب کو بیرونی دنیا سے روشناس کرا کے اسکے لئے خراج تحسین حاصل کیا۔ انھیں کے نقش قدم پر چل کر روس میں انشا پردازی کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جسنے "روسی ادب" کے نام سے دنیائے ادب میں ایک جدید اور شاندار باب کا اضافہ کیا۔

آئیون ٹرگنیاف ۱۸۱۸ء میں روس کے ایک متمول خاندان میں پیدا ہوا۔ ابھی صغرسنی ہی کی منزل میں تھا کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ لیکن گھر میں دولت کی کمی نہ تھی اسلئے اس حادثہ کا اسکی تعلیم و تربیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ وطن میں ابتدائی تعلیم دلانیکے بعد اسے ماسکو، سینٹ پٹرزبرگ (موجودہ لنن گراڈ) اور برلن کی یونیورسٹیوں میں داخل کیا گیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد انگلستان اور فرانس کی سیاحت کرائی گئی۔ اعلی تعلیم

اور مشاہدات نے اسکی معلومات میں وسعت، خیالات میں رفعت اور ذہنی قوتوں میں نمایاں ترقی پیدا کر دی۔

۱۸۵۲ء میں گوگال کا انتقال ہوگیا۔ ٹرگنیاف پر اس سانحہ کا سخت اثر ہوا اور اُسنے گوگال کی مدح و ستائش میں ایک پُرجوش مضمون شائع کیا۔ اسکے بعض حصّے سیاسی مصالح کے خلاف سمجھے گئے۔ لہٰذا بطور تنبیہ حکومت روس نے ٹرگنیاف کو دو سال کیلئے اُسکی ریاست سے جلاوطن کر دیا۔ یہ جلاوطنی اگرچہ ایک خاص مدت کے لئے تھی مگر ٹرگنیاف نے وطن مالوف کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ زندگی کے بقیہ ایام جرمنی اور فرانس میں رہ کر گزارے اور ۱۸۸۳ء میں اس دارفانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوگیا۔

ٹرگنیاف ادبی دنیا میں ایک شاعر کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ لیکن بہت جلد اُسے معلوم ہوگیا کہ جو عظیم الشان مقصد اُسکے پیش نظر ہے اُس کی تکمیل کیلئے شاعری زیادہ مفید ثابت نہیں ہوسکتی۔ اس احساس کے بعد ہی اُسنے شاعری ترک کر دی اور نثر کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا۔

ابتدا میں اُس نے روسی کاشتکاروں کی المناک زندگی پر متعدد افسانے لکھے۔ حکومت کی گرفت سے بچنے کے لئے وہ ان مضامین کو "ایک اسپورٹسمین کے تاثرات" کے عنوان سے لکھا کرتا تھا۔ یہ تحریریں اگرچہ محض وقتی تھیں لیکن مصنفین کا عام طور سے خیال ہے کہ یہ افسانے فنی نقطۂ نظر سے مکمل ہیں۔ ہر افسانہ میں ابتدأ کاشتکاروں کی زندگی میں سے کسی ایک پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔ پھر مصنف کی شاعرانہ قوت سے اُسمیں وہ دلچسپی پیدا ہوگئی ہے جسنے ہر ایک افسانہ کو غیر فانی زندگی عطا کر دی ہے۔ ان افسانوں کی زبان شستہ، خیالات دلآویز اور انداز بیان جوش سے لبریز ہے۔ ان کے الفاظ میں جو رُوح پوشیدہ ہے پڑھنے والے پر اُسکا برابر اثر ہوتا رہتا ہے۔ اور جسوقت وہ ایک افسانہ ختم کرلیتا ہے اُسکا دل کاشتکاروں کی تباہ حالی سے متاثر ہوجاتا ہے۔ اور سینے میں اُنکے لئے ہمدردانہ جذبات اُمنڈنے لگتے ہیں۔ ان افسانوں کی اشاعت سے رُوسی حکومت اور سماج کی بہت سی خطرناک خامیاں منظر عام پر آگئیں اور اُن ظلموں کا راز بُری طرح فاش ہوا جو عدل و آئین کے سمیں پردہ کے پیچھے کاشتکاروں اور مزدوروں پر ڈھائے جا رہے تھے۔

ٹرگنیاف سے قبل روسی افسانے مناظر قدرت کے عنصر سے بالکل خالی ہوتے تھے۔ اسکے کئی سبب بیان کئے جاسکتے ہیں۔ اول یہ کہ رُوسی اہل قلم فطرت کی رنگینیوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ براؤننگ کی طرح وہ رُوح انسانی کی گہرائیوں میں اتنے ڈوب جاتے تھے کہ مناظر قدرت کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ ٹرگنیاف پہلا روسی ادیب ہے جسنے اپنے ملک کے ادب میں اس کمی کو محسوس کیا اور اپنی تصانیف میں بہت بڑی حد تک اسے پورا کیا۔ اسنے انسانی افعال و کردار کے بیان میں مناظر قدرت کو بطور پس منظر کے استعمال کیا۔

مذکورۂ بالا کے علاوہ اور بہت سے افسانے جو وقتاً فوقتاً اُسکے قلم سے نکلے ادبی اعتبار سے بہت بلند درجہ رکھتے ہیں لیکن اُسکی شہرت کا خاص سبب وہ چھ ناول ہیں جو اُس نے اپنی زندگی کے آخری تیس سال میں تصنیف کئے تھے۔ اُن کے نام حسبِ ذیل ہیں :-

۱- ریوڈن
۲- اے ہاؤس آف جنٹل فوکس
۳- آن دی ایو
۴- فادرز اینڈ چلڈرن
۵- اسموک
۶- ورجن سوائل۔

ان ناولوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ٹرگنیاف کی ادبی مشق درجۂ کمال پر پہنچ چکی تھی۔ ان میں اسکی طبیعت کی روانی، فکر کی رسائی، خیالات کی بلند پروازی اور فکر کی شوخی ہر جگہ ظاہر ہے۔ اسکی عبارت سے روسی زندگی کے مختلف شعبے ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ انقلاب یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے آتے جاتے ہیں جن سے باشندگان روس کی ذہنیت اثر پذیر ہو رہی تھی۔ ان کے مطالعہ سے اسباب کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک قادر الکلام ادیب پر آشوب سیاسی دور میں بھی کسطرح پبلک کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ اور کس خوبی سے ان تاثرات کو منظر عام پر لا سکتا ہے جو ملک کی آزاد ترقی کے لئے عوام کے دلوں میں موجزن ہو رہے ہوں۔

ٹرگنیاف نے اپنے پہلے ناول "ریوڈن" میں ایک ایسے شخص کا کردار پیش کیا ہے جسے گویائی پر پوری قدرت حاصل ہے، وہ زبان و بیان کا مالک ہے، ہر موضوع پر ولولہ انگیز تقریر کر سکتا ہے اور اپنے پُر اثر بیان سے گرد و پیش کے لوگوں کا اعتماد بھی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن جب میدان عمل میں اُترنے کا وقت آتا ہے تو سب سے پہلے راہِ فرار اختیار کرتا ہے یعنی اُس میں زبانی جمع خرچ کے سوا عمل کا شائبہ تک نہیں ہے۔

اس قصہ میں وسط روس کے ایک علاقہ کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں ایک شریف خاندان خاتون اپنے ملک کی جدید تحریکات سے خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ ایک دن اُسکے ملاقات کے کمرہ میں ریوڈن نامی ایک نوجوان داخل ہوتا ہے۔ روس کے سیاسی مسائل پر دونوں میں تبادلۂ خیالات ہوتا ہے۔ نوجوان، آزادی کی قدر و قیمت

---

۱ Roudin ۲ A house of Gentle Folks. ۳ On the Eve. ۴ Father & Children. ۵ Smoke. ۶ Vergin Soil.

حصولِ آزادی کے وسائل اور مغربی یورپ میں تحریک آزادی پر ایسی آتش فشاں تقریر کرتا ہے کہ اُسکے ہر لفظ سے صداقت، اولوالعزمی اور بے پناہ جوش و خروش کے شعلے نکلتے معلوم ہوتے ہیں۔ خاندان کے نوجوان افراد اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ اسکے جذبات کا احترام پرستش کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میزبان خاتون کی دخترِ نتشیئے" نوجوان کے دامِ محبت میں گرفتار ہوجاتی ہے اور جذبۂ محبت اس درجہ ترقی کرتا ہے کہ ماں کی محبت، عزیزوں کی مخالفت، خاندان کی عزت سب کو پس پشت ڈال کر نوجوان کیساتھ بھاگ چلنے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ اُسوقت وہ نوجوان سے دریافت کرتی ہے۔

" اب مجھے کیا کرنا چاہیئے"؟

نوجوان اُن مشکلات کے اندیشہ سے جو پہلے ہی قدم پر پیش آنیوالی ہیں ہمت ہار دیتا ہے اور جواب دیتا ہے:۔

" تقدیر کے مخالف خطا کے سامنے سرِ تسلیم خم کردینا چاہیئے"

یہی شخص ابھی صرف چند لمحہ پیشتر سخت سے سخت مشکلات کا مقابلہ کرنے پر دُھواں دھار تقریر کررہا تھا اور یہی پہلی مشکل کے محض اندیشہ سے سپر ڈال کر الگ جا کھڑا ہوتا ہے۔

اُنیسویں صدی کے ابتدائی چالیس سالوں میں روس کے اندر مفکرین کا جو عنصر سب سے ممتاز سمجھا جاتا تھا اُسکا تمام سرمایۂ کمال محض زبانی تھا۔ عمل کے جوہر سے یہ گروہ یکسر معرا تھا۔ ریوڈن عملی لحاظ سے اگرچہ بالکل تہی مایہ ثابت ہوا تاہم ٹرگنیاف اسکا کردار اس صورت سے پیش نہیں کرتا جسے پڑھکر ناظرین کے دلمیں اسکی طرف سے جذبات حقارت پیدا ہوں۔ ریوڈن سماجی زندگی میں بہرحال ایک ضروری فرض ادا کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ترقی کی راہ میں سوسائٹی کا رہنما نہیں بن سکتا۔ تاہم اپنی پرجوش تقریر کے ذریعہ افراد سوسائٹی کو شاہراہ ترقی پر گامزن کرنے کے لئے آمادہ ضرور کرسکتا ہے۔

ٹرگنیاف کا دوسرا ناول "اے ہاؤس آف جنٹل فوکس" ہے۔ یہ ناول شائع ہوتے ہی اسقدر مقبول ہوا کہ اسکی شہرت ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچ گئی۔ جیسا کہ ناول کے نام سے ظاہر ہے اسمیں بجائے فرد واحد کے مختلف اشخاص کے کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ یہی سبب تھا کہ کثیر المقدار افراد میں جنکے طبائع میں زمین وآسمان کا فرق تھا اسے بیحد قبولیت حاصل ہوئی۔ اس ناول کا ہیرو لیوٹسکی اپنی ازدواجی زندگی میں نہایت بدنصیب واقع ہوا ہے۔ شریک زندگی کی بدزبانی نے اُسکی زندگی تلخ کردی ہے۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں میں نااتفاقی ہوجاتی ہے لیوٹسکی ایک نوعمر دوشیزہ لیزا نامی کو اپنے سلسلۂ عقد میں لاتا ہے۔ یہ لڑکی صورت اور سیرت میں خداداد خوبیوں کے لحاظ سے اس عہد کی شریف سوسائٹی کا بہترین نمونہ ہے۔ عرصہ تک یہ دونوں لطف وآرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیزا کو اپنے شوہر کے پہلے عقد کی بابت مطلق علم نہیں ہے۔ یکایک لیوٹسکی کی پہلی بیوی اُسکی طرف

رجوع کرتی ہے اور اپنی مذموم عادات کے باعث چند ہی روز میں گھر کو دوزخ کا نمونہ بنا دیتی ہے۔ لیزا کو ان واقعات سے سخت صدمہ پہونچتا ہے۔ وہ تارک الدنیا ہو کر ایک خانقاہ میں گوشہ نشین ہو جاتی ہے۔

پہلے ناول کے ہیرو روڈن کی ناکامی کا سبب اُسکی فطرت میں عزم راسخ کا فقدان تھا۔ برخلاف اس کے نیوڈنسکی کا ارادہ مضبوط اور فیصلہ اٹل ہے۔ وہ ایک ایسے رہنما کا بھیس اختیار نہیں کرتا جو کہ خود گمراہی میں مبتلا ہو۔ بلکہ برعکس اسکے عمل کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے مگر ماحول کی خرابیاں اور خانگی پریشانیاں اُسکی ترقی میں سدراہ بن جاتی ہیں اور ناکامی کا باعث ہوتی ہیں۔

اس کا تیسرا ناول "آن دی ایو" ہے یہ خیالات کی گہرائیوں اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے ایک خاص امتیازی شان رکھتا ہے۔ سرسری طور پر مطالعہ کرنے سے یہ ناول ایک پُرسکون رُوسی گھرانے کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دراصل اُنیسویں صدی کے ابتدائی پچاس سالوں میں روسی سوسائٹی کی جو حالت تھی ناول کی صُورت میں اس کا ایک مکمل مُرقع تیار کیا گیا ہے۔ نوجوان دوشیزہ "ایلینا" ناول کی ہیروئن ہے۔ ارادہ کی پختگی اور غیر متزلزل خلوص میں تو وہ لیزا سے مشابہ ہے مگر اور تمام باتوں میں اُس سے بالکل مختلف۔ لیزا سکون پسند طبیعت کی لڑکی ہے لیکن ایلینا کی فطرت سیماب وش واقع ہوئی ہے۔ لیزا کا اُصول زندگی "نیک بننا" ہے لیکن اسکا نظریہ حیات "نیکی کرنا" ہے۔ ایلینا خاندان کے حدود میں گھر کر زندگی بسر کرنے سے تنگ آ چکی ہے اور اپنی خداداد قوتوں کے اظہار کے لئے وسیع تر فضا کی متلاشی ہے۔ ایک جگہ وہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہے "انسان کے لئے صرف نیک ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اُس کا خاص وصف دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔"

یہ واقعہ ہے کہ ایلینا کے خیالات کی وسعت اپنے زمانہ کی حد سے کسی قدر آگے ہے اور اُسکی گردوپیش کے لوگ اس بلند سطح تک پہونچنے سے معذور رہیں۔ والدین کی نگاہ میں اُسکی حیثیت ایک لاینحل معمہ بنکر رہ گئی ہے جسکے سمجھنے سے وہ قاصر ہیں۔ اس لڑکی کے تین خواستگار پیدا ہوتے ہیں۔ شوبین۔ برسنف۔ انسروف۔

شوبین ایک صاحب کمال مصور ہے لیکن اسی کے ساتھ نازپروردہ اور تنک مزاج نوجوان ہے۔ اُسکی مثال اُس حسین تیتری کی سی ہے جو اتنی نازک ہے کہ نسیم شوخ کی بھی تاب نہیں لا سکتی۔ ایلینا کے مقصد حیات کو پایۂ تکمیل تک پہونچانا اسکے امکان سے قطعی باہر ہے۔

برسنف معقولیت پسند بے غرض اور سنجیدہ و شریفانہ طبیعت کا مالک ہے لیکن جوش عمل اور جرأت سے یکسر معرا ہے۔

انسروف بلگیریا کا باشندہ اور اپنے وطن کا دلدادہ ہے۔ اسکے دل میں مادر وطن کی آزادی کا جذبہ موجزن ہے۔ یہ زبانی باتیں بنانے کے بجائے میدان عمل میں قدم بڑھانے والا نوجوان ہے۔ عزم و استقلال کا مجسمہ اور

رجحانات طبیعت میں ایلنیا کا پورا جواب ہے۔ لازمی طور پر ایلنیا کی نگاہ انتخاب اسی پر پڑتی ہے۔

جسوقت مصنف ملازمین کی زبانی ایلنیا کی ارادی قوت، پختہ فطرت، بلند خیالات اور عمیق جذبات کا ذکر کرتا ہے اور اُس غم و ہیجان کی تصویر کھینچتا ہے جو تاثرات محبت نے اُسکے مضطرب دل میں برپا کر رکھے ہیں اُسوقت قلم کی روانی کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے۔ اس ضمن وہ نہایت خوبی سے اُن جذبات کی تصویر کھینچتا جاتا ہے جو اُس زمانہ میں روس کے نوجوان طبقہ میں ملکی ترقی کیلئے نہایت تیزی سے نشوونما پا رہے تھے۔

ایلنیا اس طبقہ کی علمبردار خاتون ہے اور یہ ناول باشندگان روس کے سامنے اس بات کی اپیل ہے کہ وہ اپنے دیرینہ جمود کو توڑ کر اُس فرسودہ آئین حکومت کا خاتمہ کر دیں جو نکولس اول کے عہد میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اور جو بوجہ تبدیلی حالات اب ملک کیلئے مضر ثابت ہو رہا تھا۔ اس بنا پر ٹرگنیاف کا یہ ناول "جدید روس" کے حالات اور اُسکی انقلابی ذہنیت کا مرقع ہے۔

"آن دی ایو" کے بعد ٹرگنیاف کا وہ معرکۃ الآرا ناول شائع ہوا جسے اسکی تصانیف میں شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ اس ناول کا نام "فادرس اینڈ چلڈرن" ہے۔ اس ناول میں اس کا شاعرانہ تخیل درجۂ کمال پر پہونچ گیا ہے۔ یہ کتاب پلاٹ کی دلآویزی، زبان کی پاکیزگی، بیان کی ندرت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی صحیح تصویر پیش کرنے میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔ عبارت میں شروع سے آخر تک یکساں روانی ہے۔ کسی جگہ تکلف اور آورد کا گمان تک نہیں ہوتا۔ غیر ضروری اُمور اور طوالت سے پاک ہے۔

منجملہ متعدد افراد کے جو اس کے ارکان کا مرتبہ رکھتے ہیں قصہ کا مرکز نہلسٹ خیالات کے علمبردار بزرنی نامی ایک نوجوان کی شخصیت ہے۔ یہ دُرشت طبیعت انسان ہے جو کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتا اور کسی طاقت کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ نہ کوئی قوت اسے اپنی جگہ سے ہٹا سکتی ہے نہ کوئی مشکل اس کی محبت کو کمزور بنا سکتی ہے۔ یہ نوجوان اپنے ملک کے قدیم و جدید حالات کے درمیان کھڑا ہوا دونوں کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ قدیم رسوم ورواج کو بکلّم منسوخ کر دینا چاہئیے۔ اسکی بصیرت صاف طور سے مشاہدہ کرتی ہے کہ علوم و فنون جدیدہ کی اشاعت دُنیا کے لئے نئے زمین و آسمان کی تخلیق کر رہی ہے۔ وہ اس کام کی تکمیل کے لئے اپنی کوششوں کو پورے استقلال کیساتھ وقف کر دینا چاہتا ہے لیکن ایک نئی دُنیا کی تعمیر سے قبل اسباب کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ قدیم تہذیب کے کھنڈر کو بالکل مسمار کر دیا جائے۔ اسلئے وہ ایک نہلسٹ کے لباس میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسکا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اُن تمام چیزوں سے ترک تعلق کر دے جنہیں عوام بوجہ قدامت تقدس مآبی کا درجہ دئے ہوئے ہیں۔ نوجوان عزم مستقل کیساتھ کام کر دینا شروع کر دیتا ہے۔ اور اس جوش کیساتھ کہ تکمیل مقصد کی راہ میں محبت یا

خاندانی تعلقات کا سنگِ راہ ہونا برداشت نہیں کر سکتا۔ قدرتاً اُسے اُن بزرگانِ قوم کا مدمقابل بننا پڑتا ہے جو قدیم رواج کے حامی ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ اُسے اُن نزاعات کا فیصلہ بھی کرنا پڑتا ہے جو معمر اور نوجوان طبقوں کے درمیان رونما ہیں۔ اسی نازک موقع پر مصنف کی غیر معمولی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اُسکے سحر کار قلم نے ہر فریق کی وکالت کا حق انتہائی خوبی سے ادا کیا ہے۔ ہر مسئلہ زیر بحث کی موافقت و مخالفت میں پرزور دلیلیں پیش کی ہیں۔ ہر دعویٰ کی تائید و تردید میں فلسفیانہ اصول سے بحث کی ہے اور شگفتہ و سنجیدہ تنقیحات کے ذریعہ ناظرین کو اُس مقام تک پہونچا دیا ہے جہاں وہ قدیم خیالات کی لغویت اور جدید تحریکات کی معقولیت کی نسبت خود فیصلہ صادر کر سکیں۔

یہ ناول اُس عظیم الشان تحریک کی اہمیت کا ایک خاکہ تھا جسکا جذبہ روسی سوسائٹی میں اندر ہی اندر ترقی کر رہا تھا۔ تحریک مذکور کا مقصد اس درجہ بلند تھا کہ اسقدر زمانہ گزر جانے اور اتنی ارتقائی منزلیں طے کر لینے کے بعد بھی روس ابھی تک اس بلندی پر نہیں پہونچ سکا ہے۔

باوجودیکہ ناول میں تمامتر پبلک کے احساسات اور مختلف طبقوں کے رجحانات سے بحث کی گئی ہے، مصنف کا کمال یہ ہے کہ شروع سے آخر تک کتاب کی ادبی شان میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے۔ اگر کوئی شخص واقعات مذکورہ سے خالی الذہن ہو کر محض ادبی نقطۂ نگاہ سے اس کا مطالعہ کرے تو یہ کتاب ادب کا مکمل نمونہ نظر آئیگی۔

یہ ناول انسانی فطرت کی صحیح تصویر ہے۔ شریف الطبع والدین کا اپنے بیٹے کی آئندہ فلاح و بہبود کیلئے تردد، ہیرو کے دل میں نامعلوم طور سے محبت کی نشو و نما، جذباتِ محبت پر غلبہ حاصل کرنیکے لئے اُسکی مردانہ وار کوششیں ان تمام باتوں کی تشریح میں فطرت انسانی کی مصوری کا کمال دکھایا گیا ہے۔ آخر میں ہیرو کی ناگہانی موت اور اُسکی زندگی کے عظیم الشان مقصد کا نامکمل رہ جانا ایسے واقعات ہیں جنھوں نے اس کتاب کو عبرتناک ٹریجڈی بنا دیا ہے۔ ہیرو پرجوش اُمنگوں اور بے پناہ ارادوں کو اپنے دل میں لئے ہوئے قبل از وقت قبر کی تنگ و تاریک کوٹھری میں سو جاتا ہے۔ اور اُسکی تمام متوقع کامیابیاں موت کے ظالم پنجہ سے مغلوب ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ترگینف کے قلم سے اسکے بعد جو دوسرا ناول نکلا اُس کا نام "اسموک" ہے۔ اس ناول کو کسی خاص توجہ کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ "فادرز اینڈ چلڈرن" کی اشاعت پر ترگینف کی جو مخالفت ہوئی اور اُسکے خیالات کی جو غلط تاویلیں کی گئیں اُنھوں نے اُسکے جذبات کو بہت صدمہ پہونچایا۔ اسکے علاوہ ملک کی سیاسی فضا میں کسی اصلاح کے قبول کرنے کی ذرہ برابر صلاحیت موجود نہ تھی۔ ان سب پر طرہ یہ ہوا کہ الگزنڈر کے استبدادی احکام سے روس میں رجعت پسندی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ اس حادثہ نے ترگینف

کی تمام اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ مذکورۂ بالا ناول اسی عالم مایوسی کی پیداوار ہے اور یہی سبب ہے کہ ٹرگنیاف کی جملہ تصانیف میں اس کتاب کا لب ولہجہ بہت زیادہ تلخ اور دلخراش ہوگیا ہے۔

ٹالسٹائی نے اس ناول کی بابت جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ بہت صحیح ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"اسموک میں کسی شے کے لئے محبت و ترحم کا جذبہ بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ اس میں اہل روس کی رجعت پرستی پر ماتم کیا گیا ہے پوری کتاب میں شاعرانہ تخئیل کا عنصر اس قدر کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"ورجن سوائل" ٹرگنیاف کا ادبی کارنامہ اور اُسکے سلسلۂ تصنیف کی آخری کڑی ہے۔ "فادرز اینڈ چلڈرن" میں نہلزم کے صرف فلسفیانہ رُخ کو پیش کیا گیا تھا اور نہایت احتیاط کیساتھ جذبات و روایات کے بیان سے احتراز کیا گیا تھا۔ کیونکہ یہی چیزیں ہیں جو کسی قوم کی ترقی میں خاص طور سے حائل ہوتی ہیں۔ اس انداز تحریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناول کی اشاعت کے چند ہی سال بعد نہلزم نے ایک پُرآشوب و جنگ آور تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ "ورجن سوائل" کے صفحات پر اسی تحریک کی ابتدائی رفتار کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جو کردار اس ناول میں پیش کئے گئے ہیں اُن کا مطالعہ مصنف کے اس کمال کی طرف چشمک زن ہے کہ اُن کے ذریعہ اُس نے روسی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کس خوبی کیساتھ پیش کیا ہے۔

اس ناول کا ایک کردار "نیزڈانوف" ہے۔ یہ ایک شاعر اور نیم ملوکیت پسند شخص ہے۔ اُسکے دل میں اپنے ملک کی ترقی و بہبود کا جذبہ پورے طور پر موجود ہے۔ مگر مخالف ماحول سے متاثر ہوکر جس میں اُسکی نشوونما ہوئی ہے وہ اپنی بلند شخصیت کو اپنے ہموطنوں کے درمیان متعارف کرانے میں ناکامیاب رہتا ہے اور اُسکی کوششیں برباد ہوجاتی ہیں۔

"اسپلیگن" ایک دوسرا شخص ہے جو چرب زبانی اور نمایش میں کمال رکھتا ہے مگر عمل سے کوسوں دور۔ وہ اس شہنشاہیت کا عقیدتمند نمائندہ ہے جسکے خلاف تحریک معرض وجود میں آتی ہے۔

"فاتوش" اور "فلینوش" قدیم خیال کا ایک جوڑا ہے جو جدید تحریکات اور تکدر سیاسی فضا سے علیحدہ رہ کر سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے پر قانع ہے۔

"میرینا" ایک نوجوان دوشیزہ ہے۔ یہ نہلسٹ خیالات کی سرگرم پیروکار ہے۔ صنف نازک کے جوان العمر طبقہ کی پیشانی سے بیکاری کا داغ دُور کرنیکی غرض سے جنگ آزادی میں دلیرانہ شامل ہوجاتی ہے۔

اس طرح متضاد طبائع کے رجحانات و مباحث کے ذریعہ ٹرگنیاف نے اس عظیم الاثر تحریک کے مخالف و موافق پہلوؤں کو ناظرین کے سامنے پیش کردیا ہے جسنے متعدد ناکامیوں کے بعد آخرالامر روس کو

اُس درجہ پر پہونچا دیا جہاں آج ہم اُسے دیکھ رہے ہیں۔

سطور بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ ٹرگنیاف کی تصانیف کیا تاریخی کیا ادبی ہر لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ اسکے ناول اُس اُس سالہ روسی زندگی کے مرقعے ہیں جبکہ روسی سوسائٹی عظیم الشان سیاسی انقلابات میں سے گزر رہی تھی۔ ٹرگنیاف کا دل تعصب سے بالکل پاک تھا۔ اس لئے اُسکا دماغ معقول اور جدید خیالات کو قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اُسکی دوررس نگاہ ہر شے کے جزئیات تک پہونچ جاتی تھی۔ اُسکے تمام ناول اُس دور کے خیالات اور تحریکات کے فوٹو گراف ہیں جنہیں وہ مصور کے قلم سے تیار کرتا ہے اور جن میں شاعرانہ اعجاز سے جان ڈالتا ہے۔

کروپٹکن لکھتا ہے کہ "جذبات کی مصوری، ادبی صنعت کاری اور لطافت بیان کے اعتبار سے ٹرگنیاف روس کا سب سے بڑا ناول نویس ہے"۔

اس کی شگفتہ تحریریں ادب کی خوبیاں اس طرح پنہاں ہیں کہ سرسری نظر سے اُنہیں دیکھ نہیں سکتے۔ گویا وہ پانی کا ایک شفاف چشمہ ہے جسکی دلکش سطح کا حسن ناظرین کی نگاہ کو اپنی طرف اس طرح متوجہ کر لیتا ہے کہ اندرونی خزانوں تک پہونچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

ٹرگنیاف کا پلاٹ عموماً نہایت سادہ ہوتا ہے۔ واقعات کا تسلسل غیر معمولی خوبی کیساتھ جاری رہتا ہے اور اُن میں جدید حالات کا اس طرح اضافہ ہوتا ہے کہ ناظرین کا انہماک بڑھتا جاتا ہے اور واقعات کے چہرہ سے پردے اُٹھتے جاتے ہیں۔ پھر یکایک منظر تبدیل ہوتا ہے اور ایک ہیبت ناک ٹریجڈی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ مگر مصنف کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے ناظرین کو اس وحشت ناک منزل میں چھوڑ کر نہیں چلا جاتا بلکہ قصہ آگے چلتا ہے جس سے اُن کا احساس غم آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

اُسکے ہر ناول میں خواہ وہ ضخیم ہو یا مختصر مختلف اجزا کے تناسب و ترتیب میں ایک خاص تنظیم مدنظر رہتی ہے۔ جب وہ کسی قصہ کو مختلف منزلوں سے گزار کر اختتام پر پہونچاتا ہے اُسوقت اُس کا کمال دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

یہ وجوہ ہیں جنکی بنا پر ٹرگنیاف کے ناول فنی زاویہ نگاہ سے مکمل اور صدر درجہ قابل ستائش تسلیم کئے گئے ہیں۔ جب وہ کسی کردار کی انفرادی خصوصیات پر بحث کرتا ہے یا بحیثیت کسی جماعت کے نمائندہ کے اپنی جماعت کے اخلاق و عادات کا نمونہ پیش کرتا ہے تو ان موقعوں پر وہ مصوری کا فرض پورے طور سے ادا کرتا ہے۔

جین آسٹن کی طرح وہ افراد ناول کے خیالات کو مکالمہ کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے خیالات کے متعلق اپنی رائے کا بھی اظہار کرتا جاتا ہے۔ لیکن یہ رائے وہ اُن لوگوں کی زبان سے ادا کرتا ہے

جو افراد ناول کے متعلق باہم تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔

ایڈورڈ گارنٹ لکھتا ہے کہ "الفاظ کے ذریعہ مصوری کرنا، مختلف کرداروں کا معقولیت کیساتھ ایک جگہ جمع کرنا، متعدد اشخاص کے متضاد تاثرات کو ترتیب دینا ایسی باتیں ہیں جو روسی مصنفین پر ٹرگنیاف کی فضیلت ثابت کرتی ہیں۔" مثال کے طور پر ہم "آن دی ایو" کی ہیروئن ایلینا کو لیتے ہیں جسے مختلف الطبع خوستگاروں میں سے ایک کے انتخاب کا فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ والد کے دل میں اپنی لڑکی سے نفرت، ماں کی والہانہ محبت، برسنف کا اختلاف مذاق، شوبین کی تنک مزاجانہ نکتہ چینی، انسروف کا جذبۂ آزادی اور وطن پرستی اور انجام کار اسی کا انتخاب یہ تمام صورتیں ایلینا کی روحانی گہرائیوں اور عدیم النظیر خلوص پر روشنی ڈالنے کے لئے بہم پہونچائی گئی ہیں۔

المناک واقعات کے بیان میں ٹرگنیاف، ڈکنس کی طرح بیکار طول نہیں دیتا۔ حادثات مرگ کے بیان میں وہ ہمیشہ جذبات پر قابو رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کے موقعوں پر وہ کوئی بات ایسی نہیں لکھتا جو مصنوعی یا خلاف فطرت معلوم ہو۔ مشہور مصنف بریلنٹریز کا قول ہے کہ اپنی تصنیف میں بالزک جس جگہ غیر ضروری جوش کا اظہار کرتا ہے اور آزیبک ارادتاً چپ سادھتا ہے اور ڈکنس طفلانہ طور سے جذبات کو برانگیختہ کرنیکی کوشش کرتا ہے اسوقت ناظرین کو قدرتاً الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ٹرگنیاف کے یہاں کمال ہوشیاری کیساتھ ان تمام چیزوں سے احتراز کیا جاتا ہے۔ ٹرگنیاف فلسفی کا دماغ اور شاعر کا دل رکھتا تھا۔ اس کا انداز یہ ہے کہ اپنے ناولوں میں وہ اولاً عملی زندگی کے کسی خاص پہلو کو لیتا ہے۔ اور فلسفیانہ اصول سے اس پر بحث شروع کرتا ہے۔ پھر دفعتاً اس کے شاعرانہ تخیل میں تموج پیدا ہوتا ہے اور اپنے ناظرین کو خشک ریگ زار سے نکال کر فردوس بہاریں پہونچا دیتا ہے۔ وہی افراد جو ابھی ہم ہی جیسی مخلوق معلوم ہوتے تھے یکایک فضائے قدس میں پرواز کرنے لگتے ہیں اور اپنے جمال سے دیکھنے والوں کو محو حیرت بنا دیتے ہیں۔

ہارڈی کی طرح ٹرگنیاف کا رجحان طبع غم آگیں واقعات کی طرف زیادہ پایا جاتا ہے۔ صبح لطافت کی بہ نسبت شام مصیبت کا رنگ اسکے یہاں زیادہ نمایاں ہے لیکن اسی تاریکی میں کبھی کبھی امید کی کرن بھی اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ مثلاً "فادرز اینڈ چلڈرن" میں جہاں وہ اس منظر کو پیش کرتا ہے کہ ہیرو کے غم رسیدہ والدین اسکی قبر پر روزانہ آکر خوشبودار پھولوں کے پودے لگاتے ہیں اور اسکی مغفرت کے لئے خدا سے دعا کرتے ہیں وہیں یہ سوال بھی کرتا ہے کہ "کیا ان کے آنسو اور تمام دعائیں بیکار جاتی ہیں؟ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ سچی اور مقدس محبت اپنے اندر کوئی طاقت نہ رکھتی ہو؟" پھر خود ہی جواب دیتا ہے "وہ دل جو لحد کے اندر دفن ہے گناہوں میں خواہ کتنا ہی آلودہ کیوں ہو مگر قبر پر اگے ہوئے پھول جو اپنی معصومانہ دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں وہ اسکے ابدی سکون و راحت کی اطلاع دیتے ہیں۔"

ٹرگنیاف کے بعد روسی مصنفین کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جس نے اپنے لئے ادب میں نئے راستے نکالے۔ ان کے ادبی ہنگاموں کے سامنے ٹرگنیاف کی شہرت عارضی طور پر دب سی گئی تھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب ٹالسٹائی یا ڈاسٹسکی کے طوفان ادب سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو ٹرگنیاف کا ادب کسی قدر مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شاعرانہ کمال کے نمونے اور سیاسی جماعتوں کے اختلافی نظریے اور گوناگوں جذبات کے پیش کرنے میں اس کا رتبہ بہت بلند ہے۔ جب کبھی ادب کو فطرت انسانی کا ترجمان تسلیم کیا جائے گا اسوقت ٹرگنیاف کے ناول عدیم النظیر قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ان امور کو ظاہر کرتے ہیں جو زندگی میں لطافت، خیالات میں بلندی اور اخلاق میں پاکیزگی پیدا کرتے ہیں۔

جذباتِ محمود

نواب محمود علی خاں محمود

محبت کی فضا ہوتی، عقیدت کی زمیں ہوتی
وہیں اک آستاں ہوتا، وہیں مری جبیں ہوتی

تمہارے مسکرانے سے فضا ہنستی چمن ہنستا
کہیں ایسا فلک ہوتا، کہیں ایسی زمیں ہوتی

اگر دیوانگیٔ عشق ہوتی راہِ منزل میں
قدم میرے جہاں رکتے میری منزل وہیں ہوتی

جھکانا سر کا ہر پتھر پہ توہینِ عبادت ہے
جہاں وہ سنگِ در ہوتا وہیں میری جبیں ہوتی

جلا کر راکھ کر دیتی حیاتِ عشق کو میرے
اگر کچھ سوزِ غم کے ساتھ آہِ آتشیں ہوتی

غمِ فرقت ہی کیا ہے دل کی دنیا تک بدل جاتی
نگاہِ ناز انکی گر محبت آفریں ہوتی

نہیں معلوم کب تک روتی رہتی عشق کی دنیا
جو میرا اشک ہوتا اور انکی آستیں ہوتی

وہ ہوتے اور ہم ہوتے نہ کچھ بھی رنج و غم ہوتا
ہمارا آسماں ہوتا ہماری ہی زمیں ہوتی

مریضِ ہجر کی محمود بس اتنی تمنا ہے
انھیں جب دیکھ لیتا تب نگاہِ واپسیں ہوتی

"مالن"

(از خان علی احمد خاں صاحب شاد عارفی)

للعجب! نیرنگیٔ قدرت کی ہر کاریگری — چار خاکی پتلیوں میں جلوہ فرما اِک پری
شوخیاں کرتی ہے کیا کیا فطرتِ شوخی طراز — ہنس کوتوں میں نظر آتا ہے اور چیلوں میں قاز
"صحبتِ ناجنس بیدا بخیر" پر خنداں گلاب — بن کے اندر ڈھاک میں نازک چنبیلی پر شباب
تھوہڑوں میں "توتیا" جلوہ دکھاتا ہے کبھی — بنجروں پر کاسنی بھی پھوٹ آتی ہے کبھی
نیل کے پودوں میں پوشیدہ گلِ عباس! واہ — نرگسِ خود رَو کے چہرے پر "بندر یا گھاس"[1] واہ

التماسِ شرح بالا طولِ بے حاصل نہیں — حسن اور تخصیص قوم و ذات میں قائل نہیں
طبقۂ ادنیٰ کی صنفِ نیم نازک اور حسن — موقع و ماحول پر کرتا نہیں ہے غور حسن
پھول والی ماہ پارہ دیکھتا ہوں جس کو روز — مالنوں کی طرح مالن ہے مگر گلشن فروز
نوبہارِ ناز۔ گلزارِ نمو صبح میں — انکشافِ راز۔ انوارِ ورودِ صبح میں
پھول چُنتی ہے کسی شاعر کی تخئیلِ حسیں — یا کسی زاہد کی موضوعِ عبادت۔ حورِ عیں
یاسمن بن آئی ہے دوشیزۂ طرفِ چمن — یا کسی مندر کا خواب آلود و مستانہ بھجن
پڑ گئی ہے جان قمری کی صدائے مست میں — نغمۂ ناہید آیا ہے "لباسِ مست" میں
وہ لباسِ مست جو بے مانگی سے چاک چاک — جس کی رنگت پر غریبی ڈال دے کلیوں کی خاک
پیرہن "گرد کثافت خواہ" سے وارستہ حال — اِک صدی پہلے کا جیسے عاشقِ آشفتہ حال
جس میں زریں کاریٔ سوزن کی آرائش نہیں — پردہ داری پاؤں پھیلائے تو گنجائش نہیں
جا بہ جا خاکستری چادر پہ دھبے تیل کے — مائلِ وسعت لکر کو ب زمانہ جھیل کے
پارہ پارہ آستینیں۔ کہنیوں سے بے نیاز — جیسے بوسیدہ غلافِ ساز۔ عرضِ شکلِ ساز
نذرِ فاقہ۔ قیمتِ تزئینِ زلفِ گندہ بُو — عہدِ موجودہ کا جیسے شاعرِ پیچیدہ مُو
اور۔ کیا تفصیل، سینہ بندِ خام انجام کی — جیسے "دوبیتی"[2] "مصورِ حضرتِ خیام" کی

---

[1] ایک قسم کی گھاس۔ [2] رباعی۔

اِس بُری حالت میں "صانی رنگ" لہنگے کے پٹاؤ جیسے انگلستان کے نقشے میں ساحل کے کٹاؤ
سر بہ سر اضداد کے اوجھل ہیں ہیں اسرارِ غیب شعر کیا، دنیا میں ملتا ہے "شترگربہ" کا عیب

روشنائی ہے جہاں تک دیدۂ ادراک میں
چھپ نہیں سکتی صباحت ملگجی پوشاک میں

جذباتِ اثر

(از حضرت اثر رحمانی رامپوری)

خوگرِ دردِ عشق بن، کیفِ مدام ہے یہی زیست کو پُرسکوں بنا، عیشِ دوام ہے یہی
بہرِ دلِ ستم نصیب، قیدِ دَوام ہے یہی جس کی سحر نہ ہو کبھی، آہ وہ شام ہے یہی
گردشِ چشمِ مست ہو، دَورِ مئے الست ہو مستِ الست کے لئے" بادہ بہ جام ہے یہی
مَیں ہوں اور اُن کی یاد ہو، دل ہے اور اُن کا درد ہے دونوں کو ہے اگر کوئی کام، تو کام ہے یہی
دیکھو جسے وہ شاکیِ جور و جفائے دوست ہے کارگہِ مجاز میں، شورشِ عام ہے یہی
دل سی عزیز چیز پھر ڈھونڈھے نہ ہاتھ آئے گی اتنا سمجھ لو تم، اگر مشقِ خرام ہے یہی
خونِ جگر سمجھ کے ہم پیتے ہیں جس کو ہجر میں زہر سے ہے جو تلخ تر، آہ وہ جام ہے یہی
عشق کی اوّلیں نظر، جا نہ سکے جو بے اثر حسنِ تمام کے لئے، جذبِ تمام ہے یہی

کہتی ہے اُس کی چال ڈھال، یہ بہ زبانِ حال اثر
فتنہ طراز ہے یہی، حشر خرام ہے یہی

نگاہوں میں یہ رقص کرتی محبت اداؤں میں یہ آرزو کی حرارت
ہراِک گام پر گنگناتی ہے فطرت ہراِک موڑ پر مسکراتی ہے جنّت

مجھے اور خیالِ جناں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

(بنا ادب) نے نظامی

ہمارے افسانے

(از سید مظفر برنی، بی۔اے)

ادب زیر و بم زمانہ پر رقص کرتا ہے اور سازِ حیات پر مضراب زن ہوتا ہے، اس لئے ادب اثرات زمانہ سے بیگانہ اور مظاہرِ حیات سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ آج دنیا جس دَور سے گذر رہی ہے اُسے دَورِ استحالہ Transition Period کہنا چاہیئے۔ یہ دَور ہر مکمل انقلاب کا پیش رو ہوتا ہے۔ سیاسی نظریے، معاشرتی معتقدات، اقتصادی لائحہ عمل سب میں ایک نمایاں تغیر رونما ہے۔ زندگی کی بنیادی قدریں بدل رہی ہیں۔ شعر و ادب کے مسلمات یکسر منقلب ہو گئے ہیں، سماجی بندھن ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ اخلاقی قوانین کی گرفت نرم ہو چکی ہے۔ مذہب کی نبضیں چھوٹ چکی ہیں۔ نورِ وحدانیت کو مادیت کی گھنگھور گھٹائیں گھیر رہی ہیں۔ تجارت کا بازار گرم ہے، سیاست کا بول بالا ہے، سائنس کا دَور دَورہ ہے۔ بہیمیت کی آندھی چڑھتی چلی آرہی ہے انسانیت پیچھے ہٹتی جارہی ہے۔ عالمگیر جنگ نے انسان کو لوہے کے ٹکڑوں سے حقیر کردیا ہے، ظالم و مظلومیت، آمریت و جمہوریت ایک ہولناک کشمکش میں مبتلا ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ پرولتاریہ[1] طبقہ کو کچل رہا ہے۔ ایک کرب و اضطراب ایک عجیب بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دنیا کسی ہولناک بھنور میں پھنس گئی ہے۔ سیاسی قیود، اقتصادی مشکلات، تعلیمی پستی، سماجی افراتفری، روحانی جمود، اخلاقی کمزوریاں، لغو رواج، فرضی ڈھکوسلے، توہم پرستی، قدامت پسندی وغیرہ اس سمندِ ناز پر تازیانہ ہیں۔

ہمارے[2] افسانے ایک ایسے ہی دَور کی پیداوار ہیں۔ ایک ایسی ہی حیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ جدید افسانہ نگاری پر تین اثرات نہایت نمایاں نظر آتے ہیں۔ اول اشتراکیت کا اثر ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد کے نظریۂ اشتراکیت نے روس میں عملی جامہ پہنا۔ یہ اشتراکی انقلاب فرانسیسی انقلاب کے بعد پہلا انقلاب تھا جس طرح فرانسیسی انقلاب نے اس زمانہ کے شعر و ادب پر نہایت گہرا اثر ڈالا تھا اُسی طرح اس اشتراکی انقلاب نے بھی دنیا کے ادب کو کافی حد تک متاثر کیا۔ سوویٹ[3] ادب، افسانہ نگاری میں بالخصوص دوسری مغربی زبانوں کے

---

[1] Prolelariate

[2] ان سے مراد جدید ترقی پسند افسانوں سے ہے نہ کہ اُردو کے تمام افسانوں سے۔ اس لئے آپ کو ممتاز افسانہ نگار حضرات پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری وغیرہ کا قطعاً ذکر نہ ملے گا۔

[3] Soviet

ادب سے نہایت ممتاز ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روسی افسانے دنیا کی تمام زبانوں میں منتقل ہونا شروع ہوئے۔ اُردو بھی اس سے محروم نہ رہی۔ اُردو میں ٹالسٹائی، گورکی، ترجنیف، چیخوف وغیرہ مشہور روسی افسانہ نگاروں کے تقریباً تمام مشہور افسانے ترجمہ ہو چکے ہیں۔ گو ایڈگر ایلن پو، ہاتھورن، او ہنری، موپاساں، سٹیونسن، ایف۔ اے ڈبلیو تبین۔ وغیرہ شہرہ آفاق افسانہ نگاروں کے شاہکاروں سے بھی اُردو کا دامن تہی نہیں۔ لیکن روسی افسانے ہمارے ادب میں رچ گئے ہیں۔ اس کی چند وجوہات ہیں۔ جغرافیائی اختلافات سے قطع نظر ہندوستان اور انقلاب سے پہلے کا روس بہت حد تک مشابہ تھے۔ بلکہ مغربی ممالک میں سے اگر کوئی ملک ہندوستان سے مشابہ دنیا میں کہا جا سکتا ہے تو وہ روس پیش از انقلاب ہے۔ دونوں کی سیاسی و تمدنی حالت یکساں تھی۔ غرض ہمارے افسانوں میں اشتراکیت کی روح جاری و ساری نظر آتی ہے۔ اشتراکیت نہ صرف ایک اقتصادی لائحہ عمل کا نام ہے بلکہ ایک مسلسل جہاد ہے ہر اُس چیز کے خلاف جس نے سرمایہ دارانہ نظام کو استحکام بخشا۔ اس میں مذہب۔ اخلاق ادب، سب کچھ آ جاتا ہے۔ لہٰذا بغاوت کا جذبہ اشتراکیت کا جزو بن گیا ہے۔ بغاوت سرمایہ داری سے، قدامت پرستی سے، پُرانے رسوم و رواج سے، مزمنہ اخلاقی قوانین سے، مذہب سے، مختصر یہ کہ مکمل بغاوت، تمام مسلّمات سے اِسی بغاوت کی جھلک ہمارے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔

دوسرا اثر افادیت (Pragmatism.) کے تجارتی نظریہ کا ہے۔ اب دنیا ہر معاملہ میں تجارتی سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ ہر چیز کی قدر و قیمت اس کے فائدہ کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ ہر شے نفع و نقصان کے کانٹے میں تولی جاتی ہے۔ ادب کا بھی یہی معیار ہے۔ اگر ادب ہماری زندگی میں ممد و معاون نہیں ہو سکتا تو اس کی کوئی وقعت نہیں۔ اگر ادب سے فرد و جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا تو وہ بیکار لغو اور تباہ کن ہے۔" ادب برائے ادب" کی بجائے "ادب برائے زندگی" کا نظریہ مروج ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اب کوئی افسانہ نگار محض کسی اچھوتے پلاٹ کی خاطر افسانہ نہیں لکھتا۔ وہ کردار نگاری کے لئے کسی اعجوبۂ روزگار فرد کی تخلیق نہیں کرتا۔ بلکہ وہ افسانہ کسی مقصد کے تحت لکھتا ہے محض تفریح کے لئے نہیں۔ وہ کوئی بلند مقصد، کوئی اصلاحی اشارہ کوئی بامعنی حقیقت پیش کرتا ہے۔

تیسرا اثر مشہور عالم ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ کے نظریۂ تجزیۂ نفسی[۵] کا ہے۔ اس نظریہ نے تمام ادبیات عالم کو متاثر کیا ہے۔ آج ہمیں اپنے افسانوں میں افراد کی ظاہری شکل وصورت، خدوخال، حرکات و سکنات کے علاوہ ان کے کیرکٹر کا نفسیاتی تجزیہ بھی ملتا ہے۔ گویا افسانوں میں نفسیات نگاری مخصوص حیثیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے افسانے واقعیت و حقیقت کے لحاظ سے عکسی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔

---

۵ Psycho-analysis

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے افسانے زندگی کے کن کن مسائل کو حل کرتے ہیں؟ سماج کے کن کن نقائص کو اُبھار کر پیش کرتے ہیں؟ اور وہ کس حد تک ہماری زندگی سے قریب اور ہمارے لئے مفید ہیں؟

ہماری زندگی کا سب سے اہم مسئلہ "مسئلہ شکم پری" ہے۔ ہمارے افسانے ہندوستان کی اقتصادی پستی کے منہ بولتے مرقعے ہیں۔ ان کے کردار لکڑی ڈھونے والے مزدور، سڑک کوٹنے والی عورتیں، صبح سے لے کر رات تک مغز سوزی کرنے والے زرد رو کلرک، ملوں کے دو دو چار چار آنے پر اپنے پھیپھڑے سڑانے والے کارخانہ دار، روٹی کے سوکھے ٹکڑے پر لڑنے والے انسانی درندے۔ غرض وہ تمام بھوکے ننگے مجبور بیکس بے نوا انسان ہیں جو ہم روز اپنے آس پاس صبح وشام ہر جگہ ہر وقت چلتے پھرتے دیکھتے ہیں۔ ان میں منظر کشی کے لئے کھلی، موئی جھونپڑیاں، تنگ وتار کوٹھریاں، ٹپکتے ہوئے چھپر، پاس پاس بنے ہوئے تاریک مکان جن کے رہنے والے قدرت کی نعمتوں ہوا، دھوپ اور روشنی سے بھی محروم ہیں، گندی گلیاں، بدبودار محلے منتخب کئے جاتے ہیں ان کا پلاٹ کہیں خستہ حال نادار انسانوں کی سسکتی رینگتی کراہتی زندگی کی عکاسی کرنا ہے، کہیں متوسط طبقہ کی مجبور و مقہور زندگی کا نقشہ کھینچنا۔ کہیں دولت کی غیر مساوی تقسیم اور سماجی طبقاتی تقسیم کی بے انصافی کا احساس پیدا کرنا۔ کہیں یہ واضح کرنا کہ دولت انسانی خوبیوں کی بنا پر نہیں بلکہ حادثۂ پیدایش کی وجہ سے ملتی ہے، کہیں سرمایہ دار طبقہ کی بے حسی اور جمود کا نقشہ کھینچنا، کہیں ادنیٰ طبقے کو ان تمام انسانی صفات کا مالک دکھانا، جو اعلیٰ طبقہ میں احساس برتری اور رعونت و دولتمندی سے مٹ چکی ہیں

ہمارے افسانے جنسی زندگی کو بھی پہلی مرتبہ روشنی میں لا رہے ہیں۔ جنسی جذبہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے، سگمنڈ فرائیڈ اور ہیولاک ایلس وغیرہ ماہرین جنسیات نے ثابت کیا ہے کہ شہوت و اشتہا ہی وہ دو اساسی جذبے ہیں جن کی مدد سے انسان ترقی کرتا رہا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سائینس، ادب اور تمام فنونِ لطیفہ اسی جذبۂ جنسی کا مظہر ہیں۔ جسے سگمنڈ فرائیڈ کے نظریہ کے مطابق گریز و اعراض کہتے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ انسان حیوانِ عاقل ہے، جہاں تک "حیوان" ہونے کا تعلق ہے وہ جذبہ سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ مشہور انگریزی ادیب ڈی۔ ایچ۔ لارنس کا قول ہے کہ زندگی میں جنسی جذبہ اور عقل کا غیر متوازی توازن ہی ہماری بہت سی ذہنی ونفسی عوارض کا باعث ہے۔ ہمارے افسانے جذبۂ جنسی کی عکاسی صرف اعصابی ہیجان پیدا کرنے کے لئے نہیں کرتے بلکہ وہ یا تو اس کے عجیب وغریب مظاہرات کی تصویریں ہیں جیسے سعادت حسن منٹو کا افسانہ "دلال" یا پھر ارذل نفس پرستی کو اس مقصد سے پیش کرتے ہیں کہ اس کی اصلاح ہو سکے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں، مثلاً جنسی فاقہ کشی، غلبۂ جنسیت یا میلان ہم جنسی وغیرہ۔ اول الذکر کی مثال کرشن چندر کا افسانہ "قبر" ہے۔ اس کا ایک فقرہ نقل کردوں جو اگرچہ

Sex starvation — Morbid sexuality — Digreassion — Hamo-sexuality — over-sexuality

ایک تلخ حقیقت ہے تاہم حقیقت ہے۔ افسانہ کا ہیرو کہتا ہے:۔

"پچیس چھبیس سال کی جبتی فاقہ پرستی کے بعد اگر ہندوستانی نوجوان کی زندگی میں ایک عورت آجائے، کوئی عورت، کانی عورت، لُنجی عورت، ایک عورت جو تمھارے پرنانے سے بھی حسین ہو، لیکن ہو عورت، تو وہ کیوں نہ چوم چوم کر اس کا حلیہ بگاڑ دیوے۔"

غلبۂ جنسیت کے لئے محترمہ سروج ماتھر کا افسانہ "بےسرا" مطبوعہ سالنامۂ ادب لطیف" ۱۹۴۱ء ملاحظہ ہو۔ ایک جوان عورت جس کا خاوند بڈھا ہے ایک چینی تصویر فروش نوجوان کو اپنے گھر میں بلاتی ہے اور اُسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ غریب کچھ نہیں سمجھتا، عورت ایک آہِ سرد بھرتی ہے اور پھر ڈپٹ کر اسے نکال دیتی ہے اس میں دونوں پہلو فاقہ کشی اور غلبۂ جنسی نظر آتے ہیں۔ یہاں قدیم و جدید افسانہ نگاری کا فرق بھی نمایاں ہوجاتا ہے۔ منشی پریم چند نے بھی اس موضوع پر (جوان عورت کی بڈھے مرد سے شادی کردینا) افسانے لکھے ہیں، اور اسی موضوع پر ڈاکٹر ٹیگور کے افسانے بھی اردو میں ترجمہ ہوچکے ہیں لیکن قدیم و جدید افسانہ نگاروں کے طرز میں فرق ہے گو اصلاح دونوں کے مدنظر ہے۔ جدید افسانہ نگار اس سوشل مسئلہ کو جنسیت کی روشنی میں اُجاگر کرتا ہے۔ اسی طرح مختلف افسانے جن کی بیباکی اور کبھی کبھی عریانی پر بڑی لے ہوتی ہے۔ اسی قسم کے مفید اصلاحی نکات پیش کرتے ہیں۔ میلان ہم جنسی پر چودھری محمد علی کا افسانہ "ہم جنس" دنیا (مندرجہ رسالہ ادبی دکلیم) اپنی طرز کا پہلا افسانہ ہے۔

ہمارے افسانے نہ صرف معمولی بیانیہ داستانیں ہیں جو وقت گزارنے یا دلچسپی کے لئے لکھی اور پڑھی جاتی ہیں، بلکہ یہ ہمارے سماج پر بےلاگ تبصرے اور ہماری زندگی کی ہمدردانہ تنقیدیں بھی ہیں۔ ان میں طنز کے زہریلے نشتر بھی چھپے ہوتے ہیں اور اصلاح کے بامعنی نکتے بھی۔ اس وقت میرے سامنے ادب لطیف فروری ۱۹۴۱ء ہے اس میں پہلا افسانہ محترمہ عصمت چغتائی کا ہے عنوان ہے "سفر میں" یہ افسانہ چلتی ہوئی ریل کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے مناظر کے پہلو بہ پہلو زندگی کی مختلف جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں پیش کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حیات کے مختلف تاریک پہلوؤں پر گہری طنز بھی ہے۔

علاوہ ازیں ہمارے افسانوں میں مقامی رنگ "بہت گہرا نظر آتا ہے جس سے ان کی واقعیت بڑھ جاتی ہے، ہندوستان جیسے وسیع ملک کے باشندے اپنے دوسرے ہم وطنوں کے طرزِ معاشرت و عادات و اطوار وغیرہ سے ناواقف ہیں اس لئے اس قسم کے افسانے ہماری نگاہوں کے سامنے ملک کے مختلف حصوں کی امتیازی خصوصیات، وہاں کے بسنے والوں کے رہنے سہنے کے ڈھنگ، ان کی عجیب و غریب رسموں اور ریتوں ان کی مخصوص عادات و اطوار کی تصویر پیش کردیتے ہیں جس سے ہم میں ایک قومی قربت اور وطنی احساس

Local colour

پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بیدی کا "چھوکری کی لوٹ" اُپندر ناتھ اشک کا "ڈاچی" کرشن چندر کا "زندگی کے موڑ پر" ملاحظہ ہوں۔ مزید براں یہ اس وبا کے ردّ عمل کا نتیجہ ہے۔ جس کے زیر اثر ہر افسانہ نگار اپنے افسانہ کا منظر کسی رومان آفریں اجنبی سرزمین میں رکھتا تھا۔ جو بعض دفعہ ناواقفیت کی وجہ سے مضحکہ خیز ہو جاتے تھے۔ ایک لسان القوم" افسانہ نگار صاحب نے اپنے ایک نہایت مشہور افسانہ کے منظر کے لئے مصر کی سرزمین منتخب کی اور فطری مناظر کے سلسلہ میں وہاں آبشار کا بھی ذکر کیا۔ جن لوگوں نے ابتدائی جماعتوں کا جغرافیہ پڑھا ہے وہ لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ مصر میں آبشار کہاں۔ بہرکیف یہ رُجحان ہر لحاظ سے مستحسن کہا جاسکتا ہے

مولانا محوی لکھنوی نے "زمانہ" کی کسی گزشتہ اشاعت میں اسی عنوان کے ماتحت لکھا تھا کہ آج کل افسانوں میں نوجوان لڑکے اور لڑکی کی نہایت تخئیل آفریں رومان پرور محبّت کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ معمولی یا مبتدی افسانہ نگاروں کے افسانے اس قسم کی سستی رومان پرستی سے معمور ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مستند اور اعلیٰ افسانہ نگاروں کا تعلق ہے وہ اس الزام سے بری ہیں۔ ان کے افسانوں میں اکثر و بیشتر ازدواجی محبت کا ذکر ہوتا ہے یا کسی گہری حقیقت کو مؤثر بنانے کے لئے محبت پس منظر کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ یا پھر محبت حقیقت و واقعیت پر مبنی ہوتی ہے۔ محض ایک تخئیلی دنیا ——— خوابوں کی سی حسین دنیا ——— بنانا اور رومان آفریں فضا پیدا کرنا ان کا مقصد نہیں۔ ان کے افسانوں میں سماج کا کرب و اضطراب اور زندگی کے دل کی دھڑکن بند ہے۔ ان میں گہری حقیقتیں اور بنیادی مسائل ملیں گے۔

ہمارے افسانوں کا مرکز سماج کی کوئی نہ کوئی بُرائی ہوتی ہے۔ اس قسم کے اصلاحی افسانے منشی پریم چند آنجہانی نے لکھنے شروع کئے تھے، آج بھی تقریباً تمام افسانے کسی خاص مقصد کو مدنظر رکھکر کوئی سبق سکھانے اور کسی نہ کسی افادی نقطۂ نظر سے لکھے جاتے ہیں۔ اکثر افسانوں میں کوئی خاص آئیڈیل، کوئی نہایت بلند نصب العین بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اب تک جن افسانوں کا ذکر ہوا وہ ایسے تھے جن کو پڑھکر آپ کہنے لگتے ہیں یا "اگر ایسا ہی ہے تو کاش ایسا نہ ہوتا" اب ان افسانوں کا بھی مختصراً ذکر کرنا ضروری ہے جن کو پڑھکر آدمی کہہ اُٹھتا ہے "کاش ایسا ہی ہو جائے تو کتنا اچھا ہو!" اگر طب کے طلباء کو صرف بیمار جسم کی تصویریں دکھائی جائیں تو وہ صحت مند جسم کا تصوّر نہیں کر سکتے۔ اس لئے خیالی نہایت ضروری ہے۔ اُردو کے خیالی افسانوں میں نیاز فتحپوری کے افسانہ" شہاب کی سرگزشت کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ جدید افسانوں میں بھی اکثر خیالی افسانے ملیں گے۔ مثال کے طور پر علی سردار جعفری کا افسانہ "منزل" حب الوطنی کا وہ اعلیٰ آئیڈیل پیش کرتا ہے جس کے حصول کی خواہش ہمارے ہر بھائی بہن کے دل میں ہونی چاہیئے۔ اسی طرح علی عباس حسینی

سکے افسانہ "ہمسائی" میں طوائف کا جو کیرکٹر پیش کیا گیا ہے وہ ایک "خیالی" چیز ہے۔

آخر میں نقادوں کی ایک جماعت کے اس خیال پر اظہار رائے کی جرأت کی جاتی ہے کہ ادب جدید بہت حد تک ایک وقتی چیز اور نعمتِ دوام سے محروم ہے۔ ادب کی مثال ایک درخت سے دی جاسکتی ہے۔ جس طرح درخت اپنی خوراک زمین سے حاصل کرتا ہے ادب اپنا سامانِ بقا وارداتِ حیاتِ بشری سے حاصل کرتا ہے جس طرح درخت سورج سے روشنی لیتا ہے ادب اپنا رنگ و آہنگ زمانہ سے اخذ کرتا ہے، جس طرح درخت ہوا میں پھلتا پھولتا ہے اُسی طرح ادب ماحول کے زیراثر تشکیل پاتا ہے۔ جس طرح درخت زمین کے ذرات روشنی کے اجزاء، اور ہوا کے اثرات کو پھل پھول میں تبدیل کر دیتا ہے اُسی طرح ادب زندگی کے مسائل زمانہ کے حالات اور ماحول کے اثرات کے مطابق نہایت عجیب انداز سے حل کرتا ہے۔ ادب کو محض اسی وجہ سے عارضی نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے جس حیات کی عکاسی کی ہے وہ حد درجہ تاریک ہے 'یا جس زمانہ میں تشکیل پائی ہے وہ حد درجہ پست ہے۔ گلاب کا پودا کوڑے پر بھی اُسی نگہت کا مالک ہوتا ہے جو باغ میں پائی جاتی ہے اگر چارلس ڈکنس کے ناولوں اور افسانوں پر مُہرِ دوام ثبت ہے تو ہمارے افسانوں کے حیات کا دامن بھی دامنِ ابد سے وابستہ ہے۔ اگرچہ چارلس ڈکنس نے جس سوسائٹی کی عکاسی کی ہے وہ کبھی کی مٹ چکی، اور بہت سے مسائلِ حیات جن کو حل کرنے کے لئے اُس نے جد وجہد کی تھی وہ بوجوہ احسن حل کر لئے گئے تاہم ان میں وہ عناصر ہیں جو انسانی فطرت کے اساسی جذبات رنج، غم، غصہ، رحم، محبت اور نفرت کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ اور کرتے رہیں گے۔ اور اس لئے انھیں صرصرِ فنا سے مامون و مصئون رکھیں گے۔ ہمارے افسانے محض اس وجہ سے وقتی نہیں کہے جاسکتے کہ وہ زندگی جس کی یہ ترجمانی کرتے ہیں۔ خود حد درجہ مکروہ ناخوشگوار اور پست ہے اور یہ دَور بدل جانے والا ہے۔ جب تک ان میں سازِ قلب انسانی کے تاروں کو مرتعش کرنے کی قوت ہے وہ زندہ رہیں گے۔ ان کی بقا زندگی اور سماج کی بقا سے وابستہ نہیں ہے بلکہ ان کی بقا کی کفیل انسانی جذبات و احساسات ہیں۔ جب تک انسان میں ایثار و قربانی کا جذبہ موجود ہے، جب تک بے لوث خدمتِ قوم و وطن کا کوئی قصہ ہمارے دلوں کو گرماتا رہے گا یہ ہرگز صفحۂ ہستی سے محو نہیں ہوسکتے۔ بیدی کا "کوارنٹین" اشک کا "گوماں" علی عباس حسینی کا "باسی پھول" ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جب تک ازدواجی محبت باقی ہے بیدی کا "گرم کوٹ" باقی رہے گا۔ جب تک انسان کسی کی غربت دیکھکر کُڑھ سکتا ہے، جب تک انسان اخلاقی پستی پر نفرت سے بھویں سکیڑ سکتا ہے، جب تک ہم میں احساس کی آنچ باقی ہے ہمارے افسانے باقی رہیں گے۔ جدید افسانے پڑھنے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ ہماری زندگی کتنی دردناک ہے، ہماری کمزوریاں اور مجبوریاں کتنی بڑھ گئی ہیں، ہمارے سماج کی ہوا کتنی گندی

ہو چکی ہے کہ سانس لیتے دم گھٹتا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ کسی آزاد اور کھلی فضا میں سانس لیں اس وقت آپ مسز حجاب امتیاز علی کی کسی رومان آفریں کہانی کے لئے ترسنے لگتے ہیں۔ ہمارے افسانوں کی یہ کتنی بڑی کامیابی ہے کہ انھوں نے ہمارے احساس کی بجھتی ہوئی چنگاریوں کو چمکا دیا ہے، ہمارے سرد دلوں میں دھیمی دھیمی آنچ سلگا دی ہے۔ منشی پریم چند کا قول ہے "شعر و ادب کا منشا ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرنا ہے"۔ مجھے یاد ہے کہ میری ایک بہن نے جن کی دنیاوی واقفیت صرف کتابوں اور رسالوں تک محدود ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کی کتاب "دانہ و دام" واپس کرتے ہوئے کس قدر سچے درد، کیسے مایوس لہجہ اور کتنے گہرے احساس کے ساتھ کہا تھا "کیا ہماری زندگی واقعی ایسی ہی دردناک ہوگئی ہے جیسی اس میں نظر آتی ہے۔" اس کے بعد وہ کئی دن تک ملول رہیں۔ یہی ہمارے افسانوں کی بقا کا ثبوت ہے۔

جذباتِ سریر

(از مسٹر شیام نراین سریر)

کمالِ حسن ہے میری نظر میں جذبِ کامل سے
مہک پھولوں کی آتی ہے مجھے روحِ عنادل سے

ہزاروں میکدوں کی آبرو پر حرف لاتی ہے
صدا پیدا جو ہوتی ہے شکستِ شیشۂ دل سے

گراں تھا بارِ احساں ناخدا کا طبعِ نازک پر
ڈبو دی اپنی کشتی ہم نے خود ٹکرا کے ساحل سے

وہی رہرو ہے، منزل کا اسی نے راز سمجھا ہے
نہ منزل جس سے کھنچتی ہو نہ جو کھنچتا ہو منزل سے

مری جانِ حزیں کا حال، قصہ مختصر ہے یہ
رہی مشکل میں ہے مشکل میں، اور نکلے گی مشکل سے

کہیں خاکسترِ پروانہ، پروانہ نہ بن جائے
صدائے قُم نکلتی ہے سکوتِ شمعِ محفل سے

نظر ہو اک دہانِ زخمِ بسمل کی بھی جنبش پر
بہت قصے سُنے ہونگے زبانِ تیغِ قاتل سے

کہیں حد سے گزر جائے یہ کچھ باقی بھی رہتا ہے
مُسافر کا نشاں کیا خاک ہاتھ آئیگا منزل سے

یہ کیسا خونِ ناحق ہے، یہ کس کا خونِ ناحق ہے
ٹپکتا ہے لہو اب تک دہانِ زخمِ بسمل سے

بُرا لاکھوں میں ہے، پھر بھی بُروں سے لاکھ اچھا ہے
سریرِ خوش نظر کو کیوں نکالو اپنی محفل سے

افسردگی

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم۔اے)

دنیا کی کسی چیز میں لذت ہی نہیں ہے
یاں درخورِ رغبت کوئی نعمت ہی نہیں ہے

دل حُسن سے بہلاتے سو غنقا ہے یہاں حُسن
مائل بہ نمود اپنی طبیعت ہی نہیں ہے

رنگت ہے مگر جذب سے ہر رنگ ہے محروم
دل کھینچ لے وہ حُسنِ طبیعت ہی نہیں ہے

مر مر کے لگایا ہے پتہ ذوقِ فنا نے
یاں بوئے وفا خوئے محبت ہی نہیں ہے

کچھ کچھ تو تکلف ہے کہیں وضعِ حسیناں
ہے پر دلِ کمبخت کی قسمت ہی نہیں ہے

وہ اہلِ تکلف بھی نہیں ملتفت اس سے
خود سلسلہ جنباں ہو یہ جرأت ہی نہیں ہے

تعریف و تعارف کی بھی ہاں ٹھانتا یہ دل
پر شدتِ غم دیتی اجازت ہی نہیں ہے

وہ ہے غمِ آفاق، کہ دل سرد ہوا ہے
خوش ہو دلِ بے جاں میں یہ طاقت ہی نہیں ہے

ہم جیتے ہیں مدہوش کہ ہیں زندہ لحد میں
آگاہ ہوں خود جس سے وہ حالت ہی نہیں ہے

ذوقِ انانیت

دل میں اِک اضطراب ہے سانس میں پیچ و تاب ہے
نفسِ نفس گداز کی تند شرابِ ناب ہے

ذوقِ انانیت ترا موجبِ صد عذاب ہے
دامنِ بیخودی پکڑ جس میں بھرا ثواب ہے

عقل و خِرد کو کھو کے رہ مست و خراب ہو کے رہ
پیرِ مغاں سے لے کے دیکھ ہوش رُبا شراب ہے

زندگی گو کہ خواب ہے، خواب یہ پُر عذاب ہے
لطف تو خال خال ہے رنج تو بے حساب ہے

توڑ بھی دے طلسمِ خواب جو کہ ہے ظلمت و عذاب
درکِ لطیف تر جگا کس لئے محوِ خواب ہے

حالتِ نیم خواب میں درکِ لطیف تر کہاں
لہو و لعب کی زندگی حالتِ نیم خواب ہے

کھیل یہ کھیلنے ہیں کھیل پھر یہ عقوبتیں بھی جھیل
دوش پہ میتیں اُٹھا ہاتھ میں گر شراب ہے

جنتِ زندگی کی بس کیفیتیں یہی تو ہیں
دُور سے اب سلام ہے لذتوں سے جواب ہے

مدہوش

آخری شاہکار

(مسٹر رفیق علی خاں صابر)

سروجنی کی شادی کو ابھی تین مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ اُسے اِس بات کا احساس ہوا کہ نریندر اُس سے کھچا کھچا سا رہتا ہے۔ سروجنی ایک تعلیم یافتہ اور آزاد خیال عورت تھی، مگر اس کے باوجود وہ ایک لونڈی کی طرح نریندر کی خدمت میں کوشاں رہتی۔ نریندر بھی تصویر کشی کے صلہ میں جو کچھ لاتا وہ سروجنی کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ نریندر کے گھر میں سروجنی اچھا کھاتی، اچھا پہنتی، مگر پھر بھی وہ اداس رہتی۔ نریندر کی بے التفاتی اُس کے لئے سوہانِ روح بن گئی، وہ نریندر سے صرف ایک چیز چاہتی تھی، یعنی محبت۔ مگر بظاہر وہ نریندر کی سرشت میں جذبۂ محبت شمۃ برابر بھی نہ پاتی۔ کبھی وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتی کہ ایک آرٹسٹ کو اپنا آرٹ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتا ہے، شاید آج کل کسی بڑے شاہکار کے بنانے میں منہمک ہوں، فرصت ملے گی تو اپنی سروجنی کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔

اِسی موہوم اُمید پر کہ نریندر ایک نہ ایک دن ضرور اُس کی طرف ملتفت ہوگا زمانہ گذر گیا۔ وہ ہرگز تیار نہ تھی کہ ایسے شخص کو جسے جذبۂ محبت چھُوکر بھی نہ نکلا ہو، اپنے دل میں کوئی جگہ دے۔ محبت سے بھرے ہوئے ازدواجی زندگی کے خواب جو وہ شادی سے پہلے دیکھا کرتی تھی شادی کے پانچ چھ مہینے بعد ہی کافور ہوگئے۔ سروجنی کے رویہ میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہوگیا، گر وقت کا تقاضا ہی یہ تھا۔ اب وہ بات بات پر نریندر کو جھڑکتی۔ مگر نریندر اُس کی خفگی کا جواب ایک ہلکی سی مُسکراہٹ سے دیتا۔ سروجنی اُس کی مُسکراہٹ کو نہ سمجھ سکتی۔ اِسی لئے وہ نریندر کی اس حرکت پر اور برہم ہو جاتی۔

ایک روز نریندر تین دن کے بعد واپس آیا، بجائے اس کے کہ اطمینان سے وہ کچھ دیر سروجنی کے پاس بیٹھے، دو دو باتیں کرکے اپنے کمرے میں جہاں تصویریں رکھی تھیں جانے لگا۔ سروجنی خلافِ معمول نہایت محبت آمیز الفاظ میں بولی۔

"نریندر! میں جانتی ہوں کہ تمھیں اپنا آرٹ بہت عزیز ہے، مگر تم اپنی سروجنی کو کیوں بھول گئے ہو"

"کیسی باتیں کرتی ہو سروج!" نریندر نے اتنا کہا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔

سروجنی چاہتی تھی کہ کسی طرح اُسے نریندر سے پُورا پُورا چھٹکارا مل جائے، مگر پھر یکایک یہ

خیال کہ وہ ایک ہندو عورت ہے اُس کی تمام تمناؤں پر پانی پھیر دیتا، اُسے اپنی دلکش جوانی کا احساس تھا وہ اپنے حسن کی رعنائیوں کو گھنٹوں آئینہ میں دیکھا کرتی، مگر جب نریندر کی بے التفاتیوں کو دیکھتی تو گمان ہوتا کہ وہ اپنی تمام رعنائیاں اور دلکشیاں کھو بیٹھی ہے. مگر اُس کا شیشۂ دل جو جوانی کی شراب سے لبریز تھا اس خیال کی تردید کرتا. اس کے کانوں میں ایک صدا گونجتی کہ سروجنی تو بہت حسین ہے نریندر ہی میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ تیرے حسن کی دل فریبیوں سے لطف اُٹھا سکے. وہ سوچتی کہ نریندر مایۂ ناز مصور ہے، ہوا کرے، مگر اُس کی مصوری کے پیچھے میں اپنی زندگی کیوں ناخوشگوار بنا لوں، وہ سمجھتی کہ اُس کے اور نریندر کے درمیان مصوری حائل ہے. اُسے نریندر کی مصوری سے رقابت سی ہو گئی. آخرکار اُس نے نریندر کی تمام تصویروں کو جلا کر اپنے دل کا بخار نکالا. نریندر تصویروں کی جلی ہوئی راکھ دیکھ کر دم بخود رہ گیا، اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں.

"سروج! یہ تم نے کیا کیا؟" اِن چند لفظوں کے سوا نریندر نے کچھ نہ کہا.

نریندر بازار سے واپس آ رہا تھا اُس کے ہاتھ میں کاغذ اور ایک رنگ کا ڈبہ تھا، جیسے جیسے گھر قریب آتا جاتا تھا، اُس کی رفتار میں کمی ہوتی جاتی، اُسے خیال آتا کہ سروجنی کاغذ اور رنگ کا ڈبہ دیکھ کر آگ بگولا ہو جائے گی. مگر پھر خیال آتا کہ وہ تو روز ہی چراغ پا ہوتی ہے کوئی نئی بات تو نہیں. گھر میں قدم رکھتے ہی اُس نے آواز دی "سروجنی! سروجنی!!" مگر خلافِ معمول کوئی جواب نہ ملا، اُس کا دل دھڑکنے لگا اِسی درمیان میں اُس کی نگاہ ایک لفافہ پر پڑی، کھول کر پڑھا لکھا تھا:۔

"پران ناتھ!

میں جا رہی ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، آپ نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی، مگر آپ محبت کی تشنگی نہ بجھا سکے."

آپ کی سروجنی

نریندر جب خط پڑھ چکا تو اُس نے رنگ کا ڈبہ دُور پھینک دیا، زمانۂ ماضی کا تمام نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا ——— وہ دولہا بنا کھڑا ہے، سروجنی چمکتے ہوئے رنگین کپڑے پہنے نگاہیں نیچی کئے اُس کے سامنے کھڑی ہے، اُسے یاد آیا کہ میں نے سروجنی کی خاطر مکان کو سجا کر دلہن بنا دیا تھا، آمدنی تھوڑی تھی مگر مجھے سروجنی کی آسائش کا بہت خیال تھا، روپیہ کمانے کے لئے میں زیادہ تعداد میں تصویریں بنانے لگا. لوگ کہتے تھے "نریندر! تمھاری تصویروں کا معیار بہت گرتا جا رہا ہے." تو قدرے مایوسی ہوتی تھی، مگر جب بہت سے روپیے ملتے تو اس خیال سے مسرور ہو جاتا تھا کہ سروجنی کے لئے سامانِ آسائش زیادہ فراہم

ہو سکے گا۔ پھر بھی سروجنی ناخوش ہو کر چلی گئی۔ کیا یہ سب محبت کا کرشمہ نہ تھا۔

سروجنی نرینڈر سے روٹھ کر میکے چلی آئی، رفتہ رفتہ پشیمانی کا جذبہ اُس پر غالب آنے لگا طبیعت کی جولانی کے علاوہ جب ذرا فہم وادراک نے اپنا نقشہ جمایا تو اُس نے محسوس کیا کہ نرینڈر کو اُس سے محبت نہ بھی پھر بھی اُس کو نرینڈر کی خدمت کرنی چاہیئے تھی، وہ اُس کے پتی تھے۔ کیا اپنے پتی کے لئے وہ ذرا سی قربانی بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہ سُن کر کہ نرینڈر ایک مہینہ سے سخت بیمار ہے وہ بیتاب ہو گئی اور سامانِ سفر تیار کرنے لگی ماں باپ کہتے رہے کہ جب وہ تیرا خیال نہیں کرتا تو پھر تو کیوں اُس کے پاس جا رہی ہے۔ سروجنی نے اس کا جواب یوں دیا "پتا جی! میں اب اُن فرائض سے سبکدوش ہونے جا رہی ہوں جو ایک ہندو استری پر عائد ہوتے ہیں۔"

بڑے بڑے ارمان لئے وہ اپنے پتی کے گھر میں داخل ہوئی۔ مگر اُس کے پہونچنے سے قبل بیچارہ نرینڈر اِس دنیا کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ سروجنی نرینڈر کی موت کی خبر سُن کر پریشان تو ہوئی مگر آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ گرا۔ اس خیال نے کہ نرینڈر نے اُس سے کبھی پریم نہیں کیا اُس کے آنسو بند کر دیئے۔

سروجنی کو خیال آیا کہ اس عرصہ میں نرینڈر نے بہت سی تصویریں بنا ڈالی ہونگی۔ بڑی بیتابی سے وہ نرینڈر کے کمرہ میں داخل ہوئی—— مگر وہاں کوئی تصویر نہ تھی۔ اُس نے الماری کھولی۔ الماری میں ایک رنگ کا کھُلا ہوا ڈبہ رکھا ہوا تھا، اور ایک لپٹا ہوا کاغذ!

سروجنی نے کاغذ کھولا—— وہ ایک تصویر تھی۔ نرینڈر کا بہترین اور آخری شاہکار—— تصویر دیکھکر سروجنی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!!

سروجنی کو اب احساس ہوا کہ نرینڈر کو اُس سے بہت محبت تھی، کیونکہ وہ تصویر سروجنی ہی کی تصویر تھی اور نامکمل!!!

باقیاتِ فانیؔ

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے —— دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں —— اِک بے قرار تڑپا، اِک بے قرار رویا

جب ترا ذکر آ گیا ہم دفعتاً چُپ ہو گئے —— وہ چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کر دیا

رہی اِک عمر فانی نزع کے عالم میں گزری ہے —— محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

موت اُن کا مُنہ ہی تکتی رہ گئی —— جو تری فرقت کے صدمے سہہ گئے

(مرسلہ [illegible])

مفلسی کا شکار

ایک نوجوان طالب علم کا افسانہ

(از حضرت نشور واحدی)

باشندہ مرے شہر کا اک دوست تھا میرا
ہموار جبیں، آنکھ بڑی، جسم چھریرا

اخلاق میں پاکیزہ طبیعت میں لطافت
ہر بات سے جیسے کہ ٹپکتی تھی ذہانت

کالج میں وہ پٹنہ کے تھا تعلیم میں مشغول
ماں باپ کے گلزارِ تمنا میں کھلا پھول

والد بھی تھے اس کے اِسی اطراف میں نوکر
اور چاہتے تھے جیسے اسے جان سے بڑھکر

جب دوسرے سال "الیف۔ اے" میں اس کا قدم آیا
ناگاہ وبا آئی گیا باپ کا سایا

ماں صورتِ مغموم تھی، معصوم تھے بھائی
دیتی نہیں تھی شکل گزارے کی دکھائی

اور اُس پہ ستم خرچ تھا کالج کا مسلسل
تھی فیس کی فکر آج، کتابوں کا الم کل

"پیسہ ہے تو تعلیم ہے غربت میں کہاں ہے
محسوس ہوا اس کو کہ تعلیم گراں ہے

ہے شوق مگر ہاتھ میں رکھتا نہیں پیسے
تعلیم غریبوں کے لئے ہے نہیں جیسے"

مجبور ہوا، چھوڑ دی کالج کی پڑھائی
تھی فکر کہ ماں بیوہ ہے معصوم ہیں بھائی

روزی سے پریشان تھا تقدیر کا مارا
جینے کے لئے ایک تھا ٹیوشن کا سہارا

گو روح پہ افلاس کے آثار تھے طاری
تعلیم کا بھی سلسلۂ شوق تھا جاری

مرجی کے کسی طرح سے "الیف۔ اے" جو کیا پاس
"بی۔ اے" کے لئے روح میں بیتاب ہوئی آس

دو سال تک اور اُس نے مصیبت جو اُٹھائی
"بی۔ اے" بھی ہوا پاس تمنا یہ بر آئی

جب پاس ہوا "بی۔ اے" تو مادر ہوئی مسرور
شادی کے لئے ماں نے اُسے کر دیا مجبور

شادی سے ہوا خرچ جوفی العفور زیادہ
پھر فکرِ معاش اس کو ہوئی اور زیادہ

عمروں کا تقاضا تھا کہ ہو ہیٹ بھی اور سوٹ
نیرنگیٔ تقدیر سے ٹیوشن بھی گئے چھوٹ

مقدور نہیں تھا کہ زراعت بھی کرے وہ
سرمایہ نہیں تھا کہ تجارت بھی کرے وہ

درخواست اِک اسکول میں دی اُس نے پھر آخر
لیکن نہ ہوا اس سے نتیجہ کوئی ظاہر

ہر محکمہ ہر شہر میں درخواست اُڑائی
لیکن نہیں اُمید کی صورت نظر آئی

ہے خونِ اُمنگوں کا یہ افلاس بھی کمبخت
ارمان بھری زندگیاں ہوتی گئیں سخت

تعلیم کی نظروں میں ہے تہذیب بھی چھوٹی
تعلیم نہیں باندھنے دیتی ہے لنگوٹی

فکروں میں حواس اور بھی تھکنے لگے اُس کے
ہر سمت خیالات بھٹکنے لگے اُس کے

سوچا کہ اب اک راہ معیشت کی ہے چوری
لیکن میں کروں کیا کہ نہیں روح پہ چھوری

ڈاکہ جو میں ڈالوں تو غریبوں پہ ستم ہے
اور پھر مری فطرت کے لئے بارِ الم ہے

اور جا کے بغاوت کا جو گاتا ہوں ترانا
برباد ہوا جاتا ہے گھر اور گھرانا

عرصے تک اسی طرح پریشان رہا وہ
افکار میں ڈوبا تو خیالوں میں بہا وہ

کچھ روز میں ٹیوشن اُسے پھر مل گئے لیکن
غمگین تھی ہر رات المناک تھا ہر دن

تکلیف میں تھے بھائی تو افسوس میں مادر
بیوی کی جوانی پہ غم انگیز تھی چادر

صحت لگی اُس کی غمِ افکار سے گرنے
آنسو بھی لگے چشمِ گہربار سے گرنے

جو جسم کو لگتی وہ غذا تھی نہ میسّر
اِک دُکھ سے بھری زندگی افلاس کا چکّر

گرمی کا زمانہ تھا کہ کھانسی اُسے آئی
اور تھوک کے ہمراہ دیا خون دکھائی

چھوٹا سا مکاں، اور وہ گرمی کا زمانا
قیمت نہ دوا کی، نہ غذاؤں کا ٹھکانا

افلاس کو افسوسِ جوانی بھی نہیں تھا
لب خشک تھے اور برف کا پانی بھی نہیں تھا

موت آ گئی نزدیک، بڑھی خون کی کھانسی
وہ نزع کا عالم تھا کہ افلاس کی پھانسی

کیا عرض کروں اُس کی شبِ مرگ کا عالم
خوں تھوک رہا تھا کہ وہیں ٹوٹ گیا دم

اس لاشِ جواں مرگ پہ رو رو دیے دشمن
ماں بیٹھ گئی اور گری لاش پہ دُولھن

افلاس کی شمشیر تھی اور خون تھا تازہ
تھرّانے لگا عرش جب اُٹھا وہ جنازہ

سب ختم ہوئی دل کی اُمنگوں کی کہانی
اور قبر کی آغوش میں سوئی تھی جوانی

تنقید کتب

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

مضامین نہرو

کشمیر جنت نظیر زعفران زار ہی نہیں مردم خیز بھی ہے، نسیم۔ سرشار، آبر۔ در۔ سپرو۔ تھسکر چکبست نہرو وغیرہ کے ناموں سے کون ہندوستانی واقف نہیں۔ لیکن ان مفکرین میں سے ایسے افراد کی وہ تحریریں اور علمی کاوشیں اب تک خالص اُردو داں طبقہ تک نہیں پہونچی تھیں جو انگریزی زبان میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی جوانوں کے قائد اعظم پنڈت جواہرلال نہرو کی اکثر تحریروں سے ہماری پبلک اب تک پورے طور پر آشنا نہیں۔

جامعہ ملیہ دہلی نے ضرور "میری کہانی" شائع کرکے بہت حد تک اس کمی کو پورا کردیا تھا۔ پھر بھی سوانح حیات میں کسی ایک موضوع پر مصنف اپنے خیالات تفصیل و وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کا موقع نہ نکال سکتے تھے۔ یہ تو ان کی تاریخ عالم اور مختلف مضامین ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

خدا بھلا کرے پنڈت آنند نراین مُلّا کا کہ انھوں نے اس کمی کو محسوس کرکے پنڈت جی کے ان جواہر پاروں کو اُردو میں منتقل کرنے کا بار عظیم اپنے سر لیا۔ اور سچ پوچھیئے تو یہ کام انھیں کے کرنے کا تھا بھی۔ اس لئے کہ جس طرح سیاسی دنیا میں نہرو جی نئے ہندوستان کے مسلّم رہنما ہیں اُسی طرح مُلّا جی سرشار و آبرو چکبست کے صحیح جانشین اور ادب کے نئے رجحانات کے نبّاض اور ترجمان ہیں۔ لیکن ان کو جو ترجمے میں دشواریاں ہوئی ہیں وہ یوں بیان کرتے ہیں :۔

"محض میری بے بضاعتی ہی ترجمہ کی مشکلوں کی وجہ نہیں بلکہ ایک حد تک پنڈت جواہرلال نہرو کی طرز تحریر بھی اس کی ذمہ دار ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس کسی نے پنڈت جی کے تھوڑے سے بھی انگریزی مضامین پڑھے ہونگے اُس کے دل پر ان کی طرز نگارش کی تین خصوصیتیں ضرور نقش ہوگئی ہونگی۔ سب میں پہلی خصوصیت اُن کی ذہنی رفعت ہے، ہر چھوٹے سے چھوٹے سوال کو وہ ایک حکیمانہ انداز میں حل کرتے ہیں، اور اُسے جد و جہد انسانی کا پس منظر دے کر پیش کرتے ہیں۔ چونکہ انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہے اس لئے وہ زندگی اور سماج کے تمام مسائل کی پیچیدگیاں اور گہرائیاں اس خوبی اور آسانی سے بیان کرتے

---

[1] مطبوعہ انڈین پریس، الہ آباد۔ قیمت ۴؎

چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو تو اس کا حس نہیں ہوتا، لیکن ترجمہ کرنے والے کا دل جانتا ہے اور چونکہ اس میں اپنے مخاطب کے شکوک رفع کرنے ہوتے ہیں لہذا وہ قدم قدم پر دل و دماغ کا جائزہ لیتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ وہ خیال کی ان بلندیوں پر پہونچ جاتے ہیں جن کی ترجمانی کرتے وقت معمولی انسان کی زبان ڈگمگانے لگتی ہے۔ ان کی طرز نگارش کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ موضوع زیر بحث میں اپنے ذاتی تاثرات اس انداز سے شامل کر دیتے ہیں کہ ان کا ہر مضمون بجائے ایک خشک علمی مباحثہ کے ایک زندہ سوال بن کر سامنے آتا ہے اور پڑھنے والے کو مجبور کرتا ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی جواب دے ۔ . . .

تیسری خصوصیت جس کا در اصل تعلق اُن کی ذات سے ہے وہ اُن کی حیرت انگیز "بشریت" ہے ......

اس "بشریت" نے اُن کی طرز تحریر میں ایک عجیب و غریب شگفتگی اور شوخی پیدا کر دی ہے جسے جیل خانے کی اونچی دیواریں بھی دبا نہیں سکیں اور جس کی ترجمانی کرنا میرے ایسے ترجمہ کرنے والے کے بس کی بات نہیں"

ظاہر ہے کہ اس طرح کے بلند مرتبہ، رفیع خیال، ندرت پسند اور صاحب طرز انشا پرداز کے مضامین کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں۔ یہ پنڈت آنند نراین صاحب مُلّا ہی کا کام تھا کہ وہ اس ہفتخواں کو اس خوش اسلوبی سے طے کر سکے۔ اور ہم اسے بھی اُنھیں کی کامیابی سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے منزل تک پہونچنے کے لئے پروفیسر احتشام حسین کے سے ذی علم و باہمت ساتھی کا تعاون بھی حاصل کر لیا۔ ہم اپنے ان دونوں دوستوں کو اس خدمت ادب و علم پر صمیم قلب سے مبارکباد دیتے ہیں۔

اسی سلسلے میں ہم پنڈت جی کی اس " بالنس کی کھچی" پر بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے جو اُنھوں نے ان جواہر پاروں کی ابتدا میں تعارف کے طور پر لگائی ہے۔ یہ تعارف جس اچھوتے انداز میں لکھا گیا ہے اور اس میں جس عنوان سے پنڈت جواہر لال نہرو کی طرز نگارش کی توضیح کی گئی ہے وہ اُردو میں ایک نئی طرح کی نقد کی بنیاد ڈالتا ہے۔ اور اس لئے ہمارے ادب میں ایک مستقل اضافہ ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ مضامین نہرو کا یہ پہلا اُردو مجموعہ ہر اُردو دوست کی لائبریری میں جلد سے جلد جگہ پائیگا اور اسی احترام و عزت و مسرت کے ہاتھوں سے لیا جائیگا جس کا وہ ہر طرح مستحق ہے۔ اور علی حسین کاتب کی طرح ہمارا بھی تقاضا ہے کہ حضرت مترجم جلد سے جلد دوسرے حصہ کی بھی تکمیل فرمادیں۔

سُریلے بول[1]

محمد عظمت اللہ خاں بی اے، مرحوم اُردو میں جدید نظموں اور بحروں کے موجد اور بانی ہیں۔ علاوہ انگریزی اور فارسی پر عبور رکھنے کے وہ ہندی اور سنسکرت سے بھی آشنا تھے اور اُن کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو شاعری صرف

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ دی حیدرآباد بک ڈپو حیدرآباد دکن قیمت ۶/

عربی اور فارسی کی بحروں تک محدود نہ رہے بلکہ اس میں ہندی اور انگریزی کی بحریں بھی رائج کی جائیں۔ چنانچہ اس موضوع پر جو عالمانہ مضمون انھوں نے لکھا تھا وہ اس کتاب کے حصۂ نثر کا خاص جزو ہے۔ حصۂ نظم میں مرحوم کی تمام وہ نظمیں ہیں جو انھوں نے اپنے نظریہ کے تحت میں کہی تھیں۔

جہاں تک خان مرحوم کے نظریہ کا تعلق ہے ہم اُن کے ہمنوا ہیں کہ ہماری شاعری کو محض فارسی بحروں کے کوزے میں بند رکھنا مستحسن نہیں۔

"کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے"

لیکن جہاں تک اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے میں اور اُسے مقبول عام و خاص بنانے میں اپنی شاعری کو نئی بحروں تک محدود کرنے کا سوال ہے ہمارا ذوق خانِ مرحوم کی تائید سے معذور ہے۔ جن لوگوں کے کان ہماری طرح پُرانی بحروں اور ردیف و قافیہ کے ترنّم سے آشنا ہیں انھیں مصرعوں کا چھوٹا بڑا ہونا، یا ردیف و قافیہ سے بالکل آزاد ہونا کبھی نہیں بھاتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ پھر مغربی شاعری میں یہی بات کیوں نہیں کھٹکتی؟ تو ہم عرض کریں گے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ مغربی شاعری کا ہمارے اوپر ویسا دیرپا اور شدید اثر ہوتا ہی نہیں جیسا کہ خود اپنی زبان کی شاعری کا۔ دوسرے ہمیں اُردو شاعری بھی بالکل ویسی ہی معلوم ہونے لگتی ہے جیسا کہ اچھا خاصا کالا آدمی انگریزی ڈنر سوٹ میں! پھر ہمیں انگلستان کے مشہور ناقد و ادیب چیسٹرٹن کا یہ قول کبھی نہیں بھولتا کہ ہمارے اِن نئے شاعروں نے پُرانی پابندیوں کے توڑنے میں ایک نئی طرح کی پابندی اپنے اوپر عائد کرلی ہے، اور وہ یہی کہ اُن کے کلام میں خواہ شاعری کی موسیقیت اور موزونیت باقی رہے یا نہ رہے لیکن وہ پُرانی پابندیوں سے آزاد ضرور ہو! غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے سب سے زیادہ کامیاب تجدد پسند شاعر حضرت جوشؔ ملیح آبادی اِن پابندیوں سے اپنے کو آزاد نہ کرسکے، اور نہ علامۂ اقبال مرحوم نے ہی اپنے کو اس معاملے میں حقوقِ خاص کا مستحق سمجھا۔

عظمت اللہ خاں مرحوم کی شاعری میں بہت سی خوبیاں ہیں، اس کی زبان بہت ہی نرم و مناسب ہے، اس میں خاصی رفعت و بلندی ہے، اس میں ندرت اور کہیں کہیں کیف بھی ہے۔ لیکن وہ انگریزی سانچے میں ڈھال دی گئی ہے اور وہ ہمیں کچھ اسی طرح عجیب معلوم ہوتی ہے جس طرح کوئی ستار اور سارنگی پر "چوپن" کے گانے یا انگریزی بینڈ کے ساتھ "میاں کی ٹوڑی" سنائے۔ پھر بھی جہاں کہیں انھوں نے ہندوستانی چیزوں کو ہندی بحروں میں نظم کیا ہے، وہ جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔ مثال کے طور پر اُن کی "برکھا رُت" کے چند بند ملاحظہ فرمائیے:۔

بجلی چمکی انگارا سی آگ کی ناگن لہرائی لہریا کاڑھا بیل بنائی

بھاپ کے دریا میں قدرت نے نور کی مچھلی تیرائی　　اِدھر اُدھر تڑپی تڑپائی

بجلی چمکے بادل گرجے مینھ اور پون دھواں دھار　　زور کا پانی وہ دھائیں دھائیں
بجلی ناچے تھاپ گرج کی مینھ نے چھیڑ دیا ستار　　پون کا گانا وہ سائیں سائیں

دھیا دھیا مینھ بھی چھم چھم پون ملائم اتراتی　　اٹھکھیلیاں کرتی اتراتی
چکنے چکنے پتوں پر سے موتی سی بوندیں ڈھلکاتی　　کھیلتی آتی چھیڑتی جاتی

نیلا امبر ہنستا سورج رنگ میں ڈوبے ہوئے بادل　　کھلی پھننگوں پر ہلکی دھوپ
دھوئی نہائی بھوبھی سندر سر پہ سنہری سا آنچل　　قدرت کا ایک سُہانا روپ

کتابت وطباعت دیدہ زیب ہے اور کتاب لائبریریوں میں رکھنے کے لائق ہے۔ حصۂ نظم مطالعہ کے قابل ہے اور حصۂ نثر ہر طرح غور وتفکر سے پڑھے جانے کا مستحق۔

مُسافر کی ڈائری[1]

خواجہ احمد عباس صاحب سب ایڈیٹر بمبئی کرانیکل نے موجودہ جنگ کے کچھ ہی ماہ پہلے امریکہ میں منعقد ہونے والی "نوجوان کانفرنس" کی شرکت کی غرض سے ایک طویل سفر اختیار کیا، اور شنگھائی۔ ٹوکیو۔ ہالی ووڈ۔ نیو یارک۔ پیرس۔ لنڈن۔ وائنا۔ استنبول اور بغداد پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے میں جو کچھ دیکھا اُسے اس ڈائری کی صورت میں قلمبند کر لیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب ہر شئے کو ایک سیاسی نظریہ کے ماتحت دیکھنے کے عادی ہیں، اور وہ بہت کچھ وہی دیکھتے ہیں جس کے دیکھنے کا اور ایک خاص زاویہ سے دیکھنے کا وہ ارادہ کر چکے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اُن کا دل ہندوستان کی محبت سے لبریز ہے اور وہ دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ وہ بعض وقت اس طرح کی چبھتی باتیں کہہ دیتے ہیں جن سے ہمارے تھکے ہوئے دماغوں کو ٹھیس لگتی ہے اور ہم خلافِ عادت سوچنے اور غور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک چینی ہم سفر تاجر سے گفتگو کا حال یوں بیان کرتے ہیں:-

"شنگھائی میں اس کا ایک سگرٹوں کا کارخانہ تھا جو جاپانی ہوائی جہازوں کا شکار ہو گیا، کہنے لگا:-

"لاکھوں سگریٹ تھے، جاپانی ہوائی جہاز نے ایک بم چھوڑا، سب ایک ساتھ ہی جلنے لگے!"

اور یہ کہہ کر خوب ہنسا! یہ ہے وہ اسپرٹ جس کے مقابلے میں جاپان کی توپیں بیکار ہیں!"

اِسی ملک چین میں کیسا بین المذاہب اتحاد واتفاق ہے، اُسے سُنیئے:-

"میرے ایک چینی دوست نے بتایا کہ وہ عیسائی ہے۔ اُس کا باپ بدھ مذہب کا پیرو۔ اس کا

---

[1] مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی　قیمت ایک روپیہ ۱۲؍

جاتی لا مذہب اور اُس کی عیسائی بہن نے ایک مسلمان سے شادی کی ہے۔ باوجود اس کے وہ
سب ساتھ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں، اور ساتھ کھاتے پیتے ہیں.... "
جاپان کی جارحانہ سامراجی اسپرٹ کے مذموم نتائج دیکھتے ہوئے جب خواجہ صاحب امریکہ پہونچے تو
اِن ڈالر کے پرستاروں میں ہندوستان سے بے خبری کا عجب عالم پایا۔ ایک امریکی بچّے نے سوال کیا:
"کیا تم مہاراجہ ہو؟"
"نہیں!"
"پھر کیا تم سوامی ہو؟"
"نہیں، میں تو اخبار نویس ہوں"
"اچھا تو تمھارے ملک میں اخبار بھی ہوتے ہیں؟"
....
"اور تمھاری کتنی بیویاں ہیں؟"
"ایک بھی نہیں، ابھی شادی ہی نہیں ہوئی"
"عجیب بات ہے، میں تو سمجھتا تھا کہ بارہ برس کی عمر میں سب ہندوستانیوں کی شادی ہو جاتی ہے،
اور اُن کی سات سات بیویاں ہوتی ہیں۔"
سرمایہ داروں کی اس عظیم الشان سلطنت کی صحیح اسپرٹ مصنف نے چند جملوں میں یوں پیش کی ہے:-
"اِس اشتہار بازی کے مرکز میں نہ صرف سینما اور تھیٹر اور صابون اور سگریٹ کے اشتہار دیکھے، بلکہ
قبرستانوں اور گورکنوں کے بھی اشتہار دیکھے "ہمارے پُر بہار اور پُر فضا قبرستان میں اپنے عزیزوں
کو دفن کیجئے۔"
امریکہ سے جہاز کے ذریعہ خواجہ صاحب پیرس آئے۔ فیشن اور ڈالر لان کے اس شہر میں جو کچھ ہمارے
مسافر نے دیکھا اُس کی تفصیل تو آپ کو کتاب میں ملے گی، لیکن مصنف نے دو جملوں میں پوری فرانسیسی
ذہنیت بہت ہی لطف سے بیان کر دی ہے:-
"شراب کھانے کے ساتھ مفت ملتی ہے مگر پانی مشکل سے ملتا ہے اور اکثر اُسکی قیمت دینا پڑتی ہے"
"ننگا ناچ دیکھنا یا سڑک پر بیٹھکر شراب پینا عیب نہیں سمجھا جاتا مگر اتوار کو گرجا نہ جانا گناہ ہے۔"
اب لندن کی باری آئی، وہاں "چند ہی روز کے بعد اپنی کھال کے رنگ کا احساس شروع ہو گیا۔"
اِس لئے حاکموں کے اِس دار السلطنت سے جلد ہی روانہ ہو کر تیز گام مسافر نے بیس دن میں سات ملک لپیٹ دیئے

ظاہر ہے کہ اِس رو اروی میں کیا دیکھا ہوگا لیکن پھر بھی ہر ملک کے حال میں ہندوستان کے لئے خواجہ صاحب نے ایک خاص سبق کا مسالہ فراہم کردیا ہے۔

اور جب اس طرح دنیا کی خاک چھان کر تھکا ماندہ مسافر اپنے محبوب وطن کی بندگاہ پر اُترا تو "پولیس والوں نے پاسپورٹ کا معائنہ کیا، اسباب کی تلاشی لی، بہت سے سوال کئے۔

"نام؟ باپ کا نام؟ پیشہ؟ کس غرض سے سفر کیا؟ کراچی میں تقریر تو نہیں کروگے؟ ......

اب کیا شبہ ہے کہ میں ہندوستان واپس پہونچ گیا!"

خواجہ صاحب کا انداز بیان بہت ہی محاکاتی ہے، ہر واقعہ اور ہر جگہ کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ قلم رواں ہے، اور زبان سلیس۔ طرز نگارش میں ایک ہلکا سا طنز بھی موجود ہے۔ غرض کتاب ہر طرح پڑھنے کے لائق ہے۔ کتابت و طباعت غالباً عجلت میں ہوئی ہے، اس لئے کہ جابجا سے حروف اُڑگئے ہیں، اُمید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں طباعت کی خامیاں بھی جاتی رہیں گی۔ اور یہ "ڈائری" اُردو کے سفرناموں کی صف اول میں جگہ پائے گی۔ ع۔ ع۔ ح

اِطلاع ضروری

جن صاحبان کی خریداری جنوری نمبر سے شروع ہوتی ہے اُن کا حساب اس نمبر سے ختم ہوگیا، اور اب آئندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہوگئی ہے۔ اس لئے ان سب صاحبان سے درخواست کی جاتی ہے کہ براہ کرم اس نمبر کے پہونچنے کے دس دن کے اندر "زمانہ" کا آئندہ سالانہ چندہ مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں ورنہ حسب دستور جنوری ۱۹۴۲ء کا پرچہ سالانہ قیمت کے لئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (V.P.P.) ارسال ہوگا اور اس صورت میں پانچ آنے زیادہ خرچ ہونگے۔

(۱) جن صاحبان کا حساب جولائی یا دوران سال کے کسی دوسرے مہینے سے شروع ہوتا ہے مگر کسی وجہ سے اُن کی قیمت وصول ہونے سے باقی رہ گئی ہے، وہ بھی براہ عنایت جلد سے جلد رقم واجب الوصول بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں، ورنہ اُن کی خدمت میں بھی جنوری ۱۹۴۲ء کا پرچہ سالانہ چندہ کے لئے وصول طلب پیکٹ (V.P.P.) سے روانہ ہوگا۔

نوٹ:۔ اگر کسی صاحب کو آئندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو تو وہ براہ کرم اس نمبر کے پہونچنے کے بعد فوراً ہی دفتر کو اطلاع دیدیں تاکہ اُن کی خدمت میں جنوری ۱۹۴۲ء کا رسالہ نہ بھیجا جائے، اور وہ قیمت طلب پیکٹ کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر ٹکٹ ڈاک کے نقصان سے محفوظ رہے۔ (باقی دار اصحاب جو آئندہ خریداری جاری نہ رکھنا چاہتے ہوں براہ خوش معاملگی اپنے ذمہ کی بقایا ادا فرماکر اپنے عندیہ سے مطلع فرمائیں۔

نوٹ:۔ منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب کوپن منی آرڈر پر اپنا پورا نام وپتہ مع نمبر خریداری صاف وخوشخط تحریر فرمائیں تاکہ رقم مرسلہ صحت کے ساتھ درج حساب ہوسکے۔

منیجر "زمانہ" کانپور

رفتارِ زمانہ

امریکہ اور برطانیہ کے خلاف جاپان کے اعلان جنگ کی وجہ سے موجودہ لڑائی نے حقیقتاً عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کرلی ہے چنانچہ روس، افریقہ اور بحر اطلانتک کے علاوہ بحرالکاہل کا وسیع دامن بھی ایک زبردست میدان جنگ بن گیا ہے۔ ۸ دسمبر کو باضابطہ اعلان جنگ کے بغیر جاپانیوں نے مختلف مقامات پر اچانک حملے کرکے ابتدائی کامیابیاں حاصل کرلی ہیں

ہند چینی میں تو جاپان عرصہ سے اپنی فوجیں جمع کررہا تھا اس لئے ۸ دسمبر کو علی الصبح تقریباً دو بجے جاپانی فوج سرحد عبور کرکے سیام میں داخل ہوگئی سیامی سپاہیوں نے پہلے تو کچھ گھنٹے مقابلہ کیا لیکن سات بجے صبح تک اُنھوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور جاپان کو سیام کے علاقہ سے اپنی فوجیں لانے اور لیجانے کا اختیار دیدیا۔ اس کے بعد سیام اور جاپان میں ایک تازہ معاہدہ ہوگیا جس کے رو سے سیام جاپان کو اتحادیوں کے خلاف سیاسی فوجی اور اقتصادی ہر طرح کی مدد دیگا اور جاپان اور سیام ایک دوسرے سے صلاح و مشورہ کئے بغیر اتحادیوں سے کوئی صلح نہ کریں گے۔ یہ معاہدہ دس سال کے لئے ہوا ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ اب سیام مستقل اور قطعی طور پر جاپان کا ماتحت ہوگیا ہے۔ سیام کا قدیم ہندو تہذیب سے بہت کچھ تعلق ہے اس لئے ہندوستانیوں کو سیام کی آزادی سلب ہوجانے کا دلی افسوس ہے لیکن اس سے قطع نظر ہندوستان کی حفاظت کا مسئلہ بھی سیام کے رویّہ سے بہت زیادہ پیچیدہ ہوگیا ہے۔

جاپان نے امریکہ کے ساتھ بھی دغا کی، اُس نے مصالحت کی گفتگو کرنے کے لئے اپنے خاص سفیر امریکہ روانہ کئے تھے اور ابھی امریکن اور جاپانی نمایندوں کے درمیان واشنگٹن میں گفت و شنید جاری ہی تھی کہ جاپان نے بلا کسی اعلان یا اطلاع کے امریکہ کے جزائر ہوائی، گوام، ویک، مڈوے اور فلیپائن پر اچانک حملے کردیئے۔ چونکہ امریکہ ان حملوں کے لئے تیار نہ تھا اس لئے اسے ان حملوں میں بہت کچھ نقصان اُٹھانا پڑا مثلاً مجمع الجزائر ہوائی کے مقام پرل ہاربر پر جو بحرالکاہل میں امریکہ کا سب سے بڑا بحری مستقر تھا جاپانیوں نے ہوائی اور بحری حملے کرکے امریکہ کے چھ جنگی جہاز تین تباہ کن جہاز اور ایک سرنگیں بچھانے والا جہاز غرق کردیا۔ پرل ہاربر کے حملہ میں تقریباً تین چار ہزار امریکن بھی کام آگئے۔ جاپانیوں کی بھی تین آبدوز کشتیاں اور اکتالیس ہوائی جہاز ضائع ہوئے۔ مگر جاپانیوں نے صرف بحری اور ہوائی حملوں پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اُنھوں نے بعض جزیروں میں اپنی فوجیں اتار کر قبضہ کرلیا ہے۔ مثلاً جزائر گوام۔ ویک اور مڈوے پر بھی اس وقت جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ فلیپائن کے سب سے بڑے جزیرہ لیوزان میں جہاں منیلا واقع ہے جاپانیوں نے فوجیں اتاردی ہیں اور لگاسپی، ویگان اور اپاری میں بھی قبضہ کرلیا ہے اکثر مقامات میں سخت لڑائی ہورہی ہے۔ فلیپائن کے دوسرے بڑے جزیرہ منڈاناؤ میں بھی جاپانی فوجیں اتر گئی ہیں اور جزیرہ کی راجدھانی ڈیواؤ میں گھمسان کی لڑائی ہورہی ہے جزیرہ ساراواک کے ہوائی اڈہ پر بھی حملے کرکے نقصان پہونچایا گیا ہے۔ فلیپائن کے متعلق آخری اطلاع یہ ہے کہ تقریباً ایک لاکھ جاپانی فوج وہاں پہونچ گئی ہے۔ ان اچانک اور اندھا دھند حملوں کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کی بحری قوت کو فوری ضرب لگا کر اس کے بحری راستے کاٹ دیئے جائیں اور جزائر فلیپائن یا ہانگ کانگ میں امریکن جہاز نہ پہونچ سکیں۔ اس وقت جاپان کو بڑی حد تک مزید کامیابی حاصل ہوگئی ہے لیکن امریکہ کے

وسیع ذرائع بالآخر اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتے اس لئے جاپان کی ابتدائی کامیابیوں سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔

برطانوی جزائر جاپان نے ہانگ کانگ اور سنگاپور پر بھی اچانک حملے کئے ہیں۔ ہانگ کانگ میں تو شروع تک بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر ۲۵ دسمبر کو انگریزی فوجوں کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ہانگ کانگ کے سامنے کولون کو بھی جاپانیوں نے لے لیا ہے ہانگ کانگ پر جاپانی حملہ کا بھی یہی مقصد ہے کہ جزائر جاپان اتحادیوں کے بحری حملے سے محفوظ ہو جائیں۔ جاپان خاص پر اتحادیوں کا بحری حملہ ہانگ کانگ کے راستے سے ہو سکتا ہے۔ ہانگ کانگ پر قبضہ حاصل ہونے سے جاپان کو ایک اور فائدہ یہ پہونچ سکتا ہے کہ جاپان سے ہند چینی و سیام تک کا بحری راستہ صاف ہو جائے گا۔ اور بحرالکاہل کی سمت سے چین کو جنگی سامان بھی بھیجا نہ جا سکے گا۔

چونکہ شرق الہند کے جزائر اتحادیوں کے ساتھ ہیں اس لئے انکے ہوائی جہاز اور آبدوز کشتیاں بھی جاپانیوں کے خلاف کام کر رہی ہیں مگر جاپانیوں نے ابھی تک صرف بورنیو، طراکیہ اور ڈچ گنی کی طرف توجہ کی ہے یعنی جزیرۂ طراکیہ میں جو بورنیو اور ملایا کے درمیان واقع ہے جاپانی ہوائی جہازوں نے صرف نہتے اور بے پناہ لوگوں پر بمباری کی ہے۔ ابھی تک سماٹرا اور جاوا پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا ہے۔

مگر نئے میدان جنگ کے اہم ترین معرکے ملایا اور اس کے نواحی سمندروں میں ہو رہے ہیں۔ جاپانیوں نے خلیج سیام کی راہ سے اپنی فوجیں جہازوں میں لا کر ملایا کے مشرقی ساحل پر کوٹہ بھرو اور سانگورہ میں اتاری ہیں جہاں برطانیہ کے ہوائی اڈے تھے، برطانوی بیڑہ نے سنگاپور سے جاپان کے فوج بردار جہازوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی اور کئی جہاز ڈبو بھی دیئے لیکن اس کوشش میں خود برطانیہ کو بھی سخت نقصان اٹھانا پڑا اور دو بڑے جنگی جہاز پرنس آف ویلز اور ریپلس غرق ہو گئے۔ پرنس آف ویلز برطانیہ کا جدید ترین جنگی جہاز تھا جس کا وزن ۳۵ پینتیس ہزار ٹن تھا اور یہ سولہ ۱۶ انچ موٹی فولادی چادروں کا بنا ہوا تھا۔ چودہ ہزار ٹن کی زرہ پہنے تھا۔ ریپلس (Repulse) اگرچہ پرانا جنگی جہاز تھا لیکن اس کا وزن بھی ۳۲ بتیس ہزار ٹن تھا۔ جاپانی ہوائی جہازوں نے ان دونوں جہازوں پر سخت بمباری کی اور ہوائی تارپیڈو مارے جو نشانہ پر پڑ گئے اور یہ دونوں جہاز ڈوب گئے۔ اس طرح جنگ مشرق کے ابتدائی دور میں امریکہ و برطانیہ دونوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا جس سے اُن کی مدافعتی کارروائیوں میں غیر معمولی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ ان مشکلات سے دشمن کو یقینی نفع پہونچا ہے اور شاید ابھی کچھ دنوں تک اور بھی نفع پہونچے۔ لیکن جلد یا دیر میں اور خدا چاہے گا تو دو ہی چار ماہ میں پوزیشن درست ہو جائے گی، اور بقول فیلڈ مارشل اسمٹس آئندہ سال کے خاتمے سے پہلے ہی جاپان کو اپنی تباہی معلوم ہو جائے گی۔ اس وقت تو جاپانیوں نے اپنی فوجیں سانگورا اور کوتہ بھرو میں بھی اتار دی ہیں اور کثرت تعداد اور ہوائی فوقیت کی وجہ سے انھیں کامیابی پر کامیابی حاصل ہو رہی ہے اسی کی بدولت وہ اس وقت شمالی ملایا میں چھا گئے ہیں اور برما کے انتہائی جنوبی حصہ میں داخل ہو کر وکٹوریہ پوائنٹ کے برطانوی مستقر پر بھی انھوں نے قبضہ کر لیا ہے انگریزی فوج کو جزیرہ پنانگ کو بھی جو بحر ہند کے مشرقی ساحل پر ایک مشہور جزیرہ ہے خالی کرنا پڑا۔ ان دونوں مقامات پر جاپانی قبضہ ہو جانے سے ہندوستان اور برما پر ہوائی حملوں کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اس وقت تک رنگون پر دو ہوائی حملے ہو چکے ہیں۔ کلکتہ و مدراس و بمبئی وغیرہ بھی

ہوائی حملوں سے محفوظ نہیں رہے اور گو صاحب کمانڈران چیف آف انڈیا نے اطمینان دلایا ہے کہ فی الحال ہندوستان میں کسی قسم کے حملہ کا خوف نہیں ہے۔ مگر بنگال اور آسام کے صوبے "ایمرجنسی رقبے" قرار دیدیئے گئے ہیں اور کلکتہ خالی ہونا شروع ہو گیا ہے جس سے تمام ملک میں ایک طرح کی بے چینی پھیل رہی ہے۔ مگر برطانیہ، امریکہ اور چین کے مقابلہ میں کیا باعتبار آبادی اور کیا بلحاظ ذرائع اور مالی حالت جاپان کا پلہ بہت ہلکا ہے، اُسے آخر میں اتحادیوں کے ہاتھوں ذک ہی اُٹھانا پڑے گی۔ اس وقت جاپان کے جنگ میں شامل ہونے سے جرمنی کو ضرور کچھ دنوں کے لئے ایک چھوٹا سا سہارا مل گیا ہے مگر تمام آثار سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ آئندہ ۱۹۴۲ء کا سال سخت آزمائش کا سال ہوگا لیکن اس کے خاتمے سے پہلے ہی اتحادیوں کا رنگ جمنے لگے گا اور ۱۹۴۳ء میں وہ یقیناً محوری طاقتوں کو زیر کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اٹلی کا تو دیوالہ نکل ہی چکا ہے، حبش کا ملک آزاد ہو چکا ہے اور لیبیا میں اطالوی حکومت کا خاتمہ قریب ہے۔ جرمنی کو بھی روس میں سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس لئے اگر جاپان اس وقت جنگ میں شامل ہو کر یہ ابتدائی کامیابیاں نہ حاصل کر لیتا تو محوری طاقتوں کے لئے آئندہ جنگ جاری رکھنا سخت دشوار ہو جاتا لیکن جاپان کے ساتھ دینے سے ہٹلر کو اس وقت روسی محاذ اور برطانیہ کے خلاف اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کا اچھا موقع مل گیا ہے اس لئے آج کل جرمنی کا ہندوستانی پروپیگنڈا ہر روز برلن سے جاپانی فتوحات کے گُن گا رہا ہے۔ ان فتوحات کا سلسلہ ابھی کچھ عرصہ تک اور جاری رہیگا لیکن جیسے ہی امریکہ اور انگلستان کی مشترکہ طاقت عملی حیثیت سے اپنا زور دکھاسگی ویسے ہی جنگ کا پانسہ پلٹ جائے گا اور جاپان کو لینے کے دینے پڑیں گے۔ دونوں ملکوں کی مشترکہ کوششوں کو یکجا کرنے کے لئے خود مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ کرسمس کے پہلے امریکہ گئے۔ وہاں پریسیڈنٹ روزویلٹ سے مفصل بات چیت کے بعد انگلستان اور امریکہ کا باہمی معاہدہ ہو گیا ہے جس کا اثر عنقریب ہی دیکھنے میں آئے گا۔

ہٹلر نے چند ہی ہفتوں میں روس کا کام تمام کر دینے کا تہیہ کیا تھا لیکن سُرخ فوجوں کی پامردی سے چھکے چھوٹ گئے۔ ابھی تک ماسکو ہی پر جرمنی کا قبضہ ہو سکا اور نہ لینن گراڈ ہی پر جرمن فوج کو کوئی اقتدار حاصل ہوا۔ سباسٹاپول کا بندرگاہ بھی ابھی تک روسیوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ حال میں ہٹلر نے دو بڑی تقریریں کیں جن میں سے ایک میں تو اُس نے روس اور جرمنی کے جنگی نقصانات کی تفصیل بتائی۔ دوسری تقریر جرمن سپاہیوں کے نام تھی جو اُس نے فوجی کمان خود اپنے ہاتھ میں لینے کے موقع پر کی۔ ان دونوں تقریروں سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ہٹلر کو اپنے منصوبے جلد پُورے ہونے کی کوئی اُمید باقی نہیں ہے اور ڈاکٹر گوبلز بھی اب یہ کہنے لگے ہیں کہ برطانیہ اور امریکہ پر فتح حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہٹلر تو اب اپنے نئے نظام پر زور دینے کے بجائے جرمنی کی آزادی قائم رکھنے اور اُس کو آئندہ مصیبتوں سے بچانے کا ذکر کرنے لگا ہے۔ روسیوں نے جرمن نقصانات کی جو تفصیل شائع کی ہے اُس سے اور جرمنی اعداد و شمار سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لیکن بیرونی لوگوں کا اندازہ ہے کہ معرکۂ روس میں جرمنی اور اُس کے اتحادیوں کے کم سے کم بتیس لاکھ آدمی ضرور کام آئے یا بیکار ہو گئے۔ اس وقت روس میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے جس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے روسیوں نے اپنے بہت سے مقامات جرمن فوج سے لڑ بھڑ کر واپس لے لئے ہیں۔ جرمنوں کا بیان ہے کہ وہ اس وقت اپنے محاذ کو خود ہی مختصر کر رہے ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو اس وقت دو باتیں لازمی ہیں، اوّل یہ کہ اتنے دنوں کی سخت ہولناک جنگ کے بعد بھی روسی قوم اور

روسی فوج کا دم خم ابھی تک بجنسہ قائم ہے اور وہ کسی طرح جرمنی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ روس اور جرمنی کے درمیان جنگ قائم رہنے سے کم سے کم تیس چالیس لاکھ جرمن فوج روس میں ضرور پھنسی رہیگی، یہ خود ایسا زبردست پھنساؤ ہے جس سے جرمنی کا صحیح و سلامت نکل آنا معجزے سے کم نہ ہوگا۔ روس نے بیشک جرمنی کا نہایت بہادرانہ مقابلہ کیا اور روس کی یہ بات بھی بہت قابلِ تعریف رہی کہ دوسرے یورپین ملکوں کی طرح روس کے کسی شخص کو ملک کے ساتھ غداری کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ لیکن ابھی تک یہ معمہ حل نہیں ہوسکا ہے کہ ہٹلر نے علاقہ اُوکرائین پر فوجی قبضہ کرنے کے بعد راسٹو (Rostov) کو کیوں نہیں لے لیا۔ بہرحال روسی اس وقت سنبھالا لے رہے ہیں اور اُمید ہے کہ اگر اتحادیوں کی مدد ان کے شاملِ حال رہی اور روس کو جس قدر فولادی گاڑیاں اور دوسرا سامانِ جنگ درکار ہے وہ اس کو امریکہ اور انگلستان سے مل سکا تو عجب نہ جانیئے کہ روسیوں کا یہ دعویٰ کہ وہ جرمنوں کو روس ہی میں دفن کردیں پورا ہوکر رہے

یہ خبر بھی گرم ہے اور قرائن سے بھی خیال ہوتا ہے کہ ہٹلر اپنی جنگی ساکھ قائم رکھنے کے لیے حتی الامکان جلد ہی کوئی خاص کارروائی کرنے والا ہے۔ یہ کارروائی یا تو خود برطانیہ پر حملہ ہو یا اسپین کو جنگ میں شامل کرکے جبرالٹر پر ضرب کاری لگایا جائے، یا ترکی پر حملہ کرکے ایران و عراق وغیرہ کی خبر لی جائے۔ اتنی دُور بیٹھے ہوئے ہم خود کیا کہہ سکتے ہیں، لیکن گو برطانیہ کے ذمہ دار وزیروں نے پارلیمنٹ میں حملے کا ذکر اور مسٹر چرچل نے بھی امریکہ میں اسی خوف کا اظہار کیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ برطانیہ پر حملہ نہ ہوگا کیونکہ برطانیہ اس کے مقابلے کے لئے پورے طور پر تیار ہے اور جرمنوں کو سخت ناکامی کا منھ دیکھنا پڑے گا جس سے جرمنوں کا سارا غرور کرکرا ہوجائیگا۔ اس لئے اُمید نہیں کہ ہٹلر اس طرف زور آزمائی کرے۔ البتہ اگر جرمنی کو پٹرول کی کمی محسوس ہو رہی ہے تو وہ ترکی پر حملہ کرکے ایران اور عراق کی جانب جھکے گا۔ ورنہ جبرالٹر پر حملہ کرکے برطانیہ کی بحری طاقت کو زک پہونچانے میں جاپان کا ہاتھ بٹائے گا۔ اس وقت یہی ایک ذریعہ برطانیہ کو پریشان کرنے کا رہ گیا ہے۔

لیبیا کے معرکہ میں برطانیہ کو مسلسل فتوحات حاصل ہو رہی ہیں۔ برطانوی فوج نے اپنے نئے کمانڈر کی رہنمائی میں "بن غازی" پر دوبارہ قبضہ کرلیا ہے اور ہزارہا جرمن اور اٹالین فوجی افسران اور سپاہی گرفتار ہوچکے ہیں۔ ادھر چھ ہفتوں سے اس صحرائی علاقہ میں انگریزی فوج کو دشمن کے سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے معرکوں میں سپلائی کی مشکلات کی بدولت انگریزی فوج کو ضروری ساز و سامان کی کمی رہتی تھی چنانچہ یونان۔ کریٹ۔ ہانگ کانگ وغیرہ سب جگہ ان کے پاس کافی ہوائی طاقت موجود نہ تھی مگر لیبیا کا موجودہ معرکہ مہینوں کی تیاری کے بعد شروع کیا گیا اور گو یہاں بھی انھیں خلاف توقع دشمن کے سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑا جسکی وجہ سے اُنکی کامیابی کی رفتار اتنی تیز نہیں رہی جتنی کہ امید کیجاتی تھی لیکن صحرائے لیبیا کی خونریز جنگ نے اس بات کو خوب ثابت کردیا ہے کہ اگر ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی کافی تعداد موجود ہو تو برطانوی فوج جرمنی فوج کا بخوبی مقابلہ کرسکتی ہے علاقہ سارینیکا میں دشمن کی ہر ساز و سامان سے آراستہ فوج کا شمار ڈیڑھ لاکھ بتایا جاتا ہے جسمیں کم سے کم ایک تہائی جرمنی سپاہ ہیں لیکن انگریزی فوج کو ان سب کے باوجود کامیابی پر کامیابی حاصل ہوئی اور اس وقت جنرل رومل کو جو جرمنی کا نامور سپہ سالار ہے اپنی سپاہ کی جان بچانا مشکل ہو رہا ہے۔ بہرحال اس وقت انگریزی فوج جو بقول مسٹر چرچل فرانس کے ہتھیار ڈالنے کے وقت بہت کمزور اور ضروری ساز و سامان سے معرا تھی سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی اندر طہران سے بن غازی تک سارے علاقے پر چھائی ہوئی ہے اور حلب اور شام کے تمام رقبے اور دریائے نیل کے ساحل تک اپنا اقتدار جمائے ہوئے ہے۔

ہندوستان

جنگ اب ہندوستان کے دروازے تک آپہونچی ہے لیکن سیاسی حیثیت سے ملکی حالات میں ابھی تک کوئی اہم اور اطمینان بخش تبدیلی نہیں ہوئی۔ گورنمنٹ ہند نے ستیاگرہ کے قیدیوں کو ضرور رہا کردیا ہے، جن میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جنکو ہائی کورٹ کے فیصلہ کے مطابق ایک دن کے لئے بھی جیل جانے کی ضرورت نہ تھی۔ بہرحال رہا شدہ لوگوں میں پنڈت جواہر لال نہرو، اور مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس کے علاوہ بہت سے لیڈران کانگریس اور مختلف صوبوں کے اسپیکر صاحبان اور متعدد وزراء شامل ہیں، اور خود ان حضرات کو اپنی رہائی پسند ہو یا نہ ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عوام پر گورنمنٹ کے اس فیصلے کا بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ لیکن اس اثر کو دیرپا بنانے کے لئے ضروری ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ ہندوستانیوں کے ملکی جذبات کے ساتھ اپنی ہمدردی کا عملی اور فوری ثبوت دے۔ صاحب وزیر اعظم نے عموماً اور وزیر ہند نے خصوصاً اس وقت تک جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ بہت دلشکن ثابت ہوا ہے۔ رہائی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو اور بعض دوسرے ملکی لیڈروں نے جو بیانات شائع کئے اور جو تقریریں ارشاد کیں اُن سے دو باتیں خاص طور پر واضح ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ ملک کے سبھی رہنما نازیوں کے سخت مخالف اور جمہوریتوں (خصوصاً روس اور چین) کے حامی اور ہمدرد ہیں۔ اس لئے اس جنگ میں وہ امریکہ اور برطانیہ کے طرفدار ہیں۔ دوسرے یہ کہ سبھی لیڈر ہندوستان کے متعلق برطانوی پالیسی سے لوین بیزار ہیں اسلئے اُنھوں نے تہیہ سا کرلیا ہے کہ جب تک اس پالیسی میں خاطر خواہ تبدیلی نہ ہوگی وہ اس جنگ میں کسی قسم کی دلچسپی نہ لیں گے۔

مسٹر جناح نے بھی حال میں جو اظہار خیالات کیا ہے اس میں کانگریس وغیرہ کی معمولی نکتہ چینی کے علاوہ اس بات کی شکایت کی گئی ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہندوستانیوں کو ملکی انتظام میں واقعی اختیارات دینے پر آمادہ نہیں ہے، بلکہ وہ صرف جنگی کوشش میں اُن کی ہمنوائی چاہتی ہے۔ وائسرائے کی توسیع شدہ کونسل میں ہندوستانی اراکین حکومت کی تعداد غالب ضرور ہوگئی لیکن حال کے بعض اہم واقعات زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اصولی حیثیت سے اس توسیع سے نظام سلطنت میں رتی بھر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ اسی ماہ دسمبر میں گورنر صاحب سندھ نے اپنے وزرا کے اختیارات میں خواہ مخواہ مداخلت کرکے ایک نازک صورتِ حالات پیدا کردی ہے۔ گورنمنٹ ہند ایکٹ ۱۹۳۵ء کی جس دفعہ کا سہارا لیکر گورنر سندھ نے بعض افسروں کے تقرر میں وزارت کے فیصلے کو بالائے طاق رکھکر خود اپنے من مانے افسر مقرر کئے ہیں، اُس سے ہرگز ان کو یہ حق نہیں پہونچتا ہے کہ وہ وزارت کو اس طرح مفلوج و معطل کردیں، چنانچہ ہمارے بڑے بڑے قانون داں خان بہادر اللہ بخش کی پرزور پوزیشن کی تائید کر رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ایک حاکم صوبہ کی زبردستی سے صوبہ سندھ میں آئینی حکومت کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ صوبۂ آسام میں بھی گورنر کو آئینی حکومت ختم کرکے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا پڑی۔ صوبہ بنگال کی طرح اس وقت صوبہ آسام بھی جنگ کی زد میں قرار دیدیا گیا ہے۔ شاید اس وجہ سے گورنر صاحب نے آئینی حکومت معطل کرکے کل اختیارات اپنے ہی قبضے میں رکھنے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ آسام کے کانگریسی ممبران قانونی اسمبلی اب جیل سے باہر آگئے ہیں۔ ممکن ہے

لیگ موجودہ وزارت کو زیادہ دنوں تک نہ چلنے دیتے۔ لیکن گورنر آسام کو کچھ دنوں تک واقعات کا انتظار کرنا ضروری تھا، مگر انہوں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا!

بہار میں تو عرصہ سے گورنری حکومت قائم ہے، مگر اس ماہ گورنر بہار نے بھاگلپور میں ہندو مہاسبھا کے اجلاس کی ممانعت کرکے ملک بھر میں خواہ مخواہ ایک ہیجان عظیم برپا کردیا۔ تمام ملکی جماعتوں میں اس وقت ہندو مہاسبھا ہی علانیہ طور پر جنگی امداد دینے کی پُرزور حمایت کررہی ہے۔ لیکن اس کا اجلاس بھی بھاگلپور میں محض اس لئے ممنوع قرار دیدیا گیا کہ گورنمنٹ بہار اس وقت وہاں امن وامان قائم رکھنے کے لئے ضروری پولیس بھیج سکتی تھی! لیڈران ہندو مہاسبھا نے بقرعید کے لحاظ سے دو تین دن پہلے ہی اپنا اجلاس ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اس پر بھی گورنر بہار ٹس سے مس نہ ہوئے، اور اُن کے حکم سے مہاسبھا کا پنڈال اکھاڑ ڈالا گیا۔ اور اس کے خاص خاص منتظمین گرفتار کرلئے گئے جس کے بعد مسٹر ساورکر اور دوسرے لیڈران ہندو مہاسبھا کو اس حکم کی خلاف ورزی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا چنانچہ تمام ہندوستان کے تقریباً ہزار بارہ سو نامور لیڈران (مثلاً سر شیام پرشاد مکرجی وزیر بنگال، پریسیڈنٹ ساورکر، لالہ گوکل چند نارنگ، ڈاکٹر مونجے، بھائی پرمانند، راجہ مہیشور دیال سیٹھ وغیرہ وغیرہ) گرفتار کرکے جیل بھیجدیئے گئے مگر ان گرفتاریوں کے باوجود ہندو مہاسبھا کا اجلاس بھاگلپور کے ایک دھرم سالہ میں منعقد ہوا اور ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں مجوزہ ریزولیوشن پاس کئے گئے ہم کو اس بات کی ضرور خوشی ہے کہ مہاسبھا کے لیڈران گورنمنٹ کے اس تشدد بیجا سے مرعوب نہیں ہوئے اور اُن کے باقیماندہ لوگوں نے ٹھنڈے دل سے مہاسبھا کے اجلاس کا مقررہ پروگرام پورا کیا اور اپنی کارروائی پر اس تشدد کا کوئی اثر نہیں پڑنے دیا۔

جن لوگوں کو ہندو مہاسبھا کی سیاسی پالیسی سے سخت اختلاف ہے ان کو بھی گورنمنٹ بہار کے اس تشدد سے دلی صدمہ پہونچا ہے۔ چنانچہ مہاتما گاندھی، بابو راجیندر پرشاد، رائٹ آنریبل سر سرینواس شاستری، سر شیو سوامی آئر اور سر مہاراج سنگھ وغیرہ نے بھی اس حکم کو سراسر بیجا قرار دیا ہے۔

بنگال کی وزارت میں ابتک فرقہ وارانہ جذبات کا غلبہ تھا۔ سندھ اور صوبہ سرحد سے قطع نظر بنگال اور پنجاب ہی دو بڑے صوبے ایسے ہیں جہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ چنانچہ ابتک بنگال کے وزیر اعظم مسٹر فضل الحق مسٹر جناح کے دست راست اور مسلم لیگ کے زبردست مؤید سمجھے جاتے تھے لیکن چند دنوں سے بنگال کے معاملات کچھ ایسا پلٹا کھا رہے ہیں کہ حال میں مسٹر فضل الحق کو اپنے دوسرے رفقا کے ساتھ وزارت سے استعفےٰ دینا پڑا۔ گورنر بنگال نے استعفےٰ کو منظور کرکے مسٹر فضل الحق ہی سے نئے ساتھیوں کے ساتھ ایک نئی وزارت قائم کرنے کی استدعا کی۔ اسی اثنا میں بنگال کی قانونی اسمبلی کے مختلف پارٹیوں میں کچھ ایسا رد و بدل ہوا کہ مسٹر فضل الحق کو مسلم لیگ اور اس کی پالیسی سے کنارہ کش ہو کر ایک مشترکہ پارٹی کی لیڈری قبول کرنا پڑی، نواب صاحب ڈھاکہ نے بھی اس معاملے میں اُن کا ساتھ دیا۔ اور دونوں صاحبوں نے تمام پارٹیوں کے خاص خاص لیڈروں کو اپنے ساتھ لیکر مشترکہ ذمہ داری کے اصول پر ایک نئی وزارت مرتب کرلی ہے جسے تمام ملک نے اس وزارت

کا خیر مقدم کیا ہے۔ کیونکہ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو انہیں اصولوں پر ہندوستان میں اتحاد و اتفاق باہمی کی بنیاد برقرار رہ سکتی ہے۔ اور دوسرے صوبوں میں بھی اسی نمونہ پر قومی گورنمنٹیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ مگر نئی وزارت کے قائم ہوتے ہی مسٹر جناح کے دعوے کو سخت دھکا لگا ہے۔ اور انھوں نے مسٹر فضل الحق اور نواب صاحب ڈھاکہ کے خلاف بہت کچھ سخت سست کہا ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اس وقت بنگال نے تمام ملک کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ پیش کر دیا ہے۔

مگر افسوس کہ اس وزارت کے قائم ہونے کے ساتھ ہی بنگال میں ایک ناخوشگوار واقعہ ہوا یعنی مسٹر سرت چندر بوس مشہور لیڈر فارورڈ بلاک پارٹی جاپان کے ساتھ ہمدردانہ تعلقات رکھنے کے شبہ میں گرفتار کر لئے گئے۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوا ہوتا تو مسٹر بوس بھی یقیناً اپنے صوبے کی نئی وزارت کے ایک خاص رکن ہوتے۔ اس گرفتاری سے بھی گورنمنٹ ہند کے طرز عمل پر کوئی خوشگوار روشنی نہیں پڑتی ہے یہ بالخصوص طور پر قابل نوٹ ہے کہ ذمہ دار وزارت بنگال کو اس گرفتاری کا کوئی علم نہ تھا، اور نہ اُن سے اس بارے میں کوئی مشورہ ہوا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال مسٹر بوس کو نظربندی کی حالت میں بھی ایک دن کیلئے انھیں بنگال میں نہ روک سکے۔ ملک کو معلوم ہے کہ کس طرح وہ دوڑے ہوئے ہوڑہ اسٹیشن پر گئے مگر وہاں مسٹر بوس سے دو باتیں بھی نہ کر سکے۔ سنا جاتا ہے کہ گو پہلے مسٹر بوس نے نئی وزارت کے قیام کو پسند کیا تھا لیکن اب انھوں نے اپنے ممبروں سے اس سے کنارہ کش ہو جانے کی استدعا کی ہے ہم کو معلوم نہیں کہ مسٹر بوس کن واقعات کے ماتحت گرفتار کئے گئے ہیں اس لئے ہم اس پر کوئی مفصل رائے زنی نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن جو گورنمنٹ ہند بنگال کے وزیر اعظم کو بھی گرفتاری کے اصلی وجوہات نہیں بتلا سکتی ہے وہ نہ آئینی گورنمنٹ کہی جا سکتی ہے اور نہ جمہوری نظام کے ماتحت ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس واقعہ نے ہم کو ایک مرتبہ پھر بڑے زور شور سے اس بات کی یاد دلا دی کہ حکومت ہند کا نظام ابھی تک حسب سابق سرتاپا مطلق العنان ہے۔ اور حال میں حضور والسرائے کی کونسل کی جو توسیع ہوئی ہے اس سے اس کی نوعیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ ایسی صورت میں اس بات پر کیا تعجب کیا جا سکتا ہے کہ ملک اس نظام کی ماتحتی سے تنگ آ گیا ہے اور اب جلد سے جلد اس میں اصولی تبدیلی دیکھنے کا خواہشمند و خواستگار ہے۔

انگلستان کے بعض بڑے بڑے مدبران بھی اس تبدیلی کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں اور اکثر برطانوی اخبارات نے اس تبدیلی کی پُرزور تائید کی ہے۔ حالاتِ حاضرہ اس تبدیلی کو صرف ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی قرار دے رہے ہیں۔ جنگ کے لحاظ سے یہ تبدیلی اشد ضروری ہے۔ دیکھئے برطانیہ کے اربابِ حل و عقد کو اس اہم مسئلہ کی طرف کب متوجہ ہونے کی توفیق ہوتی ہے۔ خدا کرے نیا سال اپنے ساتھ ہی ایک نیا نظامِ حکومت لائے جس کے ماتحت ہندوستان اور اسکے باشندے دنیا کے کسی ملک سے پیچھے نہ رہیں۔

نیا سال

آئندہ سال سے زمانہ کی زندگی کا چالیسواں سال شروع ہوگا۔ سنہ جس طرح تمام دنیا کے لئے منحوس ثابت ہوا اسی طرح زمانہ اور اسکے کارکنوں کے لئے بھی بڑا صبر آزما نکلا۔ کاغذ کی بے حد گرانی نے ہمارے لئے خاص مشکلات پیدا کر دیں۔ اس پر اندر کی طولانی علالت سے ہماری پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ زمانہ کی اشاعت میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ اب ایڈیٹر زمانہ کچھ کچھ کام کرنے کے قابل ہو گئے ہیں اور انھوں نے تھوڑا بہت کام شروع بھی کر دیا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ آئندہ سال قدر دانانِ رسالہ کی توجہ سے زمانہ نے مستقبل کے متعلق انکو کسی قسم کے تردد کرنے کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔ ہمارا مقصد خاص زمانہ کی توسیع اشاعت میں پہلے سے زیادہ عملی حصہ لیں گے۔ خدا کرے نیا سال زمانہ اور ناظرین زمانہ کو مبارک ہو۔

منیجر

زمانہ ۸۹۱۳۳۰۵

آخری درج شدہ تاریخ [illegible] کتاب مستعار لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

23.4.63

[illegible]

23.4.63

۷۲۱ [illegible]

قواعد [illegible]

۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ و مجلس انتظامی [illegible] ایک وقت میں [illegible] کتابیں لے سکتے ہیں [illegible]

۲۔ [illegible] بیک وقت [illegible] کتابیں [illegible] ایک ماہ [illegible]

۳۔ [illegible] دو کتابیں [illegible] ایم۔ اے۔ ایل ایل بی [illegible] لے سکیں گے۔

[illegible] طلبہ [illegible] کتابیں [illegible] اپنے پاس رکھ سکیں گے [illegible] طلب [illegible]

طلبہ پانچ کتابیں [illegible] لے جا سکیں گے [illegible]

۴۔ [illegible] کتابیں [illegible] کا واپس لانا لازم ہے۔

۵۔ [illegible] کتاب [illegible] خراب ہو جائیں تو [illegible] دینا ہو گا۔

۶۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان [illegible]

۷۔ [illegible] کتابیں [illegible]

۸۔ [illegible] فقط